تذکرۂ مفسرین ہند

جلد اول

مرتبہ

محمد عارف اعظمی عمری

دار المصنفین شبلی اکیڈمی، شبلی روڈ، اعظم گڈھ (ہند)

تذکرہ مفسرین ہند

(جلد اول)

یہ جلد دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں ہندوستان کے قدیم مفسرین اور ان کی تفسیروں کا تعارف کرایا گیا ہے اور دوسرے حصہ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خانوادۂ علمی نیز ان کے تلامذہ، معاصرین کی تفسیری کاوشوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

مرتبہ

محمد عارف اعظمی عمری

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ (۲۷۶۰۰۱) یوپی (ہند)

سلسلۂ دارالمصنفین ۱۶۵

نام کتاب: تذکرۂ مفسرین ہند (جلد اول)

نام مصنف: محمد عارف اعظمی عمری (رفیق دارالمصنفین)

صفحات: ۲۵۴

قیمت:

ایڈیشن: طبع دوم، مئی ۲۰۰۶ء

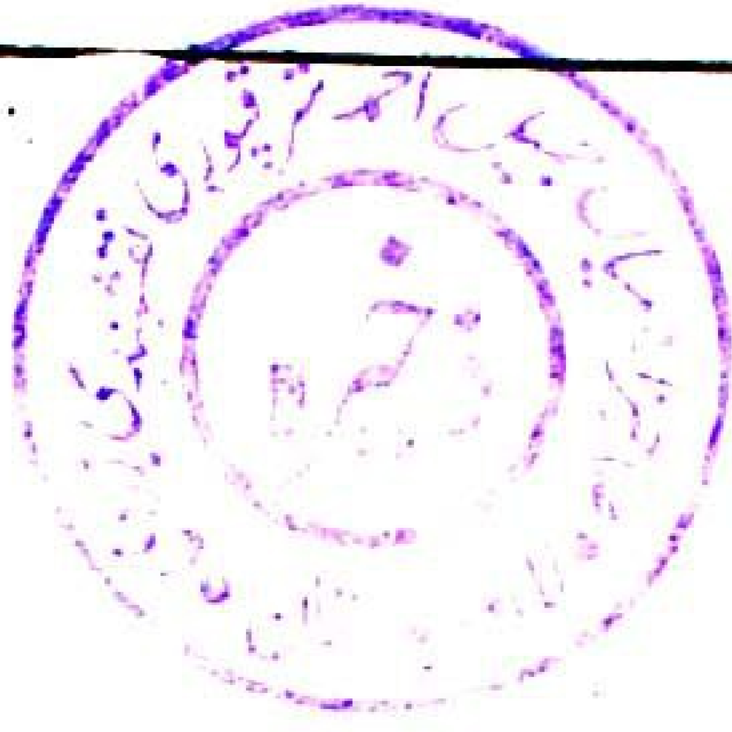
مطبع: معارف پریس، اعظم گڈھ

ناشر: دارالمصنفین (شبلی اکیڈمی) اعظم گڈھ ۲۷۶۰۰۱



باہتمام

عبدالمنان ہلالی



فہرست تذکرہ مفسرین ہند
(جلد اول)

مضمون	صفحہ
دیباچہ	۱
مقدمہ طبع اول	۵
طبع دوم	۷
(حصہ اول)	
(عہد قدیم کے مفسرین کرام) ۱-۱۵۲	
شیخ محمد بن احمد شریحی ماریکلی ۱ - ۶	
نام ونسب اور خاندانی حالات	۱
تعلیم	۱
درس وتدریس	۲
تقوی اور بے باکی	۲
وفات	۲
تفسیر کاشف الحقائق وقاموس الدقائق	۲
خصوصیات تفسیر	۳
تفسیر کاشف الحقائق کے ماخذ	۵
ایک غلط فہمی کا ازالہ	۵
شیخ نظام الدین الحسن بن محمد نیشاپوری ۷ - ۱۴	
ابتدائی حالات	۷
علمی مرتبہ	۷
عقیدہ ومسلک	۷
وفات	۹
تصنیفات	۹
تفسیر غرائب القرآن ورغائب الفرقان	۱۰
آیات کا ترجمہ	۱۱
تفسیر غرائب القرآن کی ہندوستان میں تکمیل	۱۲
ایک غلط فہمی کا ازالہ	۱۳
ماخذ تفسیر	۱۳
شیخ ابوبکر اسحاق بن تاج ملتانی ۱۵ - ۱۶	
ابتدائی حالات	۱۵
تصنیفات	۱۵
تفسیر جواہر القرآن	۱۶
خصوصیات تفسیر	۱۶
شیخ محمد بن یوسف حسینی گیسو دراز ۱۷ - ۲۷	
نام ونسب اور خاندانی حالات	۱۷
ولادت	۱۸

مضمون	صفحہ
قیام دیوگیر	۱۸
بچپن کے حالات	۱۸
تعلیم وتربیت	۱۸
مراجعت دہلی	۱۹
بیعت	۱۹
تکمیل تعلیم	۱۹
قیام دکن	۲۰
ازواج واولاد	۲۱
وفات	۲۲
تصنیفات	۲۲
تفسیر ملتقط	۲۵
تفسیر ملتقط کی نمایاں خصوصیات	۲۶
شیخ علی بن احمد مہائمی ۲۸ - ۵۳	
ولادت	۲۸
نام ونسب	۲۸
تعلیم وتربیت	۲۹
عادات وخصائل	۲۹
عبادت وریاضت	۳۰
منصب قضاء	۳۰
درس وتدریس	۳۳
صوفیانہ مسلک	۳۳

مضمون	صفحہ
روحانی مرتبہ	۳۴
وفات	۳۵
تصنیفات	۳۵
تفسیر مہائمی کی خصوصیات	۳۷
تفسیری موقف	۳۸
احادیث وآثار سے استشہاد	۴۱
حقوق کی ادائیگی کی تاکید	۴۲
اخلاق حسنہ کی تلقین	۴۲
حکماو متکلمین کے اقوال سے استناد	۴۳
فقہی مسلک	۴۳
فن قرأت سے واقفیت	۴۴
علمائے نحو کے اقوال سے استدلال	۴۴
قصص قرآنی کا ذکر	۴۵
ایجاز بیان	۴۵
سورتوں کا تعارف	۴۶
ہر سورہ کے آغاز میں بسم اللہ کی نئی تشریح	۴۸
حروف مقطعات کی توجیہ	۵۰
ربط آیات	۵۱
قاضی شہاب الدین دولت آبادی ۵۴ - ۶۴	
نام ونسب اور خاندانی حالات	۵۴
ولادت	۵۴

مضمون	صفحہ
تعلیم وتربیت	۵۵
سفر کالپی	۵۵
قیام جون پور	۵۵
ایک اشتباہ	۵۷
درس وتدریس	۵۷
اصحاب سلوک سے ربط وتعلق	۵۸
اتباع شریعت کا اہتمام	۵۸
شعروشاعری	۵۸
سلطان ابراہیم شرقی کی قدردانی	۵۹
ازواج واولاد	۵۹
وفات	۶۰
تصنیفات	۶۱
تفسیر بحرمواج	۶۳
تفسیر بحرمواج کی نمایاں خصوصیات	۶۳
حاجی عبدالوہاب بخاری ۶۵ - ۶۸	
نام ونسب اور خاندانی حالات	۶۵
ولادت	۶۵
تعلیم وتربیت	۶۵
سفر حجاز	۶۵
سکونت دہلی	۶۶
حجاز کا دوسرا سفر	۶۶
شاہان لودھی سے تعلقات	۶۶
وفات	۶۷
ازواج واولاد	۶۷
تصنیفات	۶۷
شیخ حسن محمد احمد آبادی گجراتی ۶۹ - ۷۵	
نام ونسب اور خاندانی حالات	۶۹
ولادت	۷۰
تعلیم وتربیت	۷۰
تصوف وسلوک	۷۰
سلطان محمود شہید کی قدردانی	۷۰
رفاہی کام	۷۱
وفات	۷۱
ازواج واولاد	۷۱
تصنیفات	۷۱
تفسیر محمدی	۷۲
تفسیر محمدی کی بعض نمایاں خصوصیات	۷۲
مسائل کے استخراج میں باریک بینی	۷۳
اقوال ائمہ سے استدلال	۷۴
انبیائے کرام کے واقعات کی تفصیل	۷۵
شیخ مبارک ناگوری ۷۶ - ۸۴	
ولادت اور تعلیم	۷۶
آگرہ میں آمد	۷۷
اخلاق وعادات اور تلون مزاجی	۷۷
علما کی مخالفت اور شاہی عتاب	۷۹

مضمون	صفحہ
علما کے اختیارات کے بارے میں	۸۰
محضر کی تیاری	
آخری عمر کا کارنامہ	۸۱
وفات	۸۱
اولاد	۸۲
تفسیر مبارک کی خصوصیات	۸۲
نظم قرآن اور قرأتوں کا اہتمام	۸۲
مقدمہ تاریخ قرآن	۸۳
اسمائے سور کی توجیہہ وتشریح	۸۳
احکام ومسائل کی تشریح	۸۳
مراجع تفسیر	۸۴
انبیا کے واقعات کا ذکر	۸۴
شیخ یعقوب صرفی کشمیری ۸۵ - ۸۸	
نام ونسب	۸۵
ولادت	۸۵
تعلیم	۸۵
شعر وشاعری	۸۵
علمی اسفار	۸۶
درس وتدریس	۸۶
سیاسی سرگرمیاں	۸۶
اکبر سے قرب وتعلق	۸۷
وفات	۸۷
تصنیفات	۸۷
شیخ ابوالفیض فیضی ۸۹ - ۱۰۲	
ابتدائی حالات	۸۹
دربار شاہی میں رسائی	۸۹
دربار میں قدر ومنزلت	۹۰
سلطنت کے انتظامی امور میں رائے	۹۰
ملک الشعرا کا خطاب	۹۱
ملکی سفارت	۹۱
دین الٰہی کے فروغ میں فیضی کا کردار	۹۱
وفات	۹۳
تصنیفات	۹۳
تفسیر سواطع الالہام	۹۴
تفسیر فیضی کے بارے میں علما کے خیالات	۹۵
تفسیر سواطع الالہام کی خصوصیات	۹۷
شیخ منور بن عبدالحمید لاہوری ۱۰۳ - ۱۰۵	
ابتدائی حالات	۱۰۳
تعلیم	۱۰۳
درس وتدریس	۱۰۳
دربار شاہی میں رسائی	۱۰۳

مضمون	صفحہ
قید و بند	۱۰۴
وفات	۱۰۴
ازواج و اولاد	۱۰۴
تصنیفات	۱۰۵
شیخ غلام نقشبند گھوسوی ثم لکھنوی ۱۰۶ - ۱۱۶	
نام و نسب اور خاندانی حالات	۱۰۶
پیدائش	۱۰۷
تعلیم و تربیت	۱۰۷
علمی تبحر	۱۰۸
سلوک و معرفت	۱۰۸
سجادہ نشینی	۱۰۸
درس و تدریس	۱۱۰
شعر و شاعری	۱۱۰
دربار شاہی میں عزت افزائی	۱۱۱
اخلاق و عادات	۱۱۱
وفات	۱۱۲
اولاد	۱۱۲
تصنیفات	۱۱۲
تفسیر انوار الفرقان و ازہار القرآن	۱۱۳
شیخ نقشبند کی تفسیری خصوصیات	۱۱۵
ملا جیون امیٹھوی ۱۱۷ - ۱۳۵	

مضمون	صفحہ
نام و نسب اور خاندانی حالات	۱۱۷
ولادت	۱۱۸
تعلیم و تربیت	۱۱۸
تصنیفی زندگی کا آغاز	۱۱۸
درس و تدریس	۱۱۹
تصوف و سلوک	۱۱۹
دہلی و اجمیر کا سفر	۱۱۹
حج بیت اللہ اور نور الانوار کی تالیف	۱۱۹
شعر گوئی	۱۲۰
اورنگ زیب عالم گیر سے تعلق	۱۲۰
ایک غلط فہمی کا ازالہ	۱۲۱
حجاز کا دوسرا سفر	۱۲۲
خرقہ تصوف اور اجازت	۱۲۳
بہادر شاہ اول کی مصاحبت	۱۲۳
فرخ سیر سے قربت	۱۲۳
وفات	۱۲۴
اولاد	۱۲۵
تصنیفات	۱۲۵
تفسیر احمدی کی خصوصیات	۱۲۷
تفسیر کے مراجع	۱۲۷
نبیین کی لغوی تحقیق	۱۲۸
مسئلہ قصاص میں حنفی مسلک کی تائید	۱۲۹
وما اھل بہ لغیر اللہ کی تفسیر	۱۳۱

مضمون	صفحہ
مشرک اور اہل کتاب عورتوں سے نکاح کا حکم	۱۳۲
تفسیر آیات میں ربط و نظم کا اہتمام	۱۳۲
شیخ علی اصغر قنوجی ۱۳۶ - ۱۴۰	
نام و نسب اور خاندانی حالات	۱۳۶
ولادت	۱۳۶
تعلیم	۱۳۶
راہ سلوک	۱۳۶
درس و افادہ	۱۳۶
اخلاق و عادات	۱۳۷
وفات	۱۳۷
اولاد	۱۳۷
تصنیفات	۱۳۸
تفسیر ثواقب التنزیل فی اشارۃ التاویل	۱۳۸
تفسیر ثواقب التنزیل کی خصوصیات	۱۳۹
شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی ۱۴۱ - ۱۵۲	
نام و نسب اور خاندانی حالات	۱۴۱
ولادت	۱۴۲
تعلیم و تربیت	۱۴۳
حلقہ درس	۱۴۳
تصوف و سلوک	۱۴۳
سفر حجاز	۱۴۳
مراجعت وطن	۱۴۳
دعوت و ارشاد	۱۴۴
شاہ صاحب کے تربیتی خطوط	۱۴۵
اشاعت اسلام	۱۴۵
طریقہ تربیت	۱۴۶
اتباع شریعت کی تاکید	۱۴۷
وفات	۱۴۷
اولاد	۱۴۸
اخلاق و عادات	۱۴۸
استغنا و بے نیازی	۱۴۹
تصنیفات	۱۴۹
تفسیر قرآن القرآن بالبیان	۱۵۱
ماخذ تفسیر	۱۵۲
حصہ دوم — شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی قرآنی تحریک اور اس کے اثرات ۱۵۳ - ۲۳۷	
شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۱۵۷ - ۱۶۶	
ترجمہ قرآن مجید	۱۵۷

مضمون	صفحہ
فتح الرحمٰن کی خصوصیات	۱۵۸
مقدمہ فتح الرحمٰن	۱۵۹
الفوز الکبیر فی اصول التفسیر	۱۶۰
فتح الخبیر	۱۶۶
شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ۱۶۷ - ۱۹۰	
نام ونسب	۱۶۷
ولادت وتعلیم	۱۶۷
درس وتدریس	۱۶۷
وفات	۱۶۹
حلیہ	۱۷۰
اولاد	۱۷۰
اخلاق وعادات	۱۷۰
تصنیفات	۱۷۰
تفسیر فتح العزیز کی عدم تکمیل کی بحث	۱۷۱
تکملہ تفسیر فتح العزیز	۱۷۵
تفسیر فتح العزیز کی نمایاں خصوصیات	۱۷۶
سورتوں کے عنوان اور اجمالی مضمون کی وضاحت	۱۷۶
ربط آیات وسور	۱۸۰
نظائر قرآن	۱۸۵
قصص واحکام کے اسرار	۱۸۷

مضمون	صفحہ
لطائف نظم قرآن	۱۸۹
حروف مقطعات پر بحث	۱۸۹
شاہ رفیع الدین دہلوی ۱۹۱ - ۱۹۸	
مختصر حالات زندگی	۱۹۱
تفسیری خدمات	۱۹۲
نمونہ تفسیر	۱۹۳
نظم کلام کا اہتمام	۱۹۵
ناسخ ومنسوخ کی بحث	۱۹۷
شاہ عبدالقادر دہلوی ۱۹۹ - ۲۰۳	
مختصر حالات زندگی	۱۹۹
ترجمہ وتفسیر موضح القرآن	۲۰۰
موضح القرآن کے چند نمونے	۲۰۰
قاضی ثناء اللہ پانی پتی ۲۰۴ - ۲۱۷	
مختصر حالات زندگی	۲۰۴
تصنیفات	۲۰۴
تفسیر مظہری	۲۰۵
مسلکی رواداری	۲۰۵
محصور کی قربانی کا حکم	۲۰۵
تعلیم قرآن کو مہر بنانا	۲۰۷

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
احکام حج	۲۰۷	تصنیفات	۲۳۱
خیار بیع کا اثبات	۲۰۸	جامع التفاسیر	۲۳۱
تیمم کا ایک مسئلہ	۲۰۹	تفسیر کی اشاعت	۲۳۲
تفسیری اقوال کی تحقیق وتنقید	۲۱۰	ربط سور کا اہتمام	۲۳۲
تفسیری انفرادیت	۲۱۳	اسالیب قرآن کی وضاحت	۲۳۴
نظم وترتیب کا اہتمام	۲۱۶	پند وموعظت پر خاص توجہ	۲۳۵
معتدل متصوفانہ تحریر	۲۱۶	کلامی مسائل	۲۳۶
شاہ مراد اللہ انصاری			
۲۱۸ - ۲۲۵			
حالات مصنف	۲۱۸		
ترجمہ قرآن	۲۱۸		
تفسیر مرادیہ کی اہمیت	۲۲۰		
رد بدعت کا اہتمام	۲۲۱		
حکیمانہ نکات	۲۲۲		
شاہ رؤوف احمد مجددی			
۲۲۶ - ۲۳۰			
مختصر حالات زندگی	۲۲۶		
تفسیر رؤوفی	۲۲۹		
نمونہ تفسیر	۲۲۹		
مولانا قطب الدین دہلوی			
۲۳۱ - ۲۳۷			
مختصر حالات	۲۳۱		

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

الحمد للہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی رسولہ الکریم محمد ن الامین و علی آلہ و اصحابہ اجمعین۔

دارالمصنفین کا مقصد اسلامی علوم وفنون کی خدمت و اشاعت اور اسلاف کے علمی اندوختوں کی بقا وحفاظت ہے مسلمانوں کے پرعظمت علمی وتحقیقی کارناموں کو نمایاں کرنے کے لیے اس نے جو مخصوص لائحہ عمل تیار کیا تھا، اس کے تحت تصنیف وتالیف کے مختلف سلسلے قائم ہوئے جن میں سے بعض الحمد للہ مکمل ہو چکے ہیں اور جو نامکمل رہ گئے ہیں ان کی تکمیل کا کام جاری ہے۔

جدید طرز پر اردو زبان میں علوم اسلامیہ کی تاریخ کا خاکہ اور ان کی تدریجی ترقیوں پر تبصرہ کا خیال سب سے پہلے علامہ شبلی مرحوم کے ذہن میں آیا، اس ضمن میں اسلامی علوم کے نامور فضلا اور ممتاز مصنفین کے حالات وخدمات کی تفصیل بھی ان کے پیش نظر تھی، چنانچہ اس سلسلہ کی بعض مستقل کتابیں انہوں نے خود ہی لکھیں مگر پھر سیرت نبوی ﷺ کی تالیف نے انہیں ادھر متوجہ ہونے نہیں دیا تاہم کبھی بھی یہ خیال ان کے ذہن سے محو نہیں ہوا، اسی لیے دارالمصنفین نے ابتدا ہی سے سیرت نبوی ﷺ کے علاوہ ان تاریخی وسوانحی سلسلوں کی تکمیل کو بھی اپنے علمی پروگرام میں شامل کیا۔

مسلمانوں کی اصلاح وہدایت کا دارومدار اور بنیادی سرچشمہ قرآن مجید ہے اسی لیے ابتدا ہی سے مسلمانوں نے قرآن مجید کی خدمت اور اس میں فہم وتدبر کو اپنے لیے سرمایہ سعادت سمجھا، خود آنحضرت ﷺ بھی قرآن مجید کی تبیین وتشریح کی خدمت پر مامور تھے، ارشاد ربانی ہے:

وَ اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ (النحل:۱۶/ ۴۴)

اور ہم نے تمہاری جانب ذکر (قرآن مجید) کو اتارا ہے تا کہ تم اسے لوگوں سے بیان کردو۔

عہد صحابہ وتابعین میں قرآن مجید کو سیکھنے سکھانے کا خاص اہتمام تھا، اس کے بعد ہر زمانہ میں امت میں ایسے اہل علم پیدا ہوئے جو قرآن مجید میں غواصی کر کے اس کے حقائق و دقائق اور عجائب کی تلاش کرتے رہے ہیں، قرآن مجید کی طلب وتحصیل اور اس کے معانی و مطالب کی تشریح وتوضیح کرنے والی یہی جماعت مفسرین کے نام سے موسوم ہوئی اور علوم دینیہ میں فن تفسیر کو سب سے اعلا واشرف علم خیال کیا جاتا ہے، اس لیے اسلام کی اس برگزیدہ جماعت کے کارنامے کو بھی دارالمصنفین میں نمایاں کرنا ضروری معلوم ہوا، جس نے کتاب الٰہی کی خدمت کی ہے۔

ہندوستان صدیوں تک اسلامی تہذیب وثقافت کا مرکز رہ چکا ہے جس کے آثار ونقوش اس کے ذرہ ذرہ پر ثبت ہیں، یہاں کے علما اور اصحاب کمال کے علمی، دینی اور تہذیبی کارنامے اسلامی ملکوں سے کم نہیں ہیں، علم وفن کی ہر شاخ خصوصاً دینی علوم میں ہندوستان میں جو علما پیدا ہوئے ان کی علمی عظمت اسلامی اور عرب ملکوں میں بھی مسلم تھی، تفسیر کی جانب بھی ہندوستانی علما نے بڑا اعتنا کیا ہے۔

وطن کا حق مقدم ہے اس لیے دوسرے بلاد اسلامیہ سے پہلے ہندوستانی مفسرین کے حالات اور کارناموں کو پیش کرنا مناسب معلوم ہوا، چنانچہ اس پہلی جلد میں تیرہویں صدی عیسوی کے آخر سے اٹھارہویں صدی کی ابتدا تک کے سولہ صاحب تصنیف ہندوستانی مفسرین کے حالات وکمالات پر بحث کی گئی ہے، اس میں گو ہر صاحب ترجمہ کے عام حالات زندگی اور علمی ومذہبی خدمات بھی بیان کیے گئے ہیں تاہم اصل توجہ ان کے تفسیری کارناموں کو پیش کرنے پر مبذول کی گئی ہے، اس طرح اس میں کتب تفسیر پر تبصرہ کر کے ان کی اہم خصوصیات نمایاں کی گئی ہیں اور ان کے تفسیری درجہ ومرتبہ کا تعین کیا گیا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی باقاعدہ علمی وتحقیقی سرگرمیوں کا آغاز بارہویں اور تیرہویں

صدی عیسوی سے ہوتا ہے لیکن عموماً اس دور کے اکثر اہل کمال کے حالات پردہ خفا میں ہیں، تاہم تلاش و تفحص سے جس قدر حالات معلوم ہو سکے ہیں، انہیں تنقید و تحقیق کے بعد کتاب میں درج کر دیا گیا ہے، البتہ کہیں کہیں مجبوراً ثانوی ماخذ ہی پر قناعت کرنا پڑا ہے گو اسے بھی پوری طرح کھنگال لیا گیا ہے، اس کی وجہ سے بعض اہل علم کے اغلاط و مسامحات کی نشان دہی بھی کرنی پڑی ہے۔

اس سلسلہ کا آغاز مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی مرحوم نے کیا تھا مگر ان کے انتقال کے بعد دارالمصنفین کے نوجوان رفیق مولوی محمد عارف عمری اعظمی نے اپنے ہاتھ میں لیا اور برسوں کے مطالعہ و محنت کے بعد یہ مفید کتاب لکھی، خدا کرے اس کے دوسرے حصے بھی جلد پایہ تکمیل کو پہنچ جائیں۔

ناچیز

ضیاء الدین اصلاحی

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ

۱۲؍جنوری ۱۹۹۴ء

مقدمہ

ہندوستان ایک تاریخی ملک ہے اور متنوع تہذیب وتمدن کا مرکز ہے، اس کی قدیم جغرافیائی تقسیم دو اجزا سندو ہند پر مشتمل ہے، سندھ کا علاقہ زمانہ قدیم میں محل وقوع کے اعتبار سے مغربی اور وسطی ایشیا کے درمیان گزرگاہ کی حیثیت رکھتا تھا اور یہ خط تہذیب وتمدن اور ثقافت وتہذیب میں ہند سے بالکل علاحدہ تھا۔

پہلی صدی ہجری کے اختتام اور آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں محمد قاسم کی آمد کے بعد علاقہ سندھ اسلام کی روشنی سے منور ہوا، بعض تجارتی قافلوں کی آمد ورفت سے ہندوستان کے کچھ ساحلی علاقوں میں بھی مذہب اسلام کی نشر واشاعت ہوئی مگر اس کا غالب حصہ بعد کی کئی صدیوں تک اس نعمت سے محروم رہا۔

ہندوستان میں مسلم عہد حکومت کا آغاز دراصل محمود غزنوی کی آمد کے بعد ہوا، پھر سلاطین غور کے عہد حکومت میں ترکستان اور ماوراء النہر سے علما اور بزرگان دین کے قافلے ہندوستان وارد ہوئے، جن کی بہ دولت اس وسیع خطہ میں اسلام کی نشر واشاعت ہوئی اور اسی عہد سے باقاعدہ ہندوستان میں اسلامی ثقافت وتمدن کی ابتدا ہوئی۔

زیر نظر کتاب میں ہندوستان میں مسلم عہد حکومت کے آغاز سے لے کر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے پہلے تک کے منتخب اصحاب تصنیف مفسرین کا تذکرہ اور ان کی تفسیروں کا تعارف کرایا گیا ہے، اس دور میں ہندوستان میں فن تفسیر کی نمایاں خصوصیات یہ رہی ہیں:

۱- مختلف علوم وفنون کی طرح فن تفسیر کا آغاز بھی قدما کی تصانیف پر شروح وحواشی سے ہوا۔

۲- فن تفسیر کی ابتدا تصوف کے زیر اثر ہوئی، چنانچہ یہاں سب سے پہلے لکھی گئی تفسیری تصنیف خالص اسی مقصد کے تحت لکھی گئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا اہم اور تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلی مرتبہ اسلامی علوم وفنون کے جمود وتعطل کے خلاف آواز بلند کی اور فن اصول تفسیر کے موضوع پر

اپنے رسالہ الفوز الکبیر کے ذریعہ انہوں نے مفسرین کو لائحہ فکر وعمل دیا اور اسی کے بعد ہندوستان میں فن تفسیر میں تجدیدی اور مجتہدانہ کارنامے انجام دیے گئے اور برصغیر کو فن تفسیر میں ایک خاص امتیاز حاصل ہوا۔

پیش نظر کتاب اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے انشاء اللہ دوسری جلد میں ہندوستان میں فن تفسیر کے مکاتب فکر کی تفصیل پیش کی جائے گی، یہ اہم علمی کام دارالمصنفین کے سابق رفیق مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی مرحوم کے حصہ میں آیا تھا مگر ابھی وہ جمع مواد وغیرہ کا کام کر رہے تھے کہ ان کا وقت موعود آپہنچا اور وہ اللہ رب العزت کے حضور میں پہنچ گئے، چنانچہ یہ خدمت اس حقیر کو سپرد ہوئی جو ایک طالب علمانہ کوشش کی حیثیت سے ناظرین کی خدمت میں پیش ہے، اس مجموعہ میں شیخ علی مہائمی اور ملا مبارک ناگوری پر لکھے ہوئے مضامین مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی مرحوم کے قلم سے ہیں جن کے اسلوب بیان میں کتاب کے عام اسلوب سے ہم آہنگی اور یکسانی پیدا کرنے کی غرض سے میں نے ترتیب اور تعبیر میں تبدیلیاں کی ہیں، اسی طرح شیخ ابوالفیض فیضی کے بارے میں زیادہ تر مواد مجھ کو مولانا مرحوم ہی کے مسودہ سے دست یاب ہوا ہے، ان کے علاوہ بقیہ تذکرے اس حقیر کے مرتب کردہ ہیں۔

اس کتاب کی تیاری میں دارالمصنفین کے ناظم مخدومی مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور دیگر بزرگوں نے میری جو رہنمائی کی ہے میں اس کا ممنون ہوں، خاص طور پر دارالمصنفین کے معزز رکن پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے اس حقیر طالب علم کی کتاب کے مسودہ کو لفظ بہ لفظ پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائی اور ضروری اصلاحات کیں اور جدید طرز تحقیق سے روشناس کرایا، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اس خدمت کو قبول فرمائے، آمین۔

محمد عارف اعظمی عمری
رفیق دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ
۱۳ر دسمبر ۱۹۹۳ء

طبع دوم

اللہ رب العزت کا بے پایاں شکر ہے کہ تذکرۂ مفسرین ہند (اول) کی دوبارہ طباعت ہو رہی ہے، یہ محض قرآن مجید اور اس کے معانی و مطالب پر غور و تدبر کرنے والے مفسرین کرام کے تذکرہ کی برکت ہے کہ اس کتاب کو مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے تمام نسخے نکل گئے، پہلے ایڈیشن کی کمپوزنگ کافی گنجلک اور دارالمصنفین کے روایتی انداز سے علاحدہ تھی، طبع دوم میں اس کو درست کردیا گیا ہے، مخدومی مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی ناظم دارالمصنفین کے حکم سے اس کتاب کا دوسرا حصہ جو شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خانوادۂ علمی کی تفسیری خدمات پر مشتمل ہے، اس کو بھی اسی میں ضم کر دیا گیا ہے، اس کی وجہ سے کتاب کی ضخامت بڑھ گئی ہے اور ابتدائی عہد کے مفسرین کا تذکرہ مکمل ہو گیا ہے، انشاء اللہ اگلی جلد میں ہندوستان کے تفسیری مکاتب فکر کی نمائندہ شخصیات اور ان کے علمی کارناموں کی تفصیل بیان کی جائے گی، اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ وہ اس جلد کو مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، برادر عزیز سلیم جاوید اعظمی نے اس کتاب کی کمپوزنگ بڑی محنت سے کی ہے جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

محمد عارف اعظمی عمری

۲۲رمئی ۲۰۰۶ء

شیخ محمد بن احمد شریحی ماریکلی

شیخ محمد بن احمد شریحی ماریکلی ثم دہلوی کی تفسیر "کاشف الحقایق وقاموس الدقایق" ہندوستان میں لکھی جانے والی سب سے پہلی تفسیری تصنیف ہے، اس کے مصنف عہد سلطنت میں سلطان غیاث الدین بلبن کے دور کے صاحب ورع عالم اور بلند پایہ مفسر ومحدث تھے۔

نام ونسب اور خاندانی حالات مصنف کا نام محمد اور والد کا نام احمد تھا، زہد وتقوی کی بنا پر کمال الدین زاہد ان کا لقب ہو گیا تھا(۱)، سلسلۂ نسب یوں ہے، محمد بن احمد بن محمد ماریکلی۔

آبائی وطن صوبہ گجرات میں احمد آباد کے قریب ایک بستی "مرکل" تھا، اسی بنا پر وہ ماریکلی کہلاتے ہیں، تاہم ان کی نشو ونما دہلی میں ہوئی اور یہیں ان کا انتقال ہوا، اس سے زیادہ ان کے خاندانی حالات کتابوں میں نہیں ملتے، البتہ یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں "مرکل" نام کی بستی بڑی مردم خیز تھی، مولانا کمال الدین زاہد کے ایک ہم وطن معاصر طبیب حسام الدین مرکلی کا ذکر تذکروں میں ملتا(۲) اور ان لوگوں سے پہلے مولانا حمید الدین ماریکلی سلطان ناصر الدین ایلتتمش کے عہد میں ایک بزرگ عالم گزرے ہیں(۳)۔

تعلیم مولانا کمال الدین زاہد کو حدیث وفقہ میں زیادہ درک حاصل تھا، ان کے استاد شیخ برہان الدین محمود بلخی تھے جو اس دور کے متبحر عالم اور شریعت وطریقت کے جامع بزرگ تھے(۴) اور امام مرغینانی صاحب ہدایہ کے براہ راست شاگرد تھے اور امام حسن بن محمد صغانی لاہوری سے حدیث پڑھی تھی جو ہندوستان میں لکھے گئے سب سے پہلے مجموعہ حدیث "مشارق الانوار" کے مصنف ہیں۔

(۱) میر خورد، سیر الاولیا، مطبع معارف، لاہور، ۱۹۷۸ء ص ۱۱۵۔ (۲) مولانا عبد الحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۱، دائرۃ المعارف، حیدر آباد، ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء، ص ۱۴۴۔ (۳) ایضاً ص ۱۴۶۔ (۴) ایضاً ص ۲۰۴۔

درس وتدریس تذکرہ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کمال الدین زاہد نے دہلی ہی میں تعلیم پائی، پھر وہیں ایک مسجد میں جو نجم الدین ابوبکر تلواسی کے نام سے منسوب تھی، درس و تدریس میں مشغول ہوئے (۱)، ان کے تلامذہ میں سرفہرست شیخ نظام الدین اولیا ہیں جنہوں نے ان سے ''مشارق الانوار'' پڑھی اور اس کو حفظ کرلیا (۲)، مولانا کمال الدین زاہد نے اپنے قلم سے شاگرد رشید کو سند لکھ کردی جو سیر اولیا میں درج ہے (۳)۔

تقوی اور بے باکی مولانا کمال الدین زاہد بڑے متقی اور خداترس عالم تھے، اسی کے ساتھ وہ بہت جری اور بے خوف بھی تھے، ایک مرتبہ غیاث الدین بلبن نے خواہش ظاہر کی کہ وہ بادشاہ کی نماز کی امامت فرمائیں تو انہوں نے یہ کہہ کر معذوری ظاہر کی کہ میرے پاس نماز کے علاوہ اور کیا ہے، بادشاہ اس کو بھی برباد کرنا چاہتا ہے (۴)۔

وفات مولانا عبدالحئی کے بیان کے مطابق ۶۸۴ھ/۱۲۸۵ء میں دہلی میں ان کا انتقال ہوا (۵)۔

تفسیر کاشف الحقائق وقاموس الدقائق پہلے ذکر آچکا ہے کہ یہ تفسیر ہندوستان میں لکھی گئی سب سے پہلی تفسیر ہے اور یہ از اول تا آخر نہایت فصیح عربی زبان میں ہے، اس کا ایک عمدہ اور نادر مکمل نسخہ مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی مجددی کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے، یہ نسخہ خط نسخ کی دیدہ زیب کتابت کا عمدہ نمونہ ہے اور ۱۱۲۶ صفحات پر مشتمل ہے، ہر صفحہ میں ۲۲ سطریں ہیں جس کی دو سطریں سرخ اور ایک نیلی ہے، چند صفحات مسطر اور بقیہ غیر مسطر ہیں، غیر مسطر صفحات کا سائز طول میں ۲۵ سینٹی میٹر اور مسطر کا سائز لسبائی میں ۱۹ سینٹی میٹر اور چوڑائی میں ۹ سینٹی میٹر ہے، حاشیہ کی جگہ بالکل سادہ ہے، کاغذ قدیم کشمیری چکنا، باریک حنائی رنگ کا ہے اور کتابت نہایت صاف ستھری اور واضح ہے اور اس میں سیاہ چمک دار روشنائی استعمال کی گئی ہے اور جگہ جگہ شنگرفی تحریر کی لالہ کاری بھی موجود ہے، صفحات کی ترتیب بھی درست ہے لیکن کاتب کا نام اور سن کتابت وغیرہ کہیں درج نہیں ہے (۶)۔

(۱) میر خورد، ص ۱۱۵۔ (۲) مولانا عبدالحئی، حوالہ سابق، ص ۲۰۴ ج ۳، دائرۃ المعارف، حیدرآباد ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۳۔ (۳) میر خورد، ص ۱۱۴-۱۱۵۔ (۴) ایضاً ص ۱۱۶۔ (۵) مولانا عبدالحئی، ج ۱، ص ۲۰۴۔
(۶) نظام الدین کاظمی، مقالہ ''تفسیر کاشف الحقائق کا نادر مخطوطہ'' ماہنامہ برہان، ج ۷۶، ص ۳۷۵، اور مولانا نظر علی خاں رام پوری، مقالہ ''تفسیر کاشف الحقائق'' ماہنامہ عقیدت دہلی، ج ۱، شمارہ ۱۔

اس تفسیر کا ایک دوسرا نامکمل نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، جس پر نصرت جنگ کی مہر ثبت ہے اور اس میں ۱۴۷ اوراق ہیں، یہ نسخہ کئی جگہوں پر سادہ رہ گیا ہے اور کچھ جگہوں پر اس کے اوراق کی ترتیب غلط ہوگئی ہے تاہم اس کا اختتام آخری سورہ کی تشریح پر ہوا ہے، اس اعتبار سے اس نسخہ کو یک گو مکمل کہا جاسکتا ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ نامکمل نسخہ خود مصنف کا لکھا ہوا ہے اور اس کے حواشی بھی انہیں کے تحریر کردہ ہیں مگر تفسیر کے اس مکمل نسخہ کو دیکھنے کے بعد جو شاہ ابوالحسن زید کی ملکیت میں ہے، یہ خیال درست نہیں معلوم ہوتا بلکہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا غیر مرتب اور نامکمل نسخہ ہے، اس میں کاتب کا نام اور سن کتابت وغیرہ بھی موجود نہیں ہے۔

خصوصیات تفسیر ۱- اس تفسیر کی بنیادی خصوصیت تو یہی ہے کہ برصغیر ہند و پاک میں ایک ہندی نژاد مصنف کی یہ سب سے پہلے مکمل تفسیر ہے، اس کے مصنف امام بیضاوی (م ۶۸۵ھ/ ۱۲۸۶ء) کے معاصر ہیں اور تفسیر بیضاوی کی طرح اس میں بھی ابتدا میں تفصیلی انداز بیان اختیار کیا گیا ہے اور آہستہ آہستہ مختصر ہوتا گیا ہے۔

۲- اس کی زبان بہت سلیس اور سہل ہے، عبارت میں عربی اصول وقواعد کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے، ذیل میں اس تفسیر کا ابتدائی خطبہ درج کیا جاتا ہے جس سے مولف کی عربی زبان پر قدرت اور تفسیر کے اصول ومنہج کا بھی اندازہ ہوگا۔

الحمد لله رب العالمين الذی انزل	تمام تعریف اللہ رب العالمین کے لیے
علی حبيبه القران وجعله هاديا الی	ہے جس نے اپنے حبیب پر قرآن نازل
دقايق لاهل العرفان واودع فيه لطائف	فرمایا اور اس کو اہل عرفان کے لیے اسرار
اسراره لم يطلع عليها الا من كان	ورموز کی واقفیت کا رہبر بنایا اور اس میں
جديرا لعتبة داره وتقدست ذاته و	ایسے لطیف اسرار سمو دیے جن کی یافت
صفاته عن الكون والفساد وتنزه	اسی کو ہو سکتی ہے جو اس کے در کا اہل ہو،
وجوده عما يصفه اهل الحلول والاتحار	اس کی ذات وصفات کون وفساد سے پاک

و توحد لجلاله عن المشابهة و الحدثان والصلوة والسلام على رسوله محمد خير الانام وآله واصحابه هداة الاسلام جعله بين سائر المظاهر ظهرا جامعا وكالشمس بين الكواكب لامعا اما بعد، فيقول اضعف عباد الله الممجد محمد بن احمد بن محمد الشريحى الكندى ثم التهانيسرى ثم الكجراتى اصلح الله شانه و صانه على شانه وغفر له ولوالديه وانعم عليهما وعليه بما لديه (۱)۔	خیالات سے منزہ، اس کی وحدانیت کون و مکاں سے بے نیاز اور اس کا جاہ وجلال مشابہت اور فنا سے بے داغ ہے اور صلوۃ و سلام ہو اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ پر جو سارے انسانوں میں برتر اور افضل ہیں اور ان کے آل واصحاب پر جو اسلام کے ہادی و رہبر ہیں اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کو سارے مظاہر کا ایک مظہر جامع اور کواکب کے درمیان ایک چمکتا سورج بنایا، اس کے بعد اللہ کا یہ ناتواں بندہ محمد بن احمد بن محمد شریحی کندی ثم تھانیسری گجراتی عرض کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کا حال درست رکھے اور اس میں استقامت بخشے اور اس کی اور اس کے والدین کی مغفرت فرمائے اور اپنے انعامات سے ہم تمام کو نوازے۔

۳- یہ تفسیر جس زمانہ میں لکھی گئی اس وقت ہندوستان میں تصوف کا دور دورہ تھا اور خود مصنف بھی اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے اس میں تصوف کا اثر پورے طور پر نمایاں ہے، بلکہ یہ تفسیر اسی مکتبِ فکر کی ترجمانی اور تشریح کے جذبہ سے لکھی گئی ہے، جس کا ذکر مصنف نے بھی کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

لما كانت اكثر التفاسير مملؤة بفوائد العربية والشريعة ولم يكن تفسير حاويا لدقائق الطريقة والحقيقة	اکثر تفسیروں میں عربی قواعد اور امور شریعت تو کثرت سے بیان کیے گئے ہیں مگر کوئی تفسیر ایسی موجود نہ تھی جس میں موثر انداز میں طریقت

(۱) نظام الدین کاظمی، ص ۳۷۶۔

بحیث یکون احسن تحریرا و اصلح تقریرا اردت ان اکتب تفسیرا موجزا شاملا لاسرار الالهیات کاشفا لما فی القران من التدقیقات هادیا الی طریق الرشاد موصلا الی سبیل السداد ۔(۱)	وحقیقت کے نکات کا ذکر کیا گیا ہو، اسی لیے میں نے ایک مختصر تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا جو الٰہیات کے اسرار و رموز پر مشتمل اور قرآنی تطبیقات پر محیط ہو اور جو رشد و ہدایت کو عام کرے اور راہ راست کی رہبر بن سکے۔

تفسیر کاشف الحقایق کے مآخذ اس تفسیر کی تصنیف میں قدیم تفسیروں سے مدد لی گئی ہے اور متعدد مقامات پر مصنف نے خود بھی لطیف نکتے بیان کیے ہیں، وہ لکھتے ہیں۔

واخذت من بعض التفاسیر بعین الکلام المنقول وقلت فی اکثر مواضع لطائف منی لم یطلع علیها ذوی العقول۔ (۲)	میں نے بعض تفسیروں کی عبارتیں بعینہ نقل کر دی ہیں اور اکثر مقامات پر اپنے ذاتی نکات بھی بیان کیے ہیں جن کا اہل دانش کو پتہ نہیں تھا۔

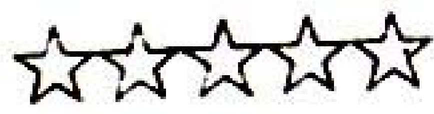
ڈاکٹر محمد سالم قدوائی کے بیان کے مطابق اس تفسیر میں متعدد اکابر صوفیہ، مثلاً ابن عطا، حسن بصری، علامہ دینوری، امام قشیری، مولانا جلال الدین رومی، شمس تبریزی اور شیخ سعدی وغیرہ کے اقوال بھی درج کیے گئے ہیں۔(۳)

ایک غلط فہمی کا ازالہ بعض تذکرہ نگاروں نے کاشف الحقایق اور تفسیر محمدی مصنفہ محمد بن احمد بن نصیر میاں جیو کو ایک ہی تصنیف قرار دیا ہے(۴) جو صحیح نہیں ہے، ڈاکٹر محمد سالم قدوائی نے اس مغالطہ کو تو رفع کر دیا ہے لیکن خود انہوں نے تفسیر کاشف الحقایق کا مصنف شیخ احمد تھانیسری

(۱) نظام الدین کاظمی، حوالہ سابق، ص ۳۷۶۔ (۲) ایضاً۔ (۳) ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، ہندوستانی مفسرین اوران کی عربی تفسیریں، مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۲۶۔ (۴) پروفیسر خلیق احمد نظامی، مقالہ ہندوستان میں علوم قرآنی کی نشوونما" ماہنامہ معارف اعظم گڈھ، ج ۱۴۴، شمارہ ۱، ص ۱۴ و مولانا عبد القدوس، "مغلوں کا دور عروج" تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، ج ۲، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۴۱۔

(م ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء) کو قرار دے کر غلطی کی ہے(۱)، بلاشبہ شیخ تھانیسری اپنے عہد کے باکمال بزرگ اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ تھے مگر تذکروں میں ان کی تصانیف میں تفسیر کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

پہلی مرتبہ مولانا نظر علی خاں رام پوری نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا اور ثابت کیا کہ ''کاشف الحقایق'' کے مصنف ''محمد بن احمد الشریحی الکندی ثم التھانیسری الگجراتی المار یکلی ثم الدہلوی الملقب بہ کمال الدین زاہد ہیں''(۲) جو راقم کے خیال میں ہندوستان کے سب سے پہلے صاحب تصنیف مفسر ہیں۔



(۱) (۵) ڈاکٹر محمد سالم، مقالہ ''تفسیر محمدی'' ماہنامہ معارف اعظم گڈھ، ج ۹۷، شمارہ ۲، ص ۱۳۹ و ۱۴۰۔

(۲) مولانا نظر علی خاں رام پوری، حوالہ سابق۔

شیخ نظام الدین الحسن بن محمد نیشاپوری

ابتدائی حالات نظام نیشاپوری کا نام حسن اور والد کا نام محمد تھا، نظام اعرج کے لقب سے مشہور تھے (۱)، نیشاپور کے علاقہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی، ان کا آبائی وطن نیشاپور کا مشہور شہر قم تھا (۲)، ان کے مزید ابتدائی حالات نہیں ملتے تاہم ان کی تصنیفات اور دوسرے مآخذ سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ساتویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئے اور آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں وفات پائی، مرزا محمد باقر الموسوی کا یہ بیان درست نہیں ہے کہ نظام نیشاپوری نویں صدی کی پیداوار ہیں اور علامہ ابن حجر کے معاصر ہیں (۳)۔

علمی مرتبہ نظام نیشاپوری اپنے عہد کے ممتاز عالم اور صاحب تصانیف تھے، علم تصریف، ریاضی، ہیئت اور فلسفہ کے علاوہ فن تفسیر میں ان کو مکمل دست گاہ حاصل تھی، صاحب روضات الجنات کا بیان ہے:

فامره فی الفضل والادب والتبحر والتحقیق وجودة القریحة فی متاخری علماء العامة اشهر من ان یذکر وابین من ان یسطر وکان من کبراء الحفاظ والمفسرین (۴)۔

متاخرین علمائے اہل سنت میں فضل وکمال، علمی تبحر، ادب وتحقیق اور ذہانت میں ان کی ذات محتاج تعارف نہیں ہے، وہ بلند مرتبہ حافظ اور مفسر تھے۔

عقیدہ ومسلک نظام نیشاپوری کے عقیدہ ومسلک کے بارے میں اختلاف ہے، صاحب

(۱) مرزا محمد باقر الموسوی، روضات الجنات، قلمی، کتب خانہ دار المصنفین، اعظم گڈھ، ورق ۲۲۴ اور جلال الدین سیوطی، بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ، مطبع سعادہ مصر ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء ص ۲۳۰ (۲) محمد باقر، حوالہ سابق (۳) ایضاً (۴) ایضاً

روضات الجنات نے ان کو علمائے اہل سنت میں شمار کیا ہے مگر اسی کے ساتھ بعض لوگوں کی یہ رائے بھی نقل کی ہے کہ وہ مسلکاً شیعہ تھے جس کے مندرجہ ذیل شواہد بیان کیے گئے ہیں۔

۱-ان کا آبائی وطن قم ہے جو امامیہ فرقہ کا مرکز ہے۔

۲-ان کا نام حسن اور ان کے دادا کا نام حسین ہے۔

۳-انہوں نے نصیر الدین طوسی کا تذکرہ بڑے والہانہ طور پر کیا ہے اور ان کی مدح میں جو القاب تحریر کیے ہیں وہ کسی دوسرے مسلک سے وابستہ شخص تحریر نہیں کر سکتا (۱)۔

ڈاکٹر محمد حسین ذہبی کے بیان کے مطابق نظام نیشاپوری پر شیعیت کا الزام محض بہتان ہے، کیوں کہ انہوں نے اپنی تفسیر میں مسلک اہل سنت والجماعت کا ایک فرد اپنے آپ کو بتایا ہے اور شیعہ مسلک کے بعض اہم امور کی تردید بھی ہے (۲)۔

ہمارے ناقص خیال میں نظام نیشاپوری شیعہ نہ بھی رہے ہوں تو کم از کم شیعی عقاید و ماحول سے متاثر ضرور تھے جس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل باتیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱-تفسیر غرائب القرآن کی مدت تصنیف پانچ سال ہے اور یہی حضرت علیؓ کی مدت خلافت بھی ہے اس لیے اس کے زمانہ تصنیف کو مدت خلافت حضرت علیؓ سے تعبیر کیا گیا ہے (۳)۔

۲-باوجودیکہ انہوں نے ولایت علیؓ کے عقیدہ کی تردید کی ہے مگر تفسیر کے اختتام میں ان کو ولی معظم کہا ہے (۴)۔

۳-تفسیر غرائب القرآن میں جا بجا اہل بیت اور ائمہ شیعہ کی تحسین و مدح کی گئی ہے (۵)۔

۴-حضرت ابوبکرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماءؓ کا ذکر ادب و احترام سے نہیں کیا گیا ہے (۶)۔

۵-بنوامیہ کی متعدد مقامات پر مذمت کی گئی ہے (۷)۔

(۱) محمد باقر، حوالہ سابق (۲) ڈاکٹر محمد حسین ذہبی، التفسیر والمفسرون، ج ۱، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ص ۳۲۸ (۳) نظام نیشاپوری، تفسیر غرائب القرآن، مطبوع بر حاشیہ تفسیر طبری، ج ۳۰، مطبعہ میمینہ مصر، ۱۳۲۱ھ/ ۱۹۰۳ء، ص ۲۰۳ (۴) ایضاً ص ۲۰۴ (۵) ایضاً ص ۱۱۹۔ ۱۷۷، ۱۷۹، ۱۹۳ (۶) ایضاً ص ۱۸۵، ۱۸۷، ۱۸۹ (۷) ایضاً ج ۱ ص ۷۷، ۷۸ و ج ۳۰، ص ۱۷۵، ۱۸۹

۶۔ بعض مقامات پر شیعہ مسلک کی توصیف بھی خوبصورت انداز میں کی گئی ہے (۱)۔

وفات عام مورخین نے نظام نیشاپوری کی تاریخ وفات نہیں لکھی ہے، مستشرق بروکلمان نے ان کا سن وفات ۷۱۰ھ/ ۱۳۱۰ء کے آس پاس بتلایا ہے مگر یہ محل نظر ہے کیوں کہ علم ہیئت میں نصیر الدین طوسی کی کتاب "التذکرۃ النصیریہ" کی انہوں نے جو شرح لکھی ہے وہ خود ان کے بیان کے مطابق ربیع الاول ۷۱۱ھ/ جولائی ۱۳۱۱ء میں مکمل ہوئی (۲)، پھر تفسیر غرائب القرآن کے آخری اجزا کی تکمیل بھی ان ہی کے بیان کے مطابق ۷۲۷ھ/ ۱۳۲۶ء کے آواخر میں ہوئی (۳)، حاجی خلیفہ کا بیان ہے کہ نظام نیشاپوری کا انتقال ۷۲۸ھ/ ۱۳۲۷ء میں ہوا (۴)، ہمارے خیال میں یہی بیان زیادہ قرین قیاس ہے۔

تصنیفات نظام نیشاپوری نے تفسیر کے علاوہ علم ہیئت اور علم ریاضی میں بھی بعض کتابیں اور زیادہ تر شرحیں لکھیں، تذکرہ مخزن الغرائب میں مولانا احمد علی خاں سندیلوی نے ان کی شعر و شاعری کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کے مندرجہ ذیل اشعار بھی نقل کیے ہیں:

رخ چو لالہ خط عنبریں دارد
بنفسہ زلف ترا روی بر زمیں دارد
خطا ست زلف ترا شبیہ مشک چیں گفتن
کہ زہرہر صدا ہزار چین دارد
دلم فدائی غمت کرد جان و گرچہ کند
چو رہ جہاں دل مسکین من ہمیں دارد (۵)

ذیل میں نظام الدین نیشاپوری کی تصنیفات کے نام درج کیے جاتے ہیں اور آخر میں ان کی تفسیر کا کسی قدر مفصل تعارف کرایا جائے گا۔

(۱) نظام نیشاپوری، حوالہ سابق، ج ۶، ۱۴۴ (۲) سی اے اسٹوری، فہرست کتب انڈیا آفس، ج ۲، کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ص ۴۸ (۳) نظام نیشاپوری، تفسیر غرائب القرآن، قلمی نسخہ، کتب خانہ دار المصنفین، تفسیر سورۃ القدر (۴) حاجی خلیفہ، کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون، ج ۲، مطبوعہ استنبول ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۲ء، ص ۱۱۹۵ (۵) احمد علی خاں سندیلوی، تذکرہ مخزن الغرائب (قلمی)، کتب خانہ دار المصنفین، ورق ۴۴۳

۱-شرح الشافیہ لابن حاجب: صرف میں ابن حاجب کی الشافیہ مشہور کتاب ہے، یہ اس کی شرح ہے(۱) جو طلبہ میں شرح نظام کے نام سے مشہور و متداول تھی (۲)۔

۲-شرح تحریر المجسطی: نصیر الدین طوسی کی کتاب تحریر المجسطی کی شرح ہے جو شعبان ۷۰۴ھ/فروری ۱۳۰۴ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی (۳)۔

۳-شرح التذکرۃ النصیریہ: علم ہیئت میں ہے اور نصیر الدین طوسی کے التذکرہ کی شرح ہے (۴)، ربیع الاول ۷۱۱ھ/جولائی ۱۳۱۱ء میں مکمل ہوئی (۵)، حاجی خلیفہ نے اس کو مختصر مگر جامع شرح لکھا ہے (۶)۔

۴-الشمسیہ فی الحساب: یہ رسالہ علم حساب میں ہے، رشید الدین فضل اللہ نام کے ایک وزیر کے فرزند عبداللطیف کی جانب اس کا انتساب کیا گیا ہے (۷)، ایک روایت کے مطابق شیخ بھائی نے اس رسالہ کی تلخیص کی تھی (۸)۔

۵-لب التاویل: مصنف کی یہ دوسری تفسیری تصنیف ہے اور ایک جلد میں ہے، اس میں آیات سے تعرض کیے بغیر صرف ان کی تاویلیں یک جا کر دی گئی ہیں (۹)۔

تفسیر غرائب القرآن ورغائب الفرقان

یہ نظام نیشاپوری کی سب سے اہم تصنیف ہے، مصنف کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پہلے مختلف قراتوں کو ذکر کرتے ہیں پھر اوقاف ورموز بیان کر کے آیات کی تشریح کرتے ہیں، اس تفسیر کا اصل ماخذ تفسیر کبیر امام رازی اور تفسیر کشاف ہے (۱۰) اور غالباً اسی بنا پر بعض لوگوں نے اسے تفسیر کبیر کی تلخیص قرار دیا ہے (۱۱) مگر بروکلمان کا بیان ہے کہ یہ تفسیر کبیر کی تلخیص نہیں بلکہ نظام نیشاپوری کی مستقل تصنیف ہے، بروکلمان نے اس خیال کی بھی تردید کی ہے کہ اس تفسیر کے مولف نظام نیشاپوری کے بجائے حسن بن محمد بن حبیب نیشاپوری ہیں (۱۲)۔

(۱) سیوطی، حوالہ سابق، ص ۲۳۰ (۲) محمد باقر حوالہ سابق، ورق ۲۲۴ (۳) استوری حوالہ سابق، ص ۴۸ (۴) محمد باقر، محولہ بالا (۵) استوری محولہ بالا (۶) حاجی خلیفہ حوالہ سابق، ج ۱ ص ۳۹۲ (۷) استوری محولہ بالا (۸) محمد باقر، محولہ بالا (۹) ایضاً (۱۰) نظام نیشاپوری، تفسیر ج ۱ ص ۶ (۱۱) احمد المیہی ومحمد البیلاوی، فہرست کتب خانہ خدیو، مصر، ج ۱، مطبعہ عثمانیہ مصر، ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء، ص ۱۸۳ (۱۲) استوری محولہ بالا

اس تفسیر کے متعدد قلمی نسخے انڈیا آفس لندن (۱)، برٹش میوزیم (۲)، کتب خانہ پیر محمد شاہ، حیدر آباد (۳) اور کتب خانہ دار العلوم دیوبند میں موجود ہیں (۴)، ایک نامکمل نسخہ از سورہ یوسف تا سورہ الناس کتب خانہ دار المصنفین میں بھی ہے، ۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۳ء میں مطبعہ میمنہ، مصر سے تفسیر طبری کے حاشیہ پر یہ طبع ہو چکی ہے اور یہی ہمارے پیش نظر ہے، اس کے علاوہ ایران سے بھی اس کے کئی نسخے چھپ چکے ہیں، ذیل میں اس تفسیر کی بعض نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے:

یہ تفسیر ترتیب و مواد کے لحاظ سے عمدہ اور جامع تفسیر ہے، اس میں عقلی مباحث تفسیر کبیر سے اور نحو و بلاغت کے مسائل کشاف سے جمع کیے گئے ہیں، مصنف نے صرف جمع و اخذ ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ متعدد مقامات پر انہوں ائمۂ تفسیر سے اختلاف کر کے خود اپنی رائے بھی دی ہے (۵)، صاحب روضات الجنات کے خیال میں یہ تفسیر طبری کے ہم پایہ ہے (۶)، اردو دایرۂ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگاروں نے بھی اس کو تفسیر کبیر اور کشاف کے برابر کی کتاب قرار دیا ہے (۷)۔

آیات کا ترجمہ اس تفسیر کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں آیتوں کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا گیا ہے، چنانچہ اس کے ایران سے شایع ہونے والے نسخوں میں اور بعض مخطوطات میں بھی ترجمہ موجود ہے (۸)، تفسیر طبری کے حاشیہ پر اس کا نسخہ جو چھپا ہے اس میں ترجمہ نہیں ہے، تاہم خود مصنف کا بیان ہے کہ انہوں نے آیتوں کا ترجمہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ہم نے پہلے قرآن مجید کا متن درج کیا ہے اور اس کا خوب واضح، سلیس اور جامع ترجمہ بھی کر دیا ہے، جس میں محذوفات و مقدرات کی وضاحت کے ساتھ متشابہ آیات کی تاویل و تشریح، کنایوں کی تصریح اور مجاز و استعارہ پر مبنی لفظوں

(۱) اسٹوری حوالہ سابق (۲) چارلس ریو، فہرست مخطوطات عربی برٹش میوزیم، ۱۸۹۴ء، ص ۷۰ (۳) قاضی محمد زاہد الحسینی، تذکرۃ المفسرین، کاسمو پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۴۰۱ھ / ۱۹۸۲ء، ص ۱۲۴ (۴) محمد ظفیر الدین، تعارف مخطوطات کتب خانہ دار العلوم دیوبند، وسیم فائن پریس، دیوبند، ۱۹۷۰ء، ص ۴۵ (۵) نظام نیشاپوری، تفسیر ج ۳۰، ص ۷ و ۳۹ (۶) محمد باقر محولہ بالا (۷) سید مرتضی حسین و عبد المنان عمر مقالہ "تفسیر"، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور، ج ۶، ۱۹۶۲ء، ص ۵۳۱ (۸) مولانا مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ج ۱، ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۴۴ء، ص ۱۴۲

اور جملوں کی تحقیق بھی کردی ہے کیوں کہ صرف ترجمہ ہی سے قلوب متاثر ہوتے ہیں، البتہ مترجم سے اس میں لغزش کا امکان رہتا ہے کیوں کہ بعض اسرار و رموز عربی کے ماہرین کی دست رس سے باہر ہوتے ہیں، چہ جائے کہ ایک عجمی جو عربی علوم سے بے بہرہ ہے'' (۱)۔

نظام نیشاپوری کے مندرجہ بالا بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ترجمہ محض لفظی نہ تھا بلکہ پورے مفہوم پر جامع اور محیط تھا، البتہ بعض مخطوطات میں ترجمہ درج نہ ہونے کی وجہ غالباً یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان مخطوطات کے ناقلین فارسی سے ناواقف رہے ہوں گے، اس قیاس کی تایید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جن مخطوطات میں ترجمہ درج نہیں ہے ان میں آیتوں کے درمیان یک گونہ خلا موجود ہے (۲)۔

تفسیر غرائب القرآن کی ہندوستان میں تکمیل کی بنیاد

تفسیر غرائب القرآن کے بارے میں بعض تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ اس کی جلد اول وسوم ۷۳۰ھ/ ۱۳۳۰ء میں اور جلد دوم ۱۱ر محرم الحرام ۷۲۸ھ/ ۱۳۲۷ء میں مکمل ہوئی، کیوں کہ تہران سے شایع شدہ ہر جلد کے آخر میں تصریح موجود ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تفسیر کا آخری حصہ پہلے ۷۲۸ھ/ ۱۳۲۷ء میں اور ابتدائی حصہ اس کے بعد ۷۳۰ھ/ ۱۳۳۰ء میں تحریر ہوا ہے، اسی طرح ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ تفسیر ہندوستان کے شہر دولت آباد دکن میں مکمل ہوئی ہے (۳)، اس کے ثبوت میں تفسیر میں سورہ نساء کے اختتام پر درج ذیل عبارت کو پیش کیا جاتا ہے:

کتب المصنف فی نسخته علقه مولفه الحسن بن محمد حسن المشتهر بنظام نیشافوری ببلاد الهند فی دار مملکتها المدعو بدولت آباد فی اوائل صفر ۷۳۰ھ (۴)۔	مصنف نے اپنے نسخہ میں لکھا ہے کہ مولف حسن بن محمد بن حسن مشہور بہ نظام نیشاپوری نے اس کو دیار ہند میں وہاں کے پایہ تخت دولت آباد میں صفر ۷۳۰ھ/ ۱۳۳۰ء کے اوایل میں لکھا ہے۔

(۱) نظام نیشاپوری، تفسیر، ج۱، ص۶ (۲) دیکھیے مخطوطہ، کتب خانہ دار المصنفین (۳) سید مرتضی حسین، محولہ بالا
(۴) نظام نیشاپوری، تفسیر، ج۶، ص۳۹

یہاں دونوں باتیں غور طلب ہیں، ایک تو اس تفسیر کی تالیف کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ ترتیب معکوس کے موافق مکمل ہوئی جب کہ اس کی تائید خود تفسیر کے مطالعہ سے نہیں ہوتی ہے، اس میں جا بجا ماقبل سورتوں کے حوالے اس طور پر دیے گئے ہیں جس سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ترتیب اصلی کے مطابق لکھی گئی ہے (۱)، دوسرے اس تفسیر کی ہندوستان میں تکمیل کی بابت مذکورہ بالا عبارت جو پیش کی جاتی ہے، وہ خود مصنف کی نہیں ہے بلکہ تفسیر کے جامع کی ہے اور غالباً اسی بنا پر قوسین میں درج ہے، پھر مولف کے ہندوستان وارد ہونے اور دولت آباد میں قیام کرنے کی صراحت کہیں موجود نہیں ہے اور خود مصنف نے اپنے آپ کو کہیں بھی دولت آبادی نہیں لکھا ہے اور ان کے تمام تذکرہ نگاران کو صرف نظام نیشاپوری ہی لکھتے ہیں، اس لیے ہمارے خیال میں اس تفسیر کی ہندوستان میں تکمیل کے بارے میں محض مندرجہ بالا عبارت کافی نہیں ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ تفسیر غرائب القرآن کے ایک کاتب سید نصر اللہ بن سید صالح الازفولی نے اپنے مخطوطہ میں تفسیر کا نام انوار التنزیل لکھ دیا ہے (۲) اور یہ تفسیر کے مطبوعہ مصری اڈیشن پر طبع بھی ہو گیا ہے، حالاں کہ مولف کے بیان کے مطابق تفسیر کا نام غرائب القرآن و رغائب الفرقان ہی ہے (۳)۔

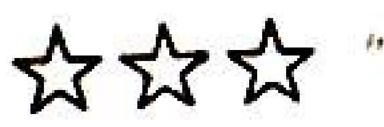
ماخذ تفسیر اس تفسیر کے اولین ماخذ میں تفسیر کبیر اور کشاف کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، ان کے علاوہ یہ کتابیں بھی ان کے پیش نظر رہیں، جن کا ذکر انہوں نے مقدمہ میں کیا ہے: ۱- علم اوقاف میں امام سجاوندی کی کتاب (۴)، ۲- سبب نزول کے بیان میں جامع الاصول اور تفسیر واحدی، ۳- علم لغت میں صحاح الجوہری، ۴- علم معان و بیان اور ادبی مسایل میں المفتاح اور بعض دوسرے

(۱) نظام نیشاپوری، تفسیر، ج ۱۲، ص ۸۸، ج ۱۳، ص ۱۶۹، ج ۳۰، ص ۲۲، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۱۴۵

(۲) خاتمہ مخطوطہ، دار المصنفین (۳) نظام نیشاپوری، حوالہ سابق، ج ۱، ص ۱۷، خاتمہ، ج ۳۰ (۴) مولف کا مکمل نام محمد بن طیفور سجاوندی غزنوی ہے، اس کتاب کا ایک ناقص قلمی نسخہ کتب خانہ دار المصنفین میں محفوظ ہے۔

مراجع، ۵-شرعی احکام کے اخذ ونقل میں فقہ کی کتابیں بالخصوص امام رافعی کی شرح الوجیز (۱) ۶-اور فن تاویل میں نجم الدین ابو بکر عبد اللہ بن محمد الاسدی مشہور بہ دایہ کی بحر الحقایق والمعانی (۲) سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے۔

مجموعی اعتبار سے تفسیر غرائب القرآن نظام نیشاپوری کا بڑا علمی کارنامہ ہے اور اگر یہ صحیح ہے کہ وہ ہندوستان وارد ہوئے اور اس کے بعض اجزا کی تکمیل انہوں نے یہیں کی تو سرزمین ہند کے سب سے پہلے مترجم قرآن ہونے کا سہرا ان ہی کے سر بندھتا ہے۔



(۱) امام غزالی کی کتاب الوجیز کی شرح ہے اور اس کا پورا نام فتح العزیز علی کتاب العزیز ہے (۲) اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں ہے، ملاحظہ ہو معین الدین ندوی، فہرست مخطوطات کتب خانہ خدا بخش، ج ۱۸، حصہ دوم، ۱۹۳۰ء، ص ۱۳۶

شیخ ابوبکر اسحاق بن تاج ملتانی

ابتدائی حالات شیخ ابوبکر اسحاق بن تاج ملتانی ہندوستان کے ابتدائی مفسروں میں شمار کیے جاتے ہیں، یہ ایک حنفی المذہب صوفی بزرگ اور عالم تھے اور اپنی کنیت ''ابن التاج'' سے مشہور تھے، ۷۳۶ھ/ ۱۳۳۵ء کے آس پاس ان کی وفات ہوئی، اس کے علاوہ ان کے تفصیلی حالات کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا ہے۔

مسالک الابصار کے ایک راوی شریف سمرقندی کا بیان ہے کہ شیخ ابن التاج کو سلطان محمد تغلق سے قرب و اختصاص حاصل تھا، جب سلطان ملتان میں مقیم تھا اس دوران وہ اس کے انعام واکرام سے بہرہ مند ہوتے رہے، پھر اسی کے ساتھ دہلی چلے آئے (۱)، مسالک الابصار کے حوالے سے قلقشندی نے محمد تغلق کے جود وسخا کے ذکر میں ابن التاج کی ایک روایت بھی نقل کی ہے، وہ یہ ہے:

حکی الشیخ ابو بکر بن ابی الحسن الملتانی انہ استفاض منہ انہ التزم انہ لا ینطق فی اطلاقاتہ باقل من ثلاثۃ آلاف مثقال الی غیر ذالک من العطاء الذی یخرق العقول ۔(۲)	شیخ ابوبکر بن ابوالحسن ملتانی کی حکایت ہے کہ (محمد تغلق) کا یہ عام طریقہ تھا کہ اس کا کوئی بھی انعام تین ہزار مثقال سے کم نہ ہوتا تھا، اس کے عطیے عقل کو حیرت زدہ کردیتے تھے۔

تصنیفات شیخ ابن التاج نے کئی کتابیں لکھیں جن میں سے بعض کے قلمی نسخوں کی تفصیل مستشرق آلورٹ نے بیان کی ہے، ان کی تصنیفات میں قرآن مجید کی ایک مکمل تفسیر ''جواہر القرآن''

(۱) آغا مہدی حسین، سلطان الہند محمد تغلق (اردو ترجمہ) سٹی پریس، الہ آباد، ۱۹۳۷ء، ص ۱۷۰ (۲) ابوالعباس احمد القلقشندی، صبح الاعشی، مطبعہ امیریہ، قاہرہ، ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۷ء، ج ۵ ص ۹۱

کو خاص اہمیت حاصل ہے، ذیل میں ان کی تصنیفات کے نام درج ہیں:

۱- خلاصۃ الاحکام بشرائط الایمان والاسلام، اس کتاب کے دو نسخے برلن لائبریری میں ہیں۔

۲- کتاب الحج والمناسک۔

۳- نسبہ خرقۃ التصوف۔

۴- الذکر الاکبر۔

ان کتابوں کے نسخے بھی برلن لائبریری میں موجود ہیں (۱)۔

تفسیر جواہر القرآن یہ قرآن مجید کی مکمل تفسیر تھی، اس کا ایک خلاصہ شیخ ابن التاج نے "خلاصۃ جواہر القرآن فی بیان معانی الفرقان" کے نام سے خود تیار کیا تھا، اصل تفسیر کا تو کہیں پتہ نہیں چلتا، البتہ خلاصہ کا ایک نسخہ برلن لائبریری میں محفوظ ہے (۲)۔

خصوصیات تفسیر شیخ ابن التاج کی تفسیر کا بیشتر مواد امام غزالی کی تفسیر "جواہر القرآن" سے ماخوذ ہے، اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مشکل الفاظ کے معانی ذکر کر دیے گئے ہیں اور بعض لفظوں کا فارسی ترجمہ بھی کیا گیا ہے، قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے (۳)۔

☆☆☆☆

(۱) ڈاکٹر احسان الٰہی رانا، مقالہ "سلاطین دہلی"، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ج ۲، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۱۵۸-۱۵۹ (۲) ایضاً (۳) ایضاً۔

شیخ محمد بن یوسف حسینی گیسو دراز

نام و نسب اور خاندانی حالات نام سید محمد، کنیت ابوالفتح اور القاب صدر الدین، الولی الاکبر اور الصادق ہیں، علاقہ دکن میں خواجہ بندہ نواز اور خواجہ گیسو دراز کے لقب سے مشہور ہیں (۱)۔

سلسلۂ نسب یوں ہے: محمد بن یوسف بن علی بن محمد بن یوسف بن حسن بن محمد بن علی بن حمزہ بن داؤد بن زید بن ابوالحسن الجندی (۲)۔

گیسو دراز کے لقب کا واقعہ یہ ہے کہ ایک بار وہ اپنے مرشد شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی پالکی مریدوں کے ساتھ اٹھائے چل رہے تھے، ان کے بال بڑے بڑے تھے، وہ پالکی میں الجھ گئے مگر اس حالت میں بھی وہ پالکی کو کندھے پر لیے دور تک نکل گئے، جب شیخ نصیر الدین کو اس کی خبر ہوئی تو اپنے مرید کی محبت اور عقیدت سے بہت خوش ہوئے اور برجستہ یہ شعر پڑھ کر انہیں گیسو دراز کا لقب دیا۔

ہر کہ مرید سید گیسو دراز شد   واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد (۳)

اسی کے بعد سے وہ گیسو دراز کے لقب سے اس طرح مشہور ہوئے کہ یہ ان کے نام کا جز بن گیا۔

شیخ گیسو دراز کا خاندان خراسان کا تھا، ان کے مورث اعلا ابوالحسن جندی مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ ہرات سے دہلی آئے اور یہیں ایک معرکۂ جہاد میں شہادت پائی (۴) اور

(۱) شاہ محمد علی سامانی، سیر محمدی، یونانی دوا خانہ پریس، الہ آباد، ص ۱-۲ (۲) ایضاً ص ۶ (۳) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار فی اسرار ابرار، مطبع ہاشمی، میرٹھ، ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء، ص ۲۳، اور مفتی غلام سرور لاہوری، خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ثمر ہند پریس، لکھنؤ، ۱۸۷۳ء، ص ۳۸۱ (۴) سخاوت مرزا، مقالہ ''گیسو دراز'' اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۱۷، لاہور ۱۹۷۸ء، ص ۵۸۵

مسجد ایاز دہلی میں مدفون ہوئے (۱)۔

شیخ گیسودراز کے والد سید یوسف حسینی عرف سید راجہ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ارادت مندوں میں تھے (۲) اور والدہ ماجدہ کا نام بی بی رانی تھا، جو دولت آباد کے صوبے دار ملک الامرا سید ابراہیم مستوفی خاں کی ہمشیرہ تھیں (۳) اور نانا شیخ نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے (۴)۔

ولادت ۴/رجب ۷۲۱ھ/جولائی ۱۳۲۱ء کو دہلی میں ولادت ہوئی (۵)، بعض کتابوں میں سن ولادت ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء اور ۷۲۳ھ/۱۳۲۲ء درج ہے (۶) مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

قیام دیوگیر شیخ گیسودراز کی عمر ابھی چار برس تھی کہ سلطان محمد تغلق نے دیوگیر (دولت آباد) کو پایہ تخت بنا کر دہلی کے اصحاب علم وفضل اور عام باشندوں کو وہاں منتقل ہونے کا حکم دیا، چنانچہ شیخ گیسودراز کو بھی اپنے خاندان کے ہم راہ دولت آباد جانا پڑا (۷)۔

بچپن کے حالات محمد علی سامانی کا بیان ہے کہ دولت آباد میں شیخ گیسودراز کے والد ایک بزرگ شیخ بابو کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے اور اپنے ساتھ اپنے فرزند کو بھی ان کی مجلس میں لے جاتے تھے، شیخ بابو نے اس ہونہار بچے کے لیے دعائے خیر کی اور اس کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی بھی کی، چنانچہ بچپن ہی سے ان میں بزرگی کے آثار نمایاں ہونے لگے، وہ جب آٹھ برس کے ہوئے تو وضو، نماز اور دوسرے دینی کاموں کا اہتمام کرنے لگے، اپنے ہم عمر بچوں کو بھی ان کاموں میں شریک کرتے اور ان کو اس کی تلقین کرتے تھے جس کی بنا پر تمام بچے ان کے گرویدہ ہو گئے تھے (۸)۔

تعلیم وتربیت شیخ گیسودراز کی ابتدائی تعلیم وتربیت ان کے والد اور نانا کی آغوش میں ہوئی (۹) اور وہیں سے ان کے دل میں بزرگوں کی محبت اور شیفتگی کا جذبہ پیدا ہوا، پھر باقاعدہ ایک استاذ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے پندرہ سال کی نوعمری میں مصباح اور قدوری تک تعلیم حاصل کی (۱۰)۔

(۱) سید محمد اکبر حسینی، جوامع الکلم، انتظامی پریس دکن، مقدمہ از حافظ عطا حسین، ص ۷ (۲) محمد علی سامانی، ص ۸ (۳) ایضاً ص ۱۰ (۴) ایضاً ص ۸ (۵) ایضاً ص ۳ (۶) سخاوت مرزا، حوالہ سابق، بحوالہ لطائف اشرفی و تاریخ حبیبی، (قلمی) (۷) محمد علی سامانی ص ۸ (۸) ایضاً (۹) ایضاً (۱۰) ایضاً ص ۱۰

مراجعت دہلی شیخ گیسودراز کو بزرگوں سے محبت وعقیدت ورثہ میں ملی تھی، وہ شیخ نظام الدین اولیا کی زیارت سے تو محروم رہے مگر ان کے خلیفہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ سے شرف ملاقات کے لیے بے چین رہتے تھے مگر دولت آباد سے دہلی کی دوری اس میں مانع تھی، شیخ گیسودراز جب پندرہ سال کے ہوئے تو آتش شوق اور بھڑک اٹھی اور اتفاق سے اس کا سامان بھی ہوگیا، وہ یوں کہ ان کے والد کے انتقال کے چار سال بعد اور غالباً نانا کی وفات کے فوراً بعد ان کی والدہ کو اپنے بھائی ملک الامرا سید ابراہیم مستوفی سے ناراضگی پیدا ہوئی اور وہ اس درجہ ناراض ہوئیں کہ اپنے دونوں بچوں شیخ گیسودراز اور ان کے برادر کلاں سید حسین عرف چندن کو ساتھ لے کر دولت آباد سے دہلی کے لیے روانہ ہوگئیں اور کئی مہینوں کے سفر کے بعد وہاں پہنچیں (۱)۔

بیعت دہلی پہنچ کر شیخ گیسودراز نماز جمعہ کے لیے جامع مسجد سلطان قطب الدین گئے، یہ مسجد اندرون سرائے تھی، وہ ابھی مسجد کے صحن میں بیٹھے ہی تھے کہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ مسجد میں داخل ہوئے، شیخ گیسودراز ان کے چہرہ مبارک کے جمال وانوار کو دیکھ کر مسحور ہوگئے اور دل میں سوچا کہ کاش یہی شیخ نصیر الدین ہوتے، تحقیق حال سے جب پتہ چلا کہ یہی شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی ہیں تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی، غرض ۱۶ر رجب ۷۳۶ھ/ ۲۹ر فروری ۱۳۳۶ء کو اپنے بڑے بھائی کو ساتھ لے کر ان سے بیعت ہوئے (۲)۔

تکمیل تعلیم شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ سے بیعت ہونے کے بعد وہ سلوک کی وادی میں گامزن ہونا چاہتے تھے مگر ان کے شیخ نے ان کو حکم دیا کہ وہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کریں (۳)، چنانچہ انہوں نے درسیات کی بعض کتابیں مولانا شرف الدین کیتھلی اور بعض مولانا تاج الدین مقدم سے پڑھیں اور اس دوران اپنے پیر ومرشد سے بھی تعلق رکھتے رہے، چنانچہ تعلیم کے ساتھ ذکر ومجاہدہ کا معمول بھی جاری تھا (۴)، اس مدت میں غلبہ حال سے مجبور ہوکر انہوں نے اپنے گھر کو بھی خیر باد کہا اور حظیرہ شیر خاں جہاں پناہ میں ایک حجرہ میں اقامت گزیں ہوگئے، اس حجرہ میں انہوں نے دس برس کا عرصہ گزارا اور وہیں سے اپنے مرشد کی خدمت میں حاضری دیتے تھے

(۱) محمد علی سامانی، ص ۶-۱۰ (۲) ایضاً ص ۱۰-۱۱ (۳) مولانا عبدالحئی، ج ۳، ص ۱۶۱ (۴) محمد علی سامانی، ص ۱۱-۱۲

اور ان کے حکم کی تعمیل میں قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی کی خدمت میں حاضر ہو کر درس بھی لیتے تھے (۱)، مولانا عبدالحئی کے بیان کے مطابق انہوں نے قاضی صاحب سے شمسیہ صحایف، مفتاح العلوم، ہدایہ، اصول بزدوی، کشاف اور بعض دوسری درسی کتابیں پڑھیں (۲)، اردو دایرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار نے حدایق الانس کے حوالہ سے ان کے اساتذہ کی فہرست میں عمادالدین تبریزی کا بھی نام گنایا ہے (۳)۔

غرض انیس سال کی نوعمری میں وہ تحصیل علم سے فارغ ہو گئے اور اس کے بعد مجاہدہ و ریاضت کی جانب مکمل توجہ مبذول کی اور انتہائی سخت ریاضتیں کر کے اپنے مرشد کے اس درجہ مقرب بن گئے کے ان کے انتقال بعد متفقہ طور پر ان کے جانشین مقرر ہوئے (۴)۔

قیام دکن شیخ گیسودراز دہلی میں تقریباً ۶۵ برس مقیم رہے، ۸۰ برس کی عمر میں تیموری حملہ کے دوران وہ دہلی سے نکلنے پر مجبور ہوئے، اپنے اہل وعیال اور متوسلین کے ہم راہ وہ بڑی بے سروسامانی کے عالم میں دہلی سے روانہ ہو کر گجرات پہنچے، پھر وہاں سے دکن کے لیے روانہ ہوئے، اس سفر کی مکمل تفصیل ان کے مرید محمد علی سامانی نے بیان کی ہے جو اس سفر میں ان کے ساتھ تھے، وہ لکھتے ہیں:

"۷ ربیع الثانی ۸۰۱ھ/۱۷ دسمبر ۱۳۹۸ء کو تیموری حملہ کے دوران شیخ گیسودراز اپنے اہل خانہ اور متعلقین کو ساتھ لے کر دروازہ بھیلسہ کی راہ سے دہلی سے باہر نکلے اور بہادر نام کی ایک جگہ پہنچے جہاں ان کے دو مرید رہتے تھے، انہوں نے اس قافلہ کو بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ ٹھہرایا، وہیں سے شیخ گیسودراز نے ۱۸ ربیع الثانی ۸۰۱ھ/۲۸ دسمبر ۱۳۹۸ء کو اپنے مرید مولانا علاء الدین کو گوالیار بہ ذریعہ خط اس سانحہ کی اطلاع کی اور اپنے گوالیار پہنچنے کا تذکرہ کیا، ۲۰ ربیع الثانی ۸۰۱ھ/۳۰ دسمبر ۱۳۹۸ء کو گوالیار کے لیے روانہ ہوئے اور ۲۳ ربیع الثانی ۸۰۱ھ/یکم جنوری ۱۳۹۹ء کو وہاں پہنچ گئے، اس درمیان میں ان کے قافلہ کو بعض صعوبتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا، پھر وہاں سے بھاندیر، ایرچہ، چھترہ اور

(۱) محمد علی سامانی، ص ۱۳ (۲) مولانا عبدالحئی، ج ۳، ص ۱۶۱ (۳) سخاوت مرزا، ص ۵۸۶ (۴) سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم صوفیہ، معارف پریس، اعظم گڈھ، ۱۹۷۱ء، ص ۵۵۸ وبعد

چندیری ہوتے ہوئے عید الفطر ۸۰۱ھ/ ۶ رجون ۱۳۹۹ء کی شب میں بڑودہ پہنچے، ان مقامات پر ہر جگہ لوگوں نے ان کا والہانہ استقبال کیا اور بڑی تعداد میں مرید ہوئے، ذی القعدہ ۸۰۱ھ/ جولائی ۱۳۹۹ء میں بڑودہ سے کھنبایت گئے پھر بڑودہ واپس آکر سلطان پور کے راستہ سے دولت آباد کے لیے رخت سفر باندھا، دولت آباد میں اپنے والد کی قبر پر حاضری دی، پھر وہاں سے فتح آباد عرف دیوگر پہنچے، یہ خطہ سلطان فیروز شاہ بہمنی کے زیر اقتدار تھا، سلطان کو شیخ گیسودراز کی آمد کا علم ہو چکا تھا، چنانچہ اس نے فتح آباد کے گورنر کو یہ تاکیدی فرمان بھیجا کہ وہ شیخ گیسودراز کی خدمت میں حاضر ہو کر سلطان کی جانب سے نذرانے پیش کرے، وہیں سے شیخ گیسودراز نے احسن آباد عرف گلبرگہ کا رخ کیا، ان کی پیشوائی کے لیے خود سلطان فیروز شاہ شہر سے باہر فوج کے ہم راہ آیا اور شیخ سے گلبرگہ میں اقامت پذیر ہونے کی درخواست کی جس کو انہوں نے قبول کرلیا اور پھر مدۃ العمر گلبرگہ ہی میں رہ گئے" (۱)۔

گلبرگہ میں قیام کے دوران بے شمار خلق خدا کو ان کی ذات سے فایدہ پہنچا (۲) سلطان فیروز شاہ بہمنی اور اس کے جانشین احمد شاہ بہمنی سے بھی ان کے نہایت خوش گوار تعلقات رہے، ان ہی سے عقیدت و تعلق کی بنا پر احمد شاہ بہمنی نے اپنے عہد حکومت میں پورے خطۂ دکن میں احکام شریعت کی ترویج پر خاص توجہ کی۔

ازواج و اولاد چالیس سال کی عمر میں اپنی والدہ کے اصرار پر سید احمد بن مولانا جمال الدین مغربی کی صاحب زادی بی بی رضا خاتون سے نکاح کیا (۳)، ان کے بطن سے دو صاحب زادے سید حسین عرف سید محمد اکبر حسینی اور سید یوسف عرف سید محمد اصغر حسینی اور تین صاحب زادیاں بی بی فاطمہ، بی بی بتول اور بی بی امۃ الدین پیدا ہوئیں (۴)۔

دونوں صاحب زادے جید عالم تھے، معقولات اور منقولات کی تعلیم دہلی کے کبار اساتذہ سے پائی، سید محمد اکبر جامع کمالات تھے، انہوں نے عربی اور فارسی میں کئی کتابیں لکھیں، اپنے

(۱) محمد علی سامانی، ص ۲۱ تا ۲۹ (۲) عبد الحق محدث، ص ۱۲۳، غلام سرور، ج ۱، ص ۳۸۱

(۳) محمد علی سامانی، ص ۲۱ (۴) ایضاً ص ۱۱۹ تا ۱۳۰۔

والد کے ملفوظات کے دو مجموعے بھی مرتب کیے جن میں جوامع الکلم کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی، یہ اپنے والد کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے، دوسرے صاحب زادے سید محمد اصغر اپنے والد کی وفات کے بعد سجادہ مشیخت پر متمکن ہوئے اور آج بھی اس خاندان کے لوگ گلبرگہ میں آباد ہیں (۱)۔

وفات شیخ گیسودراز کو کافی لمبی عمر نصیب ہوئی، دہلی ہی میں وہ ۸۰ برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے، پھر گلبرگہ آکر تقریباً ۲۲-۲۳ برس تک اصلاح ورشد کا فریضہ انجام دیتے رہے، ۱۶/ذی القعدہ ۸۲۵ھ/یکم نومبر ۱۴۲۲ء کو دوشنبہ کے دن اشراق وچاشت کے درمیان وفات پائی، انتقال کے وقت ان کی عمر ایک سو چار سال سے زاید تھی (۲) وصیت کے مطابق مولانا بہاء الدین امام نے غسل دیا اور مولانا سراج الدین نے ان کی معاونت کی، "مخدوم دین ودنیا" (۳) اور "مہ سپہر ولایت بودند" سے تاریخ وفات نکلتی ہے (۴)۔

تصنیفات مشائخ صوفیہ میں شیخ گیسودراز کو اس بنا پر یک گونہ برتری حاصل ہے کہ انہوں نے مختلف علوم وفنون میں بہ کثرت کتابیں لکھیں، وہ اپنی کتابوں اور رسالوں کو املا کراتے تھے (۵)، عام تذکرہ کی کتابوں میں ان کی تصنیفات کی تعداد ۱۰۵ بتائی گئی ہے (۶)، صاحب نزہۃ الخواطر نے اپنے والد کی تصنیف "مہر جہاں تاب" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کی ۱۲۵ کتابیں مختلف فنون میں شمار کی گئی ہیں (۷)، سیر محمدی میں ان کی درج ذیل کتابوں کے نام بیان کیے گئے ہیں۔

۱- **تفسیر ملتقط** : یہ صوفیانہ انداز کی تفسیر ہے، اس کا قلمی نسخہ انڈیا آفس کی لائبریری (۸) اور ناصریہ کتب خانہ لکھنؤ میں موجود ہے (۹)، یہ تفسیر عربی میں ہے اور بعض مقامات پر فارسی میں بھی وضاحت کی گئی ہے (۱۰)۔

۲- **تفسیر بطرز کشاف** : اس کتاب کے بارے میں تفصیل معلوم نہ ہو سکی تاہم یہ ضرور

(۱) شیخ گیسودراز کے خاندانی احوال کی تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں، سیر محمدی، باب ششم (۲) ایضاً ص ۲۹ (۳) ایضاً (۴) سخاوت مرزا، ص ۵۸۶ (۵) محمد علی سامانی، ص ۱۰۳ (۶) سخاوت مرزا، ص ۵۸۷ (۷) عبدالحئی، ج ۳، ص ۱۶۳ (۸) اوٹو لوتھ، فہرست مخطوطات عربی انڈیا آفس، لندن، ص ۲۴ (۹) محمد سالم، ہندوستانی مفسرین، ص ۳۰ (۱۰) اوٹو لوتھ، بحوالہ۔

11959

اندازہ ہوتا ہے کہ تفسیر کشاف سے ان کو خاص انس تھا، چنانچہ ان کی زیر نگرانی ان کے ایک بھتیجے کشاف پڑھتے تھے (۱)، ممکن ہے کہ طلبہ کے لیے انہوں نے کشاف کے طرز پر کوئی تفسیری کتاب تصنیف کی ہو۔

۳- **حواشی کشاف:** تفسیر کشاف کے پانچ ابتدائی اجزا پر حواشی ہیں، یہ کتاب نامکمل ہے۔

۴- **شرح مشارق الانوار:** امام صغانی کے مجموعہ حدیث مشارق الانوار کی شرح ہے، غالب گمان ہے کہ یہ شرح عربی میں رہی ہوگی۔

۵- **ترجمہ مشارق الانوار:** مشارق الانوار کا فارسی ترجمہ ہے۔

۶- **معارف:** شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی مشہور صوفیانہ کتاب ''عوارف المعارف'' کی عربی شرح ہے۔

۷- **ترجمہ عوارف:** عوارف المعارف کی فارسی شرح ہے جو ترجمہ کے نام سے مشہور ہے اور معارف کی بہ نسبت مختصر ہے (۲)۔

۸- **شرح تعرف:** شیخ ابوبکر محمد بن ابراہیم کلابازی کی کتاب التعرف کی شرح ہے۔

۹- **شرح آداب المریدین (عربی وفارسی):** شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردیؒ کی کتاب ''آداب المریدین'' کی شرح ہے، شیخ گیسودراز نے اپنے ارادت مندوں کی خواہش پر دو تین مرتبہ اس کتاب کا ترجمہ بعض مختصر اور بعض مفصل کیا تھا اور ان کو ارادت مندوں نے اپنے پاس رکھ لیا، غرض ان کی موجودگی میں یہ تمام ترجمے نایاب ہوگئے، چنانچہ انہوں نے چوتھی مرتبہ اس کتاب کی مفصل فارسی شرح لکھی اور عربی میں بھی اس کی شرح کی (۳)، عربی شرح اور تراجم تو ناپید ہیں البتہ فارسی شرح کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں محفوظ ہے (۴)۔

۱۰- **شرح فصوص الحکم:** شیخ محی الدین بن عربی کی مشہور تصنیف کی شرح ہے۔

۱۱- **شرح تمہیدات عین القضاۃ ہمدانی:** ابوالمعانی عبداللہ المعروف بہ عین القضاۃ

(۳۹) محمد علی سامانی، ص ۷۵ (۲) خواجہ گیسودراز، خاتمہ، زندہ طلسمات برقی پریس، دکن، (مقدمہ)، ص ۱۷ (۳) شیخ گیسودراز شرح آداب المریدین، انتظامی پریس دکن، ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء، ص ۳ (۴) مرزا اشرف علی، کیٹلاگ آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، بشپ مشن پریس، کلکتہ، ۱۸۹۲ء، ص ۴۹۔

کی مشہور تصنیف کی شرح ہے، اس کا ایک بوسیدہ قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسایٹی آف بنگال کے کتب خانہ میں موجود ہے (۱)۔

۱۲- شرح رسالہ قشیریہ: امام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیری کے رسالہ کی فارسی شرح ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۰۷۹ھ/ ۱۶۶۸ء کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد میں موجود ہے (۲)۔

۱۳- حظایر القدس (فارسی): اس کو عشق نامہ بھی کہتے ہیں، یہ کتاب شیخ گیسودراز کی درگاہ کی جانب سے طبع ہو چکی ہے (۳)۔

۱۴- استقامۃ الشریعۃ بطریقۃ الحقیقۃ: اس کتاب میں شریعت وطریقت سے بحث کی گئی ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن میں موجود ہے (۴)۔

۱۵- رسالہ سیر النبی ﷺ: فن سیرت پر ایک رسالہ ہے۔

۱۶- شرح فقہ اکبر (عربی وفارسی)۔

۱۷- حواشی قوت القلوب: شیخ ابوطالب محمد بن ابی الحسن بن علی کی مشہور تصنیف پر حواشی ہیں، اس کتاب کا باقاعدہ درس ان کی مجلس میں ہوتا تھا (۵)۔

۱۸- اسمار الاسرار: یہ شیخ ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم کے نہج پر لکھی گئی ہے اور تصوف کے دقیق مباحث پر مشتمل ہے، اس کتاب کو بھی مولوی سید عطا حسین صاحب نے ۱۳۵۰ھ/ ۱۹۳۱ء میں حیدرآباد سے شایع کیا ہے۔

۱۹- حدایق الانس: اس میں معرفت کے کچھ اسرار بیان کیے گئے ہیں۔

۲۰- خاتمہ: یہ دراصل آداب المریدین کی شرح کا تکملہ ہے جس میں ایک سالک کے لیے عبادت ومعاملات کا لائحہ عمل بیان کیا گیا ہے، اس کو بھی مولوی سید عطا حسین صاحب نے ایک مفید مقدمہ کے ساتھ ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۷ء میں حیدرآباد سے طبع کرادیا ہے۔

(۱) مرزا اشرف علی، ص ۵۴ (۲) سید تصدق حسین کاظمی، فہرست کتب خانہ آصفیہ، ج ۱، اختر دکن پریس، حیدرآباد، ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء، ص ۳۷۲ (۳) شیخ محمد اکرام، آب کوثر، سراج محمدی پریس، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۳۷۱ (۴) سی اے اسٹوری، ص ۱۰۲۷ (۵) محمد علی سامانی، ص ۷۵۔

مذکورہ بالا تصنیفات کے علاوہ شیخ گیسودراز کے متعدد رسالے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال اور کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہیں، ان کو قدیم دکھنی اردو کے ابتدائی مصنفین میں بھی شمار کیا جاتا ہے اور اس زبان میں لکھی گئی بعض اہم ابتدائی کتابیں ان کی جانب منسوب کی جاتی ہیں جن میں معراج العاشقین کو نمایاں اہمیت حاصل ہے، اس کتاب کو مولوی عبدالحق صاحب نے ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۴ء میں ایڈٹ کر کے ایک مقدمہ کے ساتھ شایع کیا، پھر دوبارہ ۱۹۵۷ء میں گوپی چند نارنگ نے اسے شایع کیا۔

تفسیر ملتقط شیخ گیسودراز کی تفسیر کا ذکر محمد علی سامانی نے متعدد مقامات پر کیا ہے، ان کے بیان کے مطابق اس تفسیر کا باقاعدہ درس شیخ گیسودراز کی مجلس میں ہوتا تھا (۱) اور ان کے فرزند اکبر سید محمد اکبر نے اس کی شرح بھی لکھی تھی (۲)، مگر یہ شرح نایاب ہے، البتہ تفسیر ملتقط دو جلدوں میں انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، اس کتب خانہ میں پہلی جلد کے دو نسخے اور دوسری جلد کا ایک نسخہ ہے، پہلی جلد سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۂ کہف تک ہے اور دوسری جلد سورۂ مریم سے شروع ہو کر اختتامِ قرآن مجید تک ہے اور دونوں ہی جلدوں کے مخطوطے نہایت بوسیدہ حالت میں ہیں اور اسی بنا پر انڈیا آفس کے فہرست نگار اوٹو لوتھ کو ان جلدوں کے مصنف کے بارے میں اشتباہ بھی ہوا ہے مگر اس کے باوجود ان میں ایسے واضح دلایل موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ تفسیر شیخ گیسودراز کی تصنیف ہے۔

اس تفسیر کی دوسری جلد کے اختتام پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے ''تفسیر ملتقط نصف آخر تصنیف سید محمد حسینی کیودار'' (۳)، ظاہر ہے کہ گیسودراز کو سہو کتابت کی بنا پر کیودار لکھ دیا گیا ہے مگر اوٹو لوتھ نے دوراز کار قیاس کی بنا پر اس لفظ کو ''کبوذان'' یا ''کبوذانی'' سمجھ کر اس مقام کو نیشاپور کے قریب کا ایک گاؤں بتایا ہے (۴)، اوٹو لوتھ کے بیان کے مطابق اس تفسیر کا مکمل نام ''ملتقط المعالم فی التفسیر'' تھا اور اس کے مصنف ''بندہ نواز'' کے لقب سے مشہور تھے (۵)۔

تفسیر ملتقط کی جلد اول کا ایک نسخہ ناصریہ کتب خانہ لکھنؤ میں بھی ہے، اس کے بھی ابتدائی

(۱) محمد علی سامانی، ص ۵۷ (۲) ایضاً ص ۱۲۳ (۳) اوٹو لوتھ، ص ۲۴ (۴) ایضاً، حاشیہ، ص ۲۴ (۵) ایضاً مخطوطہ نمبر ۱۱۱۔

اوراق غایب ہیں، تاہم اس نسخہ پر دو مہریں ہیں اور اس کا اختتام کاتب کی اس تحریر پر ہوتا ہے ''تمت المجلد الاول من تفسیر الملتقط تصنیف سید محمد گیسو دراز قدس اللہ سرہ العزیز''۔(۱)

تفسیر ملتقط کی نمایاں خصوصیات شیخ گیسودراز کی تفسیر ملتقط ہندوستان کی ابتدائی تفسیروں میں شمار کی جاتی ہے، اس کے علاوہ ان کی دوسری کتابوں میں بھی قرآن مجید کی مختلف آیتوں کی تفسیریں ملتی ہیں جن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو قرآن مجید اور تفسیر سے خاص شغف تھا، ذیل میں ان کے بعض نمایاں تفسیری خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱-صوفیانہ نقطۂ نظر سے قرآن مجید کی تفسیر: شیخ گیسودراز کے طریقۂ تفسیر کا یہ نمایاں وصف ہے اور ان کی تفسیر کی ایک اہم خصوصیت بھی یہی ہے کہ اس میں اہم صوفیا کے اقوال نقل کیے گئے ہیں (۲) مگر اسی کے ساتھ وہ تصوف کی حمایت میں شریعت کو نظر انداز کر دینے کے قایل بھی نہیں ہیں، وہ سورۃ الحجر کی آیت

والارض مددناها والقينا فيها رواسی (حجر:۱۹)	اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور رکھ دیے اس پر بوجھ۔

کی تفسیر بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''نفوس عابدین ارضِ عبادت، قلوب عارفین ارض معرفت اور ارواح مشتاقین ارض محبت ہیں، امید و بیم پہاڑ ہیں، کہا جاتا ہے کہ اولیا اوتاد ارض ہیں جن کے ذریعہ اللہ مخلوق سے بلاؤں کو دور کرتا ہے، وہ غیاث عالم ہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ علما پہاڑ ہیں جن سے شریعت کا قیام و بقا ہے، علما اصول دین کے اور فقر انظام شریعت کے قیام کا باعث ہیں''(۳)۔

تاہم تفسیر ملتقط میں تصوف کا رنگ غالب ہے اور واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نظریہ وحدۃ الوجود کے قایل اور موید تھے اور اسی نقطہ نظر سے یہ تفسیر لکھی گئی ہے۔

۲-لغت اور عربی قواعد سے واقفیت: شیخ گیسودراز کو عربی زبان پر مکمل عبور حاصل تھا

(۱) ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، ہندوستانی مفسرین، ص ۳۲ (۲) اوٹو لوتھ، ص ۲۴ (۳) ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، ہندوستانی مفسرین، ص ۳۴، بحوالہ مخطوطہ کتب خانہ ناصریہ، ورق ۶۱

جس کا اندازہ ان کی تمام تصانیف اور اجازت ناموں سے ہوتا ہے، قرآن مجید کی تفسیر میں بھی انہوں نے اس کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے، وہ سورۂ والصافات کی آیت

واللّٰہ خلقکم وما تعملون اور اللہ نے بنایا تم کو اور جو تم بناتے ہو۔

(صافات:۹۶)

کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو پیدا کیا اور جو عمل تم کرتے ہو اس کا بھی خالق وہی ہے، وما تعملون میں ما کو مصدریہ ماننے کی صورت میں یہ مفہوم ہوگا کہ تم کو اور تمہارے عمل کو پیدا کیا اور اس کو موصولہ بنانے کی شکل میں یہ ترجمہ ہوگا کہ تم کو تمہارے اعمال کے ساتھ پیدا فرمایا، اہل تحقیق اور موحدین کا یہی قول ہے''(۱)۔

اس کے بعد انہوں نے اس تفسیر کی روشنی میں معتزلہ کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ بندوں کے اعمال کا خالق خدا نہیں ہے(۲)، غرض شیخ گیسودراز کی تفسیر علم و تحقیق پر مبنی ایک صوفیانہ تفسیر ہے، اس میں صوفیا کے اقوال کے ساتھ قدیم مفسرین خازن، واسطی اور حریری کے اقوال بھی درج کیے گئے ہیں۔



(۱) شیخ گیسودراز، شرح آداب المریدین، ص ۲۶ (۲) ایضاً۔

شیخ علی بن احمد مہائمی

ہندوستانی مفسرین میں شیخ مخدوم علی بن احمد کا مقام بہت بلند ہے، وہ غیر معمولی ذہانت، حیرت انگیز علمی تبحر، خداداد بصیرت اور بے مثال روحانیت کے حامل تھے، ان کی تصنیفات مابعد الطبیعات، اسرار شریعت، فلسفہ وحکمت اور تصوف ومعرفت کا گنجہائے گراں مایہ ہیں اوران کی تفسیر چھ سو برس گزر جانے کے بعد بھی آج تک عرب وعجم میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

ولادت قدیم گجرات اور موجودہ مہاراشٹر کے علاقہ کوکن میں سرزمین ''مہائم'' میں ۱۰ رمحرم ۷۷۶ھ/ ۲/۷ ۱۳۷۲ء کو خاندان نوایت کے ایک معزز گھرانے میں ان کی ولادت باسعادت ہوئی (۱) اوراب یہ مقام عروس البلاد بمبئی کا ایک پر رونق اور آباد محلّہ ہے اور ماہم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

نام ونسب نام علاء الدین اور علی دونوں ہے، کنیت ابوالحسن اور لقب زین الدین ہے، خاندان نوایت کے قبیلہ پرو سے تعلق رکھنے کی بنا پران کے نام کا جز پرو ہوگیا، علم فقہ میں مجتہدانہ بصیرت کی وجہ سے فقیہ اور مرجع خلایق ہونے کی بنا پر مخدوم کے لقب سے پکارے گئے۔

والد ماجد کا نام شیخ احمد ہے، یہ جلیل القدر عالم اور ولی کامل تھے اور کوکن کے دولت مند تاجروں میں شمار کیے جاتے تھے اور والدہ ماجدہ کا نام فاطمہ تھا اور وہ بڑی عابدہ خاتون تھیں۔

شیخ مہائمی کے نسب کے بارے میں دو قول منقول ہیں:

۱- مخدوم علی بن احمد بن علی بن احمد المشہور بہ بنت حسین ناخدا انکولیا ''ضمیر الانسان''

(۱) غلام علی آزاد بلگرامی، سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، بمبئی ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۵ء، ص ۳۹ و نواب صدیق حسن خاں، ابجد العلوم، مطبعہ صدیقیہ، بھوپال، ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء، ص ۸۹۳ و مولانا رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، نول کشور پریس، ۱۸۹۴ء ص ۱۳۔

میں خطیب کلیانی کی کتاب سے یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

۲-علی بن حسن بن ابراہیم بن اسماعیل مصنف الہام الرحمٰن و متمم تبصیر الرحمٰن بن محمد بن احمد الملقب بہ کودر، ضمیر الانسان کے مصنف کے بہ قول شمایل الاتقیا کے آخر میں یہ قول درج ہے اور شمایل الاتقیا خود شیخ مہائمی کے دست مبارک کی لکھی ہوئی ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں دوسرا قول راجح سمجھا جاتا تھا مگر مولوی محمد یوسف کھٹکھٹے نے تفسیر تبصیر الرحمٰن کے کسی قلمی نسخہ پر درج ایک تقریظ کے حوالہ سے پہلے قول کو مرجح قرار دیا ہے(۱)۔

شیخ مہائمی ایک شریف و نجیب خانوادہ کے چشم و چراغ تھے، نایتی قوم عربی النسل ہے جو بعد میں ہندوستان آ کر آباد ہو گئی، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

"مولانا شیخ احمد المہائمی گروہ نوایت سے تعلق رکھتے ہیں، یہ لفظ ثوابت کے وزن پر ہے، ایک قوم ہے جو دکن کے شہروں میں رہتی ہے، میں نے ان کا حال فارسی کتابوں میں دیکھا ہے، طبری نے لکھا ہے کہ نایۃ ایک گروہ ہے قریش کا جو حجاج بن یوسف کے خوف سے مدینہ منورہ سے نکل کر بحیرۂ عرب کے کنارے آ پہنچا اور وہیں سکونت اختیار کر لی"(۲)۔

تعلیم و تربیت شیخ مہائمی کے والد بزرگوار شیخ احمد بڑے عالم و فاضل اور متقی بزرگ تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے ہونہار فرزند کی تعلیم و تربیت میں غیر معمولی توجہ سے کام لیا، تاریخ النوائط کے مصنف لکھتے ہیں:

"شیخ مہائمی کے والد ماجد مولانا شاہ احمد قدس سرہ نے اپنے ہونہار صاحبزادے کی طباعی، ذہانت اور شوق اکتساب علوم کو دیکھ کر ان کی اعلا تعلیم کی طرف توجہ کی، چوں کہ وہ خود بھی عربی کے بڑے عالم تھے، اس لیے باپ کی توجہ نے بیٹے کو عالم بنا دیا، چنانچہ وہ بہت تھوڑے عرصہ میں فقہ، منطق، فلسفہ اور حدیث وغیرہ علوم کی تحصیل سے فارغ ہو گئے"(۳)۔

عادات و خصائل زندگی کا حقیقی جوہر حسن سیرت ہے، پاکیزہ سیرت ہی نے بزرگوں کی یاد کو

(۱) محمد یوسف کھٹکھٹے، کشف المکتوم من حالات الفقیہ المخدوم، مطبعہ شہابی، بمبئی (۲) آزاد بلگرامی، ص ۳۹

(۳) نواب عزیز یار جنگ، تاریخ النوائط، حیدر آباد دکن، ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء، ص ۳۵۴

دوام اوران کے ذکر کو رفعت بخشی ہے، سید ابراہیم مدنی لکھتے ہیں:

''شیخ مہائمی بچپن ہی سے نہایت باادب، فرماں بردار اور والدین کے خدمت گزار تھے، اتفاق سے ایک رات ان کی والدہ عشاء کی نماز کے بعد بستر پر لیٹی تھیں، انہیں پیاس لگی تو انہوں نے شیخ مہائمی سے پانی مانگا، وہ پانی لے کر گئے تو دیکھا کہ والدہ کی آنکھ لگ گئی ہے، نیند سے اٹھانا سوءِ ادب سمجھ کر تمام رات پانی کا کٹورا لیے کھڑے رہے، صبح صادق کے وقت جب ان کی والدہ کی آنکھ کھلی تو پوچھا کہ کب سے پانی لیے کھڑے ہو، انہوں عرض کیا کہ آپ نے رات کو جس وقت پانی طلب کیا تھا اسی وقت سے آپ کے بیدار ہونے کے انتظار میں کھڑا ہوں، والدہ کو اپنے بیٹے کی یہ سعادت مندانہ ادا بہت پسند آئی، فوراً بستر سے اٹھیں، وضو کیا اور بارگاہِ رب العزت میں اپنے بیٹے کے لیے دعا کی، چنانچہ ماں کی دعاؤں کا یہ اثر تھا کہ وہ علوم ظاہری و باطنی میں درجۂ کمال کو پہنچے اور بہت جلد مرتبہ ولایت پر فائز ہو گئے'' (۱)۔

شیخ مہائمی کے حسن اخلاق کا ذکر متعدد تذکرہ نگاروں نے کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ وہ بے حد فیاض اور کشادہ دست تھے، حاجت مندوں کی دل کھول کر مدد کرتے، ایک دولت مند تاجر کے فرزند ہونے کے باوجود کبھی دولت کو اہمیت نہیں دی، ان کے دولت کدے پر ہمیشہ مہمانوں کا ہجوم رہتا اور دستر خوان پر انواع واقسام کے کھانے چنے جاتے اور شیخ مہائمی ان کی ضیافت کر کے بہت خوش ہوتے تھے، غرض ان کے اخلاق حمیدہ کے معترف ہندو اور مسلمان دونوں طبقوں کے لوگ تھے۔

عبادت وریاضت توجہ الی اللہ اور عبادت و ریاضت سے بندہ کو قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے اور اسی کی بہ دولت انسان کو روحانیت کا اعلا مقام حاصل ہوتا ہے، صاحب برکات الاولیا لکھتے ہیں:

''شیخ مہائمی بڑے زاہد و عابد، جامع علوم شریعت و طریقت اور صاحب تصرفات ظاہری و باطنی تھے'' (۲)۔

(۱) سید ابراہیم مدنی، ضمیر الانسان، شہابی پریس، بمبئی، ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۴ء (۲) امام الدین گلشن آبادی، برکات الاولیا، بمبئی، بدون تاریخ، ص ۳۶۔

مولانا محمد باقر آگاہ اپنی تصنیف ''نفحۃ العنبریۃ''میں لکھتے ہیں:

''وہ علوم عقلیہ ونقلیہ میں انتہا کو پہنچے ہوئے اور توحید وجودی وعلوم طریقت کے اعلا یادگار تھے، استغراق ومشاہدہ ذات میں کامل اور ظاہری تصنع سے کنارہ کش تھے، ان سے بیّن کرامات پسندیدہ خصلتیں اور نیک صفتیں ظاہر ہوئیں''(۱)۔

مشہور صوفی شیخ عبدالوہاب متقی شاذلی نے ان کا ایک عجیب وغریب واقعہ نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''صاحب تفسیر رحمانی شیخ علی مہائمی پر مراقبہ واستغراق کی کیفیت غالب تھی، بادشاہ وقت کی بہن ان کے نکاح میں تھیں، ایک روز بادشاہ کی بیگمات شاہ کی بہن سے ملنے کی غرض سے ان کے مکان پر آئیں، شیخ مہائمی اس وقت دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھے ہوئے تھے، بیگمات کو اندر آنے میں تردد ہوا، شیخ کی والدہ موجود تھیں، انہوں نے کہا کیوں توقف کررہی ہو، اندر چلی آؤ، انہوں نے کہا کہ ہم کیسے آئیں، شیخ چوکھٹ پر تشریف فرما ہیں، ہمیں دیکھ لیں گے، شیخ کی والدہ نے کہا کہ وہ تو بے خبری کے عالم میں ہیں، اسے نہ تو تمہارا ہوش ہے اور نہ دنیا ومافیہا کی خبر، چنانچہ بیگمات مکان کے اندر داخل ہوگئیں اور شیخ کی والدہ سے اس کا ثبوت مانگا، چنانچہ شیخ کی والدہ ان کے پاس آئیں اور کہا، بیٹا علی، اس تہبند سے پردہ پوشی کرلو اور اپنے کپڑے دھونے کے لیے دے دو، شیخ اس وقت صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے، انہوں نے فوراً اپنے کپڑے اتار کر تہبند پہن لیا اور بیٹھ گئے، ایک گھنٹہ بعد ان کی والدہ دوسرے میلے کچیلے کپڑے لے کر آئیں اور ان سے کہا کہ اپنے کپڑے پہن لو، چنانچہ انہوں نے وہ میلے کپڑے پہن لیے، استغراق کی اس کیفیت میں انہیں بالکل خبر نہ تھی کہ کون سا کپڑا پہننا ہے اور کس کو اتارنا ہے''(۲)۔

(۱) بحوالہ نواب عزیز یار جنگ، ص ۳۶۰ (۲) شیخ عبدالوہاب متقی، جبل المتین فی تقویت الیقین (قلمی کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ، احمد آباد)، یہ نسخہ ۱۱۸۹ھ/۱۷۶۵ء کا مکتوبہ ہے اور اس پر بدر عالم کے دستخط ہیں اور مذکورہ بالا عبارت تفسیر کے مخطوط میں بھی ''ترجمۃ المصنف'' کے عنوان سے آخر کتاب میں درج ہے اور اس مخطوطہ پر شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی کا حاشیہ بھی ہے

شیخ عبدالوہاب متقی کے اس بیان سے جہاں شیخ مہائمی کے استغراق ومحویت اور یادِ الٰہی میں انہماک کا بیّن ثبوت فراہم ہوتا ہے، وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے تجرد کا راستہ اختیار نہیں کیا تھا بلکہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے اور بادشاہ وقت کے ساتھ ان کی قرابت داری کا تعلق تھا، اس عہد میں گجرات کا والی سلطان احمد تھا جس نے اپنے نام پر گجرات کے مشہور شہر ''احمد آباد'' کا سنگ بنیاد رکھا اور ۸۱۴ھ/ ۱۴۱۱ء تا ۸۴۳ھ/ ۱۴۳۹ء بڑی شاندار حکومت کی، اس وقت مہاراشٹر کے علاقے تھانہ اور ماہم حکومت گجرات ہی کے ماتحت تھے، مولانا ابوظفر ندوی لکھتے ہیں:

''احمد شاہ اول نے اپنے عہد میں احمد نگر، بالاسور، سلطان پور، دوحد، سنکھیڑا، مہائم وغیرہ میں قلعوں کے علاوہ محلات بھی تعمیر کرائے، جن میں سے بعض آج بھی موجود ہیں''(۱)۔

منصب قضا شاہان گجرات بڑے علم دوست اور دین دار تھے، انہوں نے اپنی قلم رو میں اسلامی نظام وقانون کو رواج دیا جس کے سبب مقدمات کے فیصلے شریعت اسلامی کے مطابق ہوا کرتے تھے اور قاضی کا منصب بڑا معزز خیال کیا جاتا تھا اور اس منصب پر جلیل القدر علما کا تقرر عمل میں آتا تھا، بمبئی گزیٹر میں درج ہے:

''صوفی مخدوم علی فقیہ نے جوانی کے کئی سال سفر اور مطالعہ میں گزارے، پھر وہ ماہم کے مسلمانوں کے قاضی مقرر ہوئے''(۲)۔

تفسیر رحمانی کا ایک قلمی نسخہ درگاہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں موجود ہے، اس کے مقدمہ میں مطبوعہ نسخہ سے تقریباً ڈھائی صفحات زیادہ ہیں، نواب جمال الدین مدار المہام بھوپال نے جب اس تفسیر کو مصر سے طبع کرایا تو ان صفحات کو غیر ضروری سمجھ کر خارج کر دیا، ان میں شیخ مہائمی نے شان دار اور پرشکوہ انداز میں والی گجرات سلطان احمد شاہ کا تذکرہ کیا ہے، اس کی حکومت اور اس کے گراں قدر کارناموں کو سراہا ہے، امن وامان، عدل وانصاف، رعایا پروری اور قانون شریعت کے نفاذ وترویج پر اس کی بے حد مدح سرائی کی ہے اور اپنی تفسیر کا انتساب بھی اسی کے

(۱) ابوظفر ندوی، گجرات کی تمدنی تاریخ، معارف پریس، اعظم گڈھ، ۱۹۶۲ء، ص ۱۴۵ (۲) بمبئی گزیٹر، ج ۳، ص ۱۰۳

نام پر کیا ہے۔

درس وتدریس گجرات کے مختلف علاقوں میں اسلامی علوم وفنون کے مدارس ومراکز قایم تھے جن میں اساتذہ خالصتاً لوجہ اللہ درس دیتے اور طلبہ ان سے مستفید ہوتے تھے، شیخ مہائمی کی جلالت شان اور علمی تبحر کی بنا پر طالبان علوم کی معتد بہ تعداد ان کے گرد اکٹھا ہوگئی تھی، صاحب برکات الاولیا کا بیان ہے کہ:

> ''مہائم میں مدرسہ تھا جس میں شیخ مہائمی طلبا کو درس علوم ظاہری و باطنی دیا کرتے تھے اور اکثر اوقات تصنیف وتالیف میں گزارتے (۱)، چنانچہ ان کے ایک شاگرد محمد سعید رتا گیری کا ذکر تذکرہ کی کتابوں میں ملتا ہے''(۲)۔

صوفیانہ مسلک ہندوستان میں تصوف کے متعدد سلسلے قایم ہیں اور ان میں بے شمار مشایخ پیدا ہوئے، جنھوں نے محبت، انسانیت، رواداری اور حسن اخلاق سے لوگوں کے قلوب کی کایا پلٹ دی مگر ہندوستان میں رائج کسی سلسلے میں شیخ مہائمی کا نام نہیں ملتا ہے، حالاں کہ ان کی پوری زندگی سرتاپا تصوف کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی، اس لیے بعض تذکرہ نگاروں نے ان کو ''اویسی'' لکھا ہے۔

شیخ مہائمی کی تصنیفات کے مطالعہ سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شیخ محی الدین ابن عربی کے پیرو اور ان کے نظریۂ وحدۃ الوجود کے علم بردار تھے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار'' میں لکھا ہے:

> ''وے از علماے صوفیہ موحدہ است، عالم بود بہ علوم ظاہر و باطن، صاحب التصنیفات الرائقۃ والتالیفات اللائقۃ''(۳)۔

محمد حسن غوثی منڈوی ''گلزار ابرار'' میں لکھتے ہیں:

> ''دونوں جہاں کے حقایق اور اسرار کے عارف تھے، شیخ محی الدین ابن عربی اور شیخ صدر الدین قونوی کے پیرو تھے اور ان دونوں بزرگوں کی تصنیفات

(۱) امام الدین گلشن آبادی، حوالہ سابق، ص ۳۶ (۲) ایضاً، تاریخ الاولیا، فتح الکریم پریس، بمبئی، ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء، ص ۳۳-۷۳ (۳) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۷۳۔

پر عمدہ شرحیں لکھیں اور مفید حاشیے لگائے''(۱)۔

غلام علی آزاد بلگرامی رقم طراز ہیں:

"شیخ علی مہائمی باریک بین ہیں، ان کا شمار علما اور اصحاب ذوق و عرفان میں ہوتا ہے، وہ توحید وجودی کا اثبات کرنے والے اور شیخ ابن عربی کے نقش قدم پر چلنے والے تھے''(۲)۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی علما میں شیخ مہائمی کو شیخ اکبر کی ذات سے جو بے پناہ عقیدت تھی اور ان کے فلسفہ سے جو گہری مناسبت اور وابستگی تھی اس کی مثال نہیں ملتی، انہوں نے شیخ اکبر کے فلسفہ کی تعبیر وتشریح اور ترجمانی کو اپنا مقصد زندگی قرار دے لیا تھا، چنانچہ ان کی کوئی تصنیف ایسی نہیں ہے جس میں فلسفہ وحدۃ الوجود کی جھلک نہ پائی جاتی ہو، یہی نہیں اس نظریہ کے حامل دوسرے اکابر کی تصنیفات کی بھی انہوں نے شرحیں لکھیں اور شیخ اکبر کی حمایت میں مخالفین کے تمام اعتراضات کے جوابات لکھے، اسی بنا پر مولانا سید عبدالحئی حسینی نے شیخ مہائمی کو ''ابن عربی ثانی'' کے لقب سے یاد کیا ہے(۳)۔

روحانی مرتبہ شیخ مہائمی کا روحانی مرتبہ ومقام بہت بلند تھا، اس کا اندازہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی مندرجہ ذیل تحریر سے بہ خوبی ہوتا ہے جس میں انہوں نے شیخ مہائمی کو اکابر اولیا کے زمرہ میں شمار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ہمارے نزدیک نور نبوت کے چار طریقے ہیں، پہلا وہ جو طبقہ جو حکمائے امت کہلاتا ہے، اس طبقہ کے لوگ اعیان ثابتہ کے آئینہ دار بن چکے ہیں، چنانچہ ان کا علم اور ان کی عبادت سب خیر محض ہیں، دوسرے وہ طبقہ جس کے نفسِ ناطقہ پر رسول اللہ کا رنگ غالب آچکا ہو...... چنانچہ جو بھی تام المعرفت ہوگا اس پر رسول اللہؐ کے انوار نمایاں ہوں گے، شیخ اکبر (محی الدین ابن عربی) اپنی وسعت معلومات کی بنا پر اسی طبقہ میں داخل ہیں، تیسرا طبقہ وہ ہے جس کو سنن وطاعات

(۱) محمد حسن غوثی، گلزار ابرار، ص ۳۹ (۲) آزاد، ص ۳۹ (۳) عبدالحئی حسینی، یاد ایام، مطبع انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ کالج، ص ۵۹۔

شرعیہ کی پابندی نے اس رنگ میں رنگ دیا ہو...... چنانچہ اصحاب طریقت میں حضرت غوث الاعظم، شیخ سہروردی، نجم الدین کبری، شیخ بہاء الحق والدین شیخ ہروی، مخدوم علی مہائمی اور مولانا جامی اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں......'' (۱)۔

وفات شیخ مہائمی نے ۵۹ برس کی عمر پائی، ۹؍ جمادی الاخری ۸۳۵ھ؍ فروری ۱۴۳۱ء کو جمعہ کی شب میں وفات پائی اور جمعہ کے روز مہائم میں اپنی والدہ کے پہلو میں سپرد خاک کیے گئے، جنات الفردوس سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

تصنیفات شیخ مہائمی کی زندگی کا بڑا حصہ تصنیف و تالیف میں بسر ہوا، انہوں نے کتاب و سنت کی روشنی میں تصوف کے حقایق سے بحث کی، چنانچہ مولانا سید عبدالحیٔ حسینی لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک ہندوستان کے ہزار سالہ دور میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سوا حقایق نگاری میں ان کا کوئی نظیر نہیں'' (۲)۔

چنانچہ ان کی کتابوں میں فلسفہ و تصوف کا بہترین امتزاج پایا جاتا ہے اور انہوں نے تصوف کے دقیق مباحث مثلاً وحدۃ الوجود، جبر و اختیار، ہستی مطلق، فنا و بقا، تنزلات ستہ، حقیقت محمدیہ وغیرہ پر محققانہ بحث و گفتگو کی ہے، چوں کہ ان کے دور میں اہل علم اور صوفیہ کے حلقہ میں ان مسایل کو خاص اہمیت حاصل تھی اس لیے یہ بحثیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی گئیں مگر بعد کے ادوار میں ان کا ذوق بہ تدریج کم ہوتا گیا، جس کے نتیجہ میں ان کی بیشتر کتابیں تلف ہوگئیں، اس المیہ کا ذکر شیخ ابوالفضل نے بھی ''آئینِ اکبری'' میں کیا ہے (۳)۔

شیخ مہائمی کی جو کتابیں دستبرد زمانہ سے محفوظ رہیں ان میں بعض تو طبع ہوگئی ہیں اور بعض مخطوطات کی صورت میں ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں اور بعض کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے، ذیل میں ان کی بعض کتابوں کے نام درج کیے جاتے ہیں۔

۱- تبصیر الرحمان و تیسیر المنان بعض ما یشیر الی اعجاز القرآن: شیخ مہائمی کی یہ مشہور تفسیری تصنیف ہے جو ''تفسیر رحمانی'' یا ''تفسیر مہائمی'' کے نام سے مشہور ہے، نواب جمال الدین

(۱) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، الخیر الکثیر، مطبعہ سعیدی، کراچی، ص ۱۸۴ تا ۱۸۶ (۲) عبدالحیٔ، یاد ایام، ص ۵۹
(۳) ابوالفضل، آئین اکبری، ج ۳، نول کشور پریس، ۱۳۱۰ھ؍ ۱۸۹۲ء، ص ۱۷۴

وزیر ریاست بھوپال کے زیر اہتمام ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء میں مطبعہ بولاق، مصر سے دو ضخیم جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔

۲- اجلة التائید فی شرح ادلته التوحید: (مطبوعہ)۔

۳- الضوء الاظهر فی شرح النور الازهر: (مطبوعہ)۔

۴- ارادة الدقائق شرح مرآة الحقائق: (مطبوعہ)۔

۵- فتنه مخدومی مع ترجمہ اردو: (مطبوعہ)۔

۶- خصوص النعم فی شرح فصوص الحکم: شیخ ابن عربی کی مشہور تصنیف کی شرح ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں موجود ہے(۱)۔

۷- زوارف اللطائف فی شرح عوارف المعارف: شہاب الدین سہروردی کی کتاب کی شرح ہے، اس کے قلمی نسخے بمبئی، حیدرآباد، رام پور اور پٹنہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

۸- امحاض النصیحة: اس کا صرف ایک قلمی نسخہ خدابخش لائبریری میں ہے(۲)۔

۹- الرتبة الرفیعة فی الجمع والتوفیق بین اسرار الحقیقة وانوار الشریعة: اس کا مخطوطہ کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ، احمد آباد میں موجود ہے اور اس مخطوطہ کی کتابت شیخ مہائمی کی حیات میں ہی ہو چکی تھی۔

۱۰- انعام الملک العلام باحکم الاحکام: اسرار شریعت کے موضوع پر ہے، اس کتاب کا ذکر مولانا عبدالحئی نے کیا ہے۔

۱۱- شرح الخصوص: اس کے حوالے محض کتابوں میں ملتے ہیں، صدرالدین قونوی کی فصوص کی شرح ہے اور نایاب ہے۔

۱۲- استجلاء البصر فی الرد علی استقصاء النظر: (نایاب)۔

۱۳- رسالہ ادلة التوحید: اصل رسالہ نایاب ہے، صرف اس کی شرح مطبوعہ موجود ہے۔

۱۴- رسالہ عجیبیہ: اس کتاب کا ابتدائی حصہ آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان میں درج کیا ہے۔

(۱) محمد ظفیر الدین، ص ۴۴ (۲) سید احسن شیر، نوادر خدابخش لائبریری، آزاد پریس پٹنہ، ص ۲۱۵۔

۱۵- الوجود فی شرح اسماء المعبود: اس کتاب کا کوئی نسخہ دست یاب نہیں ہے، امام الدین گلشن آبادی کی کتاب ''تاریخ الاولیا'' میں صرف اس کا ذکر ہے۔

۱۶- فتاوی مخدومیہ: یہ بھی ضائع ہو چکا ہے، صرف ''تاریخ الاولیا'' میں اس کا تذکرہ ہے۔

۱۷- ترجمہ مرآۃ الحقائق: محمد عزالدین المغربی کی فارسی کتاب ''جام جہاں نما'' کا عربی ترجمہ ہے، نایاب ہے۔

۱۸- ترجمہ و شرح لمعات عراقی: شیخ فخر الدین عراقی کی فارسی تصنیف کا عربی ترجمہ ہے، یہ بھی نایاب ہے۔

۱۹- النور الازہر فی سر القضا والقدر: اصل کتاب تو نایاب ہے، البتہ اس کی شرح ''الضوء الاظہر'' طبع ہو چکی ہے۔

تفسیر مہائمی اور اس کی خصوصیات

شیخ مہائمی کا مہتم بالشان علمی کارنامہ ان کی تفسیر ''تبصیر الرحمن وتیسیر المنان'' ہے جو تفسیر رحمانی یا تفسیر مہائمی کے نام سے مشہور ہے، اس تفسیر کا اصل موضوع نظم قرآن ہے جس میں ایک آیت کے دوسری آیت کے ساتھ تعلق اور ایک سورہ کا دوسری سورہ سے ربط و مناسبت واضح کیا جاتا ہے، شیخ مہائمی نے اس عمدگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس فریضہ کو انجام دیا ہے کہ کسی مقام پر سلسلہ کلام منقطع نہیں ہوتا ہے اور بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ سلسلہ مضمون میں آیت بریکٹ کے اندر آجاتی ہے، پھر اس کے ساتھ ہی وہ حقایق و معارف بھی اختصار کے ساتھ بیان کرتے جاتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ قرآنی حکمتوں کا بڑا حصہ اس کے نظم و ترتیب میں پوشیدہ ہے، آیات قرآنی کے باہمی تعلق کو اس طرح سمجھنا کہ وہ مسلسل اور مربوط کلام کے قالب میں ڈھل جائیں، ایک عظیم الشان علم ہے۔

شیخ مہائمی نے اس تفسیر میں نظم و ترتیب کے جو نکات بیان کیے ہیں ان کو انہوں نے محض فضل الٰہی کی بخشش قرار دیا ہے اور اسی احساس کے تحت انہوں نے تفسیر کا نام ''تبصیر الرحمن وتیسیر المنان'' رکھا ہے، وہ تفسیر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''یہ نکات نظم قرآنی کا بہترین مجموعہ ہے جن میں سے اکثر مجھ سے پہلے کسی جن وانس کی دسترس میں نہیں آئے تھے، میں غریق بحر پلید اس لایق

کہاں تھا کہ ان تک رسائی حاصل کرسکتا جنہیں صرف پاک ومطہر بندے ہی چھوسکتے ہیں مگر اللہ رب العزت نے محض اپنے فضل وکرم سے میرے لیے اس مشکل کو آسان بنا دیا''(۱)۔

چنانچہ شیخ مہائمی کے اس علمی اور قابل قدر شاہ کار کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے انہوں نے ان کے فہم قرآنی اور تحقیق نظم کی ستایش کی ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

''تفسیر رحمانی کی بہ صفت ایجاز وتدقیق موصوف است وتفسیر را بہ قرآن امتزاج داوہ است''(۲)۔

شیخ محمد حسن غوثی شطاری لکھتے ہیں:

''تفسیر رحمانی میں ترجمہ وتشریح کو قرآنی ترتیب کے ساتھ ملا دیا گیا ہے اور تکرار سے اجتناب کیا گیا ہے، یہ عمدہ طریقہ شیخ مہائمی کی اختراع ہے''(۳)۔

مولانا باقر آگاہ ''نفحۃ العنبریہ'' میں رقم طراز ہیں:

''یہ تفسیر عمدہ اور لایق ستایش ہے، اس کی نظیر اعلا یا ادنی نظر سے نہیں گزری''(۴)۔

مولانا سید عبدالحئی لکھتے ہیں:

''تفسیریں تو سینکڑوں لکھی جاچکی ہیں مگر جس بات سے ان کی تفسیر کو امتیاز وخصوصیت حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں التزام کے ساتھ تمام قرآن پاک کی آیت کریمہ کے باہم دگر مربوط ہونے کو ایسے دل نشیں طریقے سے بیان کیا ہے جس کو پڑھ کر انسان وجد میں آجاتا ہے اور بے ساختہ منہ سے داد نکلتی ہے''(۵)۔

تفسیری موقف شیخ مہائمی نے اپنے تفسیری موقف کی وضاحت مقدمہ میں کر دی ہے، وہ تفسیر قرآن کے ضمن میں مفسرین کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو شرعی حدود وقیود میں رہ کر

(۱) شیخ علی مہائمی، تفسیر تبصیر الرحمٰن وتیسیر المنان، مقدمہ (۲) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۷۳ (۳) محمد حسن غوثی، تذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار، ص ۱۴۱ (۴) بحوالہ عزیز جنگ۔ ص ۳۵۵ (۵) عبدالحئی، یاد ایام، ص ۵۹۔

تفسیر وتاویل میں عقل وخرد کے استعمال پر زور دیتا ہے، وہ نبی کریمؐ کے قول:

من قال فی القرآن برأیہ	جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی تو
فلیتبوأ مقعدہ من النار	اس کو اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیے۔

کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اقوال صحابہ اور آثار تابعین سے ہٹ کر فہم و عقل سے قرآن کی تفسیر کرنے والا جہنمی ہے بلکہ یہ حدیث تو مفسرین کے لیے احتیاط برتنے میں مہمیز کا کام کرتی ہے، جہاں تک عقل وخرد اور رائے کے استعمال کا تعلق ہے، قرآن کریم میں جا بجا تدبر وتفکر کی دعوت دی گئی ہے، قرآن اور مذہب اسلام کی عالم گیریت اور ابدیت اسی صورت میں ہے کہ مفسرین اپنے اپنے دور میں پیش آمدہ مسایل کو قرآن وسنت کی روشنی میں غور وفکر سے حل کریں، احادیث وآثار کا جو حصہ تفسیر کے سلسلہ میں نقل کیا گیا ہے وہ پورے قرآن کا احاطہ نہیں کرتا ہے بلکہ وہ صرف بعض حصوں سے متعلق ہے، اس لیے ہمارے لیے گنجایش ہے کہ بقیہ حصہ کے بارے میں غور وتعمق سے کام لے کر استخراج معانی کریں اور سیاق وسباق سے آیات کے مفہوم کو متعین کریں، قرآن مجید میں جملہ دینی علوم موجود ہیں، بعض صراحت کے ساتھ اور بعض اجمالی طور پر اور بہت سے ایسے امور ہیں جو تفسیر بالماثور سے بالکل ماورا ہیں، اس لیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

من اراد علم الاولین	جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اولین وآخرین کا
والآخرین فلیتدبر القرآن	علم حاصل کرے، اسے قرآن میں تدبر کرنا چاہیے۔

اور ظاہر ہے کہ تدبر قرآن صرف ظاہری الفاظ پر انحصار کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتا، اس کے لیے اشارات ومقاصد کا سمجھنا بھی ضروری ہے(۱)۔

شیخ مہائمی کے نزدیک ایک مفسر کے لیے حقایق کی بصیرت لازمی ہے کیوں کہ غور وفکر اور تدبر کے بعد اس پر قرآنی مطالب واضح ہوتے ہیں، حضرت ابو الدرداءؓ کا قول ہے:

(۱) شیخ علی مہائمی، مقدمہ تفسیر۔

لا یفقه الرجل حتی یجعل للقرآن وجوها	کوئی شخص فقیہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کو قرآن مجید کے اعراب کی مختلف شکلوں کا علم نہ حاصل ہو۔

اور آنحضرت ؐ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے لیے یہ دعا فرمائی:

اللهم فقهه فی الدین و علمه التاویل	اے خدا ابن عباس کو دین کی سمجھ اور تاویل کا علم عطا کر۔

ظاہر ہے تاویل سے مراد قرآن مجید کی تفسیر اور اس کی غایت کو سمجھنا ہے، تفسیر بالرائے کی جو ممانعت وارد ہوئی ہے اس سے مراد ایسی تفسیر ہے جو ہوا و ہوس پر مبنی ہو اور جس میں کھینچ تان کر معانی پہنائے گئے ہوں، اور شیخ مہائمی کے نزدیک ایسی تفسیر مذموم ہے، ان کے نزدیک تفسیر کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ اپنی رائے کو ہدایت ربانی کے تابع کر دیا جائے، قرآن کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ سے جو کچھ مروی ہے اس پر اعتماد از بس ضروری ہے، لیکن منقولات و مدلولات لغویہ کے پہلو بہ پہلو عقل و فہم کو بھی کام میں لانا چاہیے، تاکہ قرآن کے دوررس، گہرے اور وسیع معانی کا استخراج کیا جا سکے، شاید یہی حقیقت ہے جس کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زبان مبارک سے روایت میں بیان کیا گیا ہے:

ان للقرآن ظاهرا و باطنا وحدا و مطلعا	قرآن کے ظاہری معنی بھی ہیں اور باطنی نکتے بھی، حلال و حرام کے مسائل بھی ہیں اور وعدہ و وعید بھی۔

اور قرآن کے باطنی معانی تک نکتہ شناس ہی اپنی بصیرت کی روشنی میں پہنچ سکتے ہیں، بشرطیکہ یہ بصیرت نور الٰہی سے مستنیر ہو(۱)۔

چنانچہ اسی اصول کی روشنی میں شیخ مہائمی نے اپنی تفسیر کا آغاز مندرجہ ذیل جملوں سے کیا ہے:

"اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے تمام تعریفیں ہیں جس نے اہل خرد کے

(۱) شیخ علی مہائمی، مقدمہ تفسیر۔

دلوں کو اپنے کلام سے منور کیا تاکہ وہ اس کی روشنی میں اپنی عقل سے کام لے کر صحیح راستہ پا سکیں"۔

شیخ مہائمی عقل کو بصر اور شریعت کو نور سے تعبیر کرتے ہیں (۱) اور ایک مقام پر عقل کی اصلیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عقل اگر بعض معاملات کی طرف رہنمائی کرتی ہے تو بعض مواقع پر حقایق تک پہنچنے میں حجاب اور رکاوٹ بھی بن جاتی ہے" (۲)۔

احادیث وآثار سے استشہاد عقل ورائے کے ساتھ شیخ مہائمی احادیث رسول ﷺ اور آثار صحابہ وتابعین سے بھی استشہاد کرتے ہیں، چنانچہ وہ سورۂ بقرہ کی آیت

حافظوا علی الصلوات والصلوة الوسطی (بقرہ:۲۳۸)	خبردار رہو سب نمازوں سے اور بیچ والی نماز سے۔

کی تفسیر میں احادیث کے حوالے دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے مراد نماز عصر یا فجر ہے (۳) اسی طرح سورۂ آل عمران کی آیت

افئن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم (آل عمران:۱۴۴)	پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا تو تم پھر جاؤ گے الٹے پاؤں۔

کی تشریح بھی احادیث سے کرتے ہیں (۴)۔

بعض مقامات پر وہ آیتوں کا شانِ نزول بھی بیان کرتے ہیں، مثلاً سورہ احزاب کی آیت:

وماکان لمومن ولا مومنة اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرة (احزاب:۳۶)	اور کام نہیں کسی ایمان دار مرد کا اور نہ ایمان دار عورت کا جب کہ مقرر کردے اللہ اور اس کا رسول کوئی کام کہ ان کو رہے اختیار اپنے کام کا۔

کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ زینب بنت جحش کے بارے میں نازل ہوئی ہے (۵)۔

اور سورۃ اللیل کی آخری آیت

(۱) شیخ علی مہائمی، تفسیر، ج ۱، ص ۲۵ (۲) ایضاً، ج ۲، ص ۴۰۲ (۳) ایضاً، ج ۱، ص ۸۶ (۴) ایضاً، ج ۱، ص ۱۲۷ (۵) ایضاً ج ۲، ص ۱۵۹۔

ولسوف یرضی (اللیل:۲۱) اور آگے وہ راضی ہوگا۔

کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں نازل ہوئی (۱)۔

حقوق کی ادائیگی کی تاکید

شیخ مہائمی اپنی تفسیر میں جگہ جگہ حقوق اللہ و حقوق العباد کی اہمیت کو مختلف انداز میں واضح کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے ہم پر جو ان گنت احسانات فرمائے ہیں وہ اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہم اس کی عبادت کریں، کیوں کہ انسان کی تخلیق عبادتِ الٰہی اور معرفت ہی کے لیے کی گئی ہے، اسی طرح باہمی معاملات میں انصاف کرنا اللہ کا حکم ہے جس کے بجالانے پر اجروثواب مترتب ہوگا" (۲)۔

وہ اس کی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ عبادت کے لائق صرف اللہ کی ذات ہے، چنانچہ وہ بڑے موثر اور دل نشیں انداز میں قاری کو یہ بتاتے ہیں کہ شرک جلی و خفی اور ان دونوں تک لے جانے والی تمام چیزوں سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے، کیوں کہ اللہ کا حق اسی صورت میں ادا ہوسکتا ہے جب کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا جائے، اسی کے ساتھ بندوں کے حقوق بھی ادا کیے جائیں اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا جائے، مخلوق میں والدین اور اقارب کے حقوق سرفہرست ہیں، شیخ مہائمی ان حقوق کی ادائیگی کی اہمیت بیان کرتے ہوئے حضور اکرم کا یہ ارشاد گرامی بھی نقل کرتے ہیں:

من لم یشکر الناس، لم یشکر اللہ. جو اپنے اقارب کا حق بہ طور اعتراف خدمت ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرسکتا۔

شیخ مہائمی اقارب سے حسن سلوک کا فایدہ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حسن سلوک صلہ رحمی ہے جو اللہ سے وصال کا ذریعہ ہے اور قطع رحمی اللہ سے انقطاع کا سبب بن سکتا ہے (۳)۔

اخلاق حسنہ کی تلقین

شیخ مہائمی ایک متدین اور متقی صوفی تھے، وہ اپنی تفسیر میں تقوی اور اخلاق حسنہ کے حصول پر خاص زور دیتے ہیں اور شہوات نفسانی سے اجتناب کی تلقین کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ آئینۂ دل ملکوتی صفات حاصل کرکے ہی صاف و شفاف رہ سکتا ہے اور یہ ملکوتی

(۱) شیخ مہائمی تفسیر، ج۲، ص ۴۰۵ (۲) ایضاً، ج ۱، ص ۲۴-۲۵ (۳) ایضاً ص ۱۴۹

صفات مجاہدہ وریاضت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتیں، عبادت وریاضت سے دل کی تمام بیماریاں دور ہوتی ہیں اور اسی کی بہ دولت قلب مشاہدۂ حق سے منور، زبان ذکر الٰہی سے مشرف اور اعضا خدمت انسانی سے مزین ہوتے ہیں (۱)۔

وہ تکبر اور غرور کو سارے رذائل کی اساس قرار دیتے ہیں کیوں کہ اسی بنا پر ابلیس مردود ہوا اور تمام فضایل کی اصل اسلام وانقیاد ہے (۲)۔

شیخ مہائمی حرص وطمع اور مال وزراندوزی کے عواقب بد سے بھی آگاہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قناعت عظیم دولت ہے، وہ سورہ نحل کی آیت:

من عمل صالحا من ذکر و انثی	جس نے کیا نیک کام مرد ہو یا عورت ہو اور وہ
وھو مومن فلنحیینہ حیوۃ	ایمان پر ہے تو اس کو ہم زندگی دیں گے، ایک
طیبۃ (نحل:۹۷)	اچھی زندگی۔

کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"عمل نیک کا حامل شخص دنیا اور آخرت دونوں جہاں میں مال دار دنیادار کے مقابلہ میں زیادہ اطمینان وسکون کی زندگی بسر کرتا ہے" (۳)۔

حکما و متکلمین کے اقوال سے استناد

شیخ مہائمی کو فلسفہ سے خاص تعلق تھا، چنانچہ وہ تفسیر میں بعض مقامات پر اپنے نقطہ نظر کی توثیق کے لیے حکما و متکلمین کے اقوال بھی پیش کرتے ہیں، جس کی بنا پر شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے اس تفسیر پر کبیدگی کا اظہار کیا ہے (۴)، مگر ایسا محض بعض مواقع پر ہوا ہے اور انہوں نے حکما کے وہی اقوال نقل کیے ہیں جن کی تائید نصوص سے بھی ہوتی ہے۔

فقہی مسلک

شیخ مہائمی کو فقہ میں دست رس حاصل تھی، چنانچہ فقیہ ان کے نام کا جز تھا، البتہ وہ قاری کو فقہی تفصیلات میں الجھاتے نہیں ہیں، ان کے طریقہ تفسیر سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس مسلک کی جو بات ان کو قرآن وسنت سے زیادہ قریب نظر آتی تھی، اس کو وہ اختیار کر لیتے تھے،

(۱) شیخ مہائمی، تفسیر، ج ۱، ص ۳۵ (۲) ایضاً، ج ۲، ص ۱۰۳ (۳) ایضاً، ص ۴۱۸ (۴) شیخ احمد سرہندی، مکتوبات۔

تاہم تفسیر کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ فقہ شافعی کی طرف ان کا میلان زیادہ تھا، مگر یہ رجحان تقلید کی حد تک نہ تھا، سورۂ مائدہ میں وارد کفارہ قسم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"امام شافعیؒ نے کفارہ قتل پر قیاس کرتے ہوئے غلام کے ساتھ ایمان کی قید بھی لگائی ہے"(۱)۔

اسی طرح امام شافعیؒ وضو میں نیت کو ضروری سمجھتے ہیں، چنانچہ وہ بھی اس خیال کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بغیر نیت کے وضو نماز کی کنجی نہیں بن سکتا"(۲)۔

مسئلہ قروء(۳) میں وہ بھی امام شافعیؒ کے تتبع میں قرء کے معنی طہر کے لیتے ہیں(۴)۔

فن قرأت سے واقفیت شیخ مہائمی مختلف امصار و علاقوں کی قرأت سے بھی بہ خوبی واقف تھے مگر وہ ان کی تفصیلات نہیں بیان کرتے، سورۂ فاتحہ میں "مالک یوم الدین" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"عاصم نے اسے الف سے اور باقی قراء نے بغیر الف کے پڑھا ہے"(۵)۔

علمائے نحو کے اقوال سے استدلال شیخ مہائمی مختلف مقامات پر ائمہ نحو مثلاً سیبویہ، اخفش اور زجاج وغیرہ کے اقوال نقل کرتے ہیں، چنانچہ آیتِ وضو(۶) میں ارجلکم کو وہ نافع، حفص اور کسائی کے مسلک پر نصب کے ساتھ پڑھتے ہیں(۷)۔

سورہ احزاب کی آیت

من یات منکن بفاحشۃ مبینۃ (احزاب:۳۰) جو کوئی کر لائے تم میں کام بے حیائی کا صریح۔

کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اگر اسے (مبینہ کی یا کو) نصب کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا مطلب ہوگا کہ یہ ایسی برائی ہے جس کی شناعت عقل نے واضح کر دی ہے اور

(۱) شیخ علی مہائمی، تفسیر، ج ۱، ص ۱۹۹۔ (۲) ایضاً ج ۱ ص ۱۸۰ (۳) سورۃ البقرہ، آیت ۲۸۸ (۴) شیخ علی مہائمی، ج ۱، ص ۸۲ (۵) ایضاً، ص ۲۲ (۶) سورۃ المائدہ، آیت ۶ (۷) شیخ علی مہائمی، ج ۱، ص ۱۸۰

اگر بالکسر پڑھا جائے تو اس سے مراد ایسی برائی ہوگی جس کے برا ہونے میں کسی غور وفکر کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کا قبیح ہونا ظاہر وباہر ہے'' (۱)۔

قصص قرآنی کا ذکر قرآن مجید میں مذکور قصص وواقعات کا ذکر بھی شیخ مہائمی نے کیا ہے مگر وہ ان کی غیر ضروری تفصیل میں نہیں جاتے اور اسرائیلیات سے مکمل اجتناب کرتے ہیں، آیت

هل اتاک نبوء الخصم (ص:۲۱)　　اور پہنچی ہے تجھ کو خبر دعوے والوں کی۔

کی تفسیر میں مفسرین نے روایتوں کا انبار لگا دیا ہے لیکن انہوں نے صرف آیت کے متبادر مفہوم ہی پر اکتفا کیا ہے (۲)، اسی طرح جمہور مفسرین نے اصحاب کہف کی تعداد اور ان کے کتے کی شکل وشباہت وغیرہ کی غیر ضروری تفصیلات بیان کی ہیں مگر شیخ مہائمی نے اس قسم کی تفصیلات کو رجما بالغیب قرار دیا ہے (۳) تاہم بعض مقامات پر انہوں نے بھی طوالت سے کام لیا ہے، چنانچہ ملکہ سبا کے قصہ میں

اذهب بکتابی هذا (نمل:۲۸)　　لے جا میرا یہ خط۔

کی تشریح میں وہ باتیں لکھ دی ہیں جن کا نفس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے (۴) مگر ایسا بہت کم ہوا ہے، اسی طرح انہوں نے آیت

امسک علیک زوجک (احزاب:۳۷)　رہنے دے اپنے پاس اپنی جورو کو۔

کی تشریح جمہور مفسرین کے برعکس کی ہے (۵)۔

ایجاز بیان تفسیر مہائمی کی ایک نمایاں خصوصیت ایجاز واجمال ہے، وہ مختصر جملوں میں اور اشارات کے ذریعہ آیتوں کی تفسیر بیان کرتے ہیں، صرف سورہ فاتحہ کی تفسیر انہوں نے بہت تفصیل سے لکھی ہے، اس سورہ کی اہمیت اور فضیلت کے بیان کے بعد اس کے مختلف اسما سورۃ الحمد، فاتحۃ الکتاب، سورۃ الشکر، سورۃ المنۃ، المثانی، سورۃ الکنز، سورۃ المناجات، سورۃ التفویض، ام الکتاب، سورۃ الوافیۃ، سورۃ الشفا وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی وجوہ تسمیہ بیان کی ہے، اس سورہ میں الوہیت، ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت، مالکیت، عبادت، استعانت اور صراط مستقیم کی

(۱) شیخ علی مہائمی، ج ۲، ص ۱۵۸ (۲) ایضاً، ج ۲، ص ۲۰۳ (۳) ایضاً، ج ۱، ص ۴۴۴ (۴) ایضاً، ج ۲، ص ۱۰۳ (۵) ایضاً، ج ۲، ص ۵۹۔

توضیح بڑی دقت نظر سے کی ہے، "غير المغضوب عليهم ولا الضآلين" کی تفسیر میں انہوں نے علامہ قاضی بیضاوی سے اختلاف کیا ہے، لکھتے ہیں:

"امام بیضاوی نے مغضوب سے عاصی اور ضآلین سے جاھلین باللہ مراد لیا ہے لیکن میرے خیال میں مغضوب سے معاند اور ضالین سے کفر میں مبتلا لوگ مراد ہیں" (۱)۔

تفسیر مہائمی کے مطالعہ کے دوران دوسری تفاسیر کے مقابلہ میں اس میں چند باتیں خاص طور پر نمایاں اور منفرد نظر آتی ہیں۔

سورتوں کا تعارف اس تفسیر میں ہر سورہ سے پہلے اس کے مضمون کا مختصر تعارف درج کیا گیا ہے، اگر کوئی متعین واقعہ یا کسی خاص پیغمبر کا ذکر اس میں موجود ہے تو اس کی مختصر تاریخ بھی دہرا دی گئی ہے، چنانچہ وہ سورہ آل عمران کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس سورہ کی زیادہ آیتیں آل عمران (عیسیٰ علیہ السلام، یحییٰ علیہ السلام، مریم علیہا السلام اور ان کی والدہ) کے اصطفاو برگزیدگی پر مشتمل ہیں اور اس کو حضور ﷺ کے اللہ کے ہر محبّ ومحبوب کے مقتدا بنائے جانے کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے" (۲)

شیخ مہائمی لکھتے ہیں کہ اس سورہ کا ایک نام "الزہرا" بھی ہے کیوں کہ اس میں حضرت عیسی علیہ السلام کے پورے معاملہ کی وضاحت کر دی گئی ہے اور اس کا ایک نام "امان" بھی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس سورہ کو مضبوطی سے تھامے رہے گا، وہ حضرت عیسی علیہ السلام کے معاملہ میں غلطی سے مامون رہے گا اور ایک نام "کنز" بھی ہے کیوں کہ یہ سورہ حضرت عیسی علیہ السلام کے اسرار و رموز پر مشتمل ہے، شیخ مہائمی لکھتے ہیں کہ اس سورہ کا نام "مجادله" بھی ہے کیوں کہ اس سورہ کی ۸۰ سے زیادہ آیتیں نصاری نجران سے حضور اکرم ﷺ کے مجادلہ سے متعلق ہیں اور اس کو سورۃ الاستغفار بھی کہتے ہیں، اس لیے کہ اس میں آیت "والمستغفرين بالاسحار" ہے اور "طیبه" بھی کہتے ہیں کیوں کہ اس میں آیت "والصابرين و الصادقين" میں طیبین کا ذکر ہے (۳)۔

سورہ براۃ کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس سورہ کو برأت اس لیے کہتے ہیں کہ اس لفظ سے

(۱) شیخ مہائمی، ج ۱، ص ۳۰ (۲) ایضاً، ج ۱، ص ۱۰۶ (۳) ایضاً۔

یہ سورہ شروع ہوتی ہے اور اس کے اکثر مندرجات برأت ہی سے متعلق ہیں اور اس سورہ کا نام "توبہ" بھی ہے، اس لیے کہ اس میں یہ لفظ کثرت سے آیا ہے، مثلاً:

فان تبتم فهو خير لكهم (توبہ:۳) سو اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لیے بہتر ہے۔

فان تابوا و اقاموا الصلوة (توبہ:۵) پھر اگر وہ توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز۔

ثم يتوب الله من بعد ذالك على من يشاء (توبہ:۲۷) پھر توبہ نصیب کرے گا اس کے بعد جس کو چاہے۔

فان يتوبوا يك خيرا لهم (توبہ:۷۴) سو اگر توبہ کرلیں تو بھلا ہے ان کے حق میں۔

عسى الله ان يتوب عليهم (توبہ:۱۰۲) قریب ہے کہ اللہ معاف کرے ان کو۔

الم يعلموا ان الله هو يقبل التوبه (توبہ:۱۰۴) کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ آپ قبول کرتا ہے توبہ۔

التائبون العابدون (توبہ:۱۱۲) وہ توبہ کرنے والے ہیں بندگی کرنے والے ہیں۔

سورہ توبہ کے مذکورہ بالا دو مشہور اسما کے علاوہ اور بھی چند نام ہیں، مثلاً المقشقشہ یعنی نفاق سے بری کرنے والی، المبعثرہ یعنی احوال و اخبار کی چھان بین کرنے والی، المنیرۃ حالات کی وضاحت کرنے والی، المدمدمتہ ہلاک کرنے والی، المشردہ تیرازہ منتشر کرنے والی وغیرہ، کیوں کہ اس طرح کے مضامین اس میں بار بار آئے ہیں۔

شیخ مہائمی لکھتے ہیں کہ اس سورہ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم درج نہیں ہے، کیوں کہ اس میں رحمت کا لفظ ہے جو امان کو مستلزم ہے اور امان جنگ و عہد شکنی کے منافی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ جب تبوک تشریف لے گئے اور منافقین نے یہ افواہ پھیلائی کہ مشرکین نے عہد شکنی کی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ وہ بھی اپنی قوم کو ان سے تعلقات منقطع کر لینے کا حکم دیں اور فرمایا "برأۃ یعنی یہ اس تعلق کا خاتمہ ہے جو تمہارا مشرکین کے ساتھ تھا اور اس تحفظ کا اختتام ہے جو تمہاری جانب سے ان کو حاصل تھا" (۱)۔

سورۂ کہف کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کا نام یہ اس لیے پڑا کہ اس میں اصحاب کہف کا

(۱) شیخ مہائمی تفسیر، ج ا ص ۱۰۱۔

تذکرہ ہے اور یہ قصہ ایمان باللہ کے فواید یعنی دشمنوں سے حفاظت، اشیا سے بے نیازی اور عجیب کرامتوں کا جامع ہے اور یہ قرآن کریم کے اہم مقاصد میں شامل ہے (۱)۔

سورہ لقمان کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ اس میں حضرت لقمان کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جو حکمت کی فضیلت، اللہ تعالیٰ کی معرفت، شرک کی مذمت، اخلاق حسنہ کی تلقین اور رذائل سے ممانعت پر مشتمل ہے اور یہ بھی قرآن کے مقاصد کا جز ہے (۲)۔

سورہ الصافات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں ایسی آیتیں ہیں جن میں ملایکہ کی بعض صفتیں بیان ہوئی ہیں اور خود جن سے ان کے الٰہ ہونے کی نفی ہوتی ہے تو ملایکہ سے کم تر درجہ کی چیزیں کیسے الٰہ بن سکتی ہیں، چنانچہ اس سورہ میں توحید کا اثبات ہے اور یہ قرآن کے عظیم ترین مقاصد میں ہے (۳)۔

سورۃ النصر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس سورہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نصرتِ الٰہی کے ذریعہ مذہب اسلام کو سارے مذاہب پر غلبہ حاصل ہوا ہے اور یہ بھی عظیم مقصد ہے، اس کو سورۃ التودیع بھی کہتے ہیں، اس لیے کہ اس میں استغفار کے حکم سے قرب وفات کا پتہ چلتا ہے (۴)۔

ہر سورہ کے آغاز میں بسم اللہ کی نئی تشریح

شیخ مہائمی کی تفسیر میں دوسری تفسیروں کے مقابلہ میں حیرت انگیز بات یہ پائی جاتی ہے کہ اس میں ہر سورہ کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تشریح سورہ کے مضمون کو مدنظر رکھتے ہوئے نئے اور انوکھے طریقہ سے کی گئی ہے، چنانچہ وہ سورہ فاتحہ میں بسم اللہ کی جو تشریح کرتے ہیں وہ سورہ بقرہ کی تشریح سے علاحدہ ہوتی ہے جس سے زبان و بیان پر ان کی غیر معمولی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے، ذیل میں چند سورتوں کے حوالے بہ طور مثال پیش کیے جاتے ہیں، سورۃ البقرہ میں لکھتے:

> ''اس (اللہ کے نام سے) جو اپنی ذات وصفات کے ساتھ اپنی کتاب میں جلوہ گر ہے اور یہ کتاب اس کے کمالات کے ذکر پر مشتمل ہے، (رحمٰن ہے) اس کتاب کو اعجاز بخشنے اور ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک رکھنے کی وجہ سے (رحیم ہے)

(۱) شیخ علی مہائمی تفسیر، ج ۱ ص ۴۳۹ (۲) ایضاً، ج ۲ ص ۱۴۳ (۳) ایضاً ص ۱۹۱ (۴) ایضاً ص ۴۱۶

اس کتاب کو متقین کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنا کر''(۱)۔

سورۃ المائدہ میں لکھتے ہیں:

''(اللہ کے نام سے) جس نے بر بنائے اقتضاء اسماو صفات اپنے احکام میں نرمی اور سختی دونوں رکھی ہے، (رحمن) ہے ان احکام کو دنیا و آخرت میں بندوں کے مصالح کا دارو مدار بنا کر، (رحیم) ہے ان احکام کو اپنی محبت کا رشتہ استوار کرنے والا بنا کر جو خدا اور بندے کے ایمانی تعلق سے عبارت ہے''(۲)۔

سورہ طٰہٰ میں لکھتے ہیں:

''(اللہ کے نام سے) جو اپنے کمالات کے ساتھ اپنے نبی اور اپنی کتاب میں جلوہ گر ہے، (جو رحمٰن ہے) اس کتاب کو نبی پر نازل فرما کر، (جو رحیم ہے) ان لوگوں کو خوش نصیب قرار دے کر جو اس کی اتباع کریں''(۳)۔

سورۃ العنکبوت میں لکھتے ہیں:

''(اللہ کے نام سے) جو لطف و قہر کے ساتھ جلوہ گر ہے، (جو رحمٰن ہے) ایمان کی توفیق عطا فرما کر، (جو رحیم ہے) مخلص اہل ایمان اور منافق کے درمیان امتیاز کر کے''(۴)۔

سورہ یٰسین میں لکھتے ہیں:

''(اللہ کے نام سے) جو اپنے کمالات کے ساتھ رسول اللہ ﷺ میں جلوہ گر ہے، (جو رحمان ہے) آپ ﷺ کو عالم کے لیے رحمت بنا کر، (رحیم) ہے آپ ﷺ کو صراط مستقیم عطا فرما کر جس پر گامزن ہو کر آپ ﷺ سے پہلے کوئی درجہ کمال کو نہیں پہنچا''(۵)۔

سورۃ الشمس میں رقم طراز ہیں:

''(اللہ کے نام سے) جو اپنے کمالات کے ساتھ آفتاب میں جلوہ گر ہے،

(۱) شیخ علی مہائمی تفسیر، ج ۱، ص ۳۲ (۲) ایضاً ص ۱۷۷ (۳) ایضاً، ج ۲، ص ۱۴ (۴) ایضاً ص ۱۲۵ (۵) ایضاً، ج ۲، ص ۱۸۲۔

(رحمان ہے) آفاق میں روشن ہو کر، (رحیم ہے) روح انسانی میں منور ہو کر"(۱)۔

حروف مقطعات کی توجیہ علما کے نزدیک حروف مقطعات متشابہات کے قبیل سے ہیں اور یہ ایسے اسرار ہیں جن کا حقیقی علم محض اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ہے، چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ یا صحابہ یا تابعین نے ان کی وضاحت نہیں فرمائی ہے، اس لیے عام طور پر مفسرین ان کے معانی بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں لیکن محققین کا کہنا ہے کہ یہ عربی زبان کا مخصوص اسلوب ہے جس سے قرآن کریم کے اولین مخاطب بہ خوبی واقف تھے، چنانچہ قدیم عرب شعرا کے یہاں بھی اس طرز کا وجود ملتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس دور کے مخالفین جو ہمہ وقت قرآن پر معترض ہوا کرتے تھے، انہوں نے بھی ان حروف کی غرابت کی کوئی بات نہیں کہی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس اسلوب کے عادی تھے، چنانچہ عہد سلف کے بعض علمائے راسخین نے ان حروف کے معانی بیان کیے ہیں اور اس بارے میں ان کے مختلف اقوال نقل کیے گئے ہیں:

۱- یہ حروف بہ طور قسم کے وارد ہوئے ہیں، ۲- اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسما ہیں، ۳- تنبیہ کے لیے ان کا استعمال ہوا ہے، ۴- ان حروف سے حروف تہجی کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے، ۵- ان کا استعمال تعجب کے لیے ہوا ہے، ۶- نبوت کی علامت ہیں، ۷- ابجد کے قاعدے کے مطابق حسابی اعداد ہیں اور ان کے ذریعہ واقعات عالم کے ازمنہ کا تعین کیا گیا ہے اور ان کے بارے میں پیشین گوئیاں کی گئی ہیں۔

شیخ مہائمی اور بعض دیگر اصحاب علم ان حروف مقطعات کو مختلف متعین الفاظ کے مخففات قرار دیتے ہیں، ان کے خیال میں متعین لفظ کے بجائے ان کا ایک ایک حرف استعمال کیا گیا ہے اور یہ طریقہ ہر زبان میں مروج ہے، چنانچہ انہوں نے قرآن مجید کے تمام حروف مقطعات کی موقع ومحل کی مناسبت سے توجیہ کی ہے اور ہر حروف سے اندازہ کر کے ایک لفظ متعین کر لیا ہے اور اس کی تشریح کی ہے۔

شیخ مہائمی نے حروف مقطعات کی جو توجیہات بیان کی ہیں ان کی بعض مثالیں درج کی جاتی ہیں:

(۱) شیخ علی مہائمی تفسیر، ج ۲، ص ۴۰۳۔

طہ، یعنی اے نقایص اور اسباب شقاوت سے مبرا اور کمالات واسباب سعادت کی راہ بتانے والے یا اے بلند ہمت یا اے جویائے حق اور ماسوا اللہ سے فرار اختیار کرنے والے یا اسی قسم کی عبارت جو اس مفہوم پر مشتمل ہو (۱)۔

سورۃ الروم میں ''الم'' کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یعنی میں اللہ ہوں جس کا علم محیط ہے یا جس کا لطف وکرم بے پایاں ہے یا وہ رب جس کا کرم آزمایشوں کے ساتھ ملا جلا ہے یا وہ جس کا لطف انجام کے اعتبار سے معتبر ہے وغیرہ (۲)۔

سورہ ص میں ''ص'' کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اس میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کے صدق کی قسم کھائی ہے جس کا اعتراف اہل مکہ کو بھی دعوائے نبوت کے علاوہ تمام باتوں میں تھا، اہل کتاب تو غیب کی خبروں میں بھی آپ ﷺ کو صادق مانتے تھے، چنانچہ اس کے ذریعہ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جب آپ ﷺ ہر معاملہ میں صادق تھے تو دعوی نبوت میں بھی ان کو صادق تسلیم کرنا چاہیے، یا اللہ نے قسم کھائی ہے آپ ﷺ کے رذائل و قبائح سے اجتناب کی جس میں کذب سے آپ کا مبرا ہونا بھی شامل ہے یا قسم کھائی ہے آپ کے مدارج کمالات کی جس سے آپ کی رفعت وبلندی کا اندازہ ہوتا ہے یا قسم کھائی ہے آپ کے صبر کامل کی جو رسالت کا خاصہ ہے''۔ (۳)

ربط آیات قرآن مجید کی تفسیر میں ماقبل ومابعد آیتوں میں ربط پیدا کرنا اور ان سب کا باہم دگر تعلق دکھانا بڑا مشکل امر ہے اور گہری بصیرت کا متقاضی ہے، شیخ مہائمی نے اس کام کو عمدہ طریقہ پر انجام دیا ہے اور پوری سورہ کا مضمون ایک دوسرے کے ساتھ منسلک دکھایا ہے، ذیل میں ان کی تفسیر سے سورۃ الضحیٰ کی تفسیر پیش کی جاتی ہے جس سے ان کے کمال کا اندازہ ہوگا، وہ لکھتے ہیں:

''اس سورہ کا نام ضحیٰ (چاشت) اس لیے رکھا گیا کہ فترۃ الوحی (وقفہ)

(۱) شیخ علی مہائمی، ج ۲، ص ۱۴ (۲) ایضاً، ص ۱۳۵ (۳) ایضاً، ص ۲۰۰۔

کے بعد وحی کے دوبارہ آنے کی دلیل ہوسکے اور یہی اس سورہ کی غایت اور مقصود ہے، (اللہ کے نام سے) جو اپنے مختلف ناموں کے ذریعہ سورج چڑھتے وقت اور رات میں اپنی تجلی کا ظہور کرتا ہے، یہی اس بات کی دلیل ہے کہ انبیاؑ پر کبھی وحی کا نزول ہوتا ہے اور کبھی اس کا سلسلہ رک جاتا ہے اور یہ نظام کائنات کی ہر چیز میں کارفرما ہے، (بڑا مہربان ہے) اس لحاظ سے کہ حضرات انبیاؑ پر بشریت کا غلبہ ہوتا ہے تو اللہ ان سے ناراض نہیں ہوتا اور نہ انہیں بے یارو مددگار چھوڑتا ہے، (بڑا رحم دل ہے) اپنے نورِ حق کو دوبارہ غالب کر کے یعنی دوبارہ ان پر وحی کا نزول کرتا ہے، (قسم ہے چاشت کے وقت کی) یعنی جب سورج بلند ہوتا ہے، گویا یہ مثال ہے روح محمدی پر نورِ الٰہی کے اشراق کی، (اور قسم ہے رات کی) جو دراصل آپ ﷺ کی بشریت سے مشابہت رکھتی ہے، (آپ ﷺ کو پروردگار نے خیر باد نہیں کہا) یعنی اس طرح آپ ﷺ کو رخصت نہیں فرمایا کہ پھر طویل مدت تک آپ ﷺ کو اپنے فیضان سے محروم رکھے (آپ ﷺ کا پروردگار آپ ﷺ سے ناراض نہیں ہوا) یعنی چند روز وحی کے رک جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا اپنے نبی سے ناراض ہوگیا جیسا کہ مشرکین آپ ﷺ کے بارے میں گمان رکھتے ہیں، وحی کی چند روزہ رکاوٹ ناراضگی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ کے روحانی ارتقا کے باعث ہوئی ہے، (آپ ﷺ کا پروردگار دنیا سے بڑھ کر آخرت کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے گا) جہاں آپ ﷺ پر نہ بشری کمزوریوں کا غلبہ ہوگا اور نہ دولت کے فقدان کا احساس بلکہ نورانیت کا فیضان ہوگا، (آپ ﷺ اس دولت گراں مایہ سے راضی ہو جائیں گے) یعنی آپ ﷺ کو مقام شفاعت حاصل ہوگا......، اگر آپ ﷺ کو خیر کے اس معاملہ میں کچھ شک ہے تو اپنی ابتدائی زندگی پر غور کیجیے، (کیا آپ ﷺ کو یتیمی کی حالت میں نہیں پایا) یعنی بشریت کے اقتضا کی بنا پر بے سہارا پایا (تو آپ ﷺ کو ٹھکانا بخشا) اور (آپ ﷺ کو بشریت کی تاریکی میں بے قرار اور سرگرداں پایا) (تو

اپنے غلبہ نور سے ہدایت کی راہیں کھول دیں) یعنی خواص بشریت کے بعد الہٰی خواص آپ ﷺ کو بخش دئے (اور آپ ﷺ کو فقر و ناداری کی حالت میں پایا) فقر و محتاجی بشری خواص میں سے ہے (تو اپنے الہٰی خواص میں سے دولت غنا عطا فرمائی) اب آپ ﷺ بھی ان نعمتوں سے مخلوق خدا کو فائدہ پہنچائیں، چنانچہ جس طرح اللہ نے آپ ﷺ کو حالت یتیمی میں ٹھکانا دیا تو (آپ ﷺ بھی دوسرے یتیموں پر سختی نہ کریں اور نہ انہیں جھڑکیں) اور جس طرح پروردگار نے آپ ﷺ کو غنی و بے نیاز کر دیا تو (آپ ﷺ بھی سوال کرنے والوں سے شکستہ خاطر نہ ہوں) بلکہ حاجت مندوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آئیں، (سائل کو ڈانٹنے کا شیوہ نہ اپنائیں) بلکہ اس کی دل جوئی فرمائیں (اور نعمت ہدایت جو آپ ﷺ کو ملی ہے اس کو بیان کریں) سائل کا ذکر چونکہ یتیم کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا تھا، اس لیے اس کو ہدایت و رہنمائی سے پہلے ذکر کیا گیا ہے اور ہدایت کا ذکر آخر میں اس لیے ہوا ہے کہ اس کو تصرف مال میں بنیادی حیثیت حاصل ہے"۔(۱)

مذکورہ بالا خصوصیات کی بنا پر تفسیر مہائمی ہر دور میں اہل علم طبقہ کا مرجع و ماخذ رہی ہے، چنانچہ مفسرین کی ایک جماعت نے اس کے قرآنی نکات پر بحثیں کی اور اس کے اسرار و رموز بیان کیے ہیں، ہندوستانی مفسرین میں علامہ طاہر سندھی نے "مجمع البحرین" میں شاہ عبدالعزیز دہلوی نے "فتح العزیز" میں اور مولانا محمد عمر الحسینی نے اپنی تفسیر "کشف القلوب" میں ان کے اقوال نقل کیے ہیں اور مولانا اشرف علی تھانویؒ نے "بیان القرآن" میں اور مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے "تفسیر واضح البیان" میں اس کے حوالے دیے ہیں، عبداللہ یوسف علی نے انگریزی ترجمہ قرآن کے حاشیہ میں اس کے قرآنی نکات درج کیے ہیں اور اس تفسیر سے استفادہ کا اعتراف کیا ہے، ان کے علاوہ حلقہ صوفیہ میں اور نظم قرآن کے شائقین میں اس تفسیر کی مقبولیت ہر دور میں رہی ہے۔



(۱) شیخ علی مہائمی، ج ۲، ص ۴۰۵-۴۰۶۔

قاضی شہاب الدین دولت آبادی

نام ونسب اور خاندانی حالات نام احمد، لقب شہاب الدین اور ملک العلما ہے، والد بزرگوار کا نام عمر اور ان کا لقب شمس الدین تھا، تذکرہ کی بعض کتابوں میں ان کے والد کا نام شمس الدین اور جد امجد کا نام عمر بتایا گیا ہے(۱)۔

قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے خاندان کا اصل وطن غزنہ تھا(۲) اور ان کی نسبت ''الزاولی'' (۳) سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے اہل خاندان غزنہ کے قریب ''زابلستان'' کے رہنے والے تھے، اس کے علاوہ ان کے خاندانی حالات کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا۔

ولادت قاضی صاحب کے ابتدائی حالات پردہ خفا میں ہیں، ان کی تاریخ پیدائش کسی کتاب میں مذکور نہیں ہے، اسی طرح ان کی جائے پیدائش بھی تذکرہ نگاروں کے درمیان متفق علیہ نہیں ہے، ابوالقاسم فرشتہ نے دولت آباد دکن کو ان کا مولد بتایا ہے(۴) اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے دولت آباد دہلی لکھا ہے(۵) ممکن ہے کہ دولت آباد کے نام سے دہلی میں کوئی محلہ اس زمانہ میں آباد رہا ہو اور اس قیاس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ قاضی صاحب کی ابتدائی تعلیم وتربیت دہلی

---

(۱) آزاد، مآثر الکرام، دفتر اول، مفید عام پریس، آگرہ، ۱۹۱۰ء، ص ۱۸۸، اور سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، ج ۱، علی گڑھ، ۱۹۷۶ء، ص ۹۵، حاجی خلیفہ نے قاضی صاحب کا نام احمد اور ان کے والد کا نام عمر لکھا ہے، ملاحظہ ہو (حاجی خلیفہ، کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون، ج ۲، استنبول، بدون تاریخ، ص ۱۳۷۵) معاصر تذکرہ نگاروں میں قاضی اطہر مبارک پوری نے اسی کو صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے (قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علما، جمال پرنٹنگ پریس، دہلی ۱۹۷۹ء، ص ۱۳۱) (۲) ابوالقاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، ج ۲، نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء، ص ۳۰۶ (۳) آزاد، مآثر الکرام، محولہ بالا، ص ۱۸۸ (۴) تاریخ فرشتہ، ج ۲، ۳۰۶ (۵) آزاد، مآثر الکرام، ص ۱۸۸، اور عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۲۰۔

ہی میں ہوئی، بعض متاخرین تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق ان کی ولادت آٹھویں صدی کے وسط میں ہوئی تھی (۱) اوراس زمانہ میں دہلی کی مرکزیت دوبارہ قایم ہوچکی تھی۔

تعلیم وتربیت قاضی صاحب نے دہلی کے عظیم المرتبت عالم قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، جنہوں نے مدۃ العمر دہلی میں درس وافادہ کا بازار گرم رکھا، وہ شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلویؒ اوران کے سلسلہ کے لوگوں سے زیادہ قریب تھے، اس لیے ان کے درس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ حصول علم کے ساتھ اتباع شریعت پر خاص زور دیتے تھے (۲)، قاضی عبدالمقتدر کی خدمت میں رہ کر قاضی صاحب نے علم وفضل میں نمایاں مقام حاصل کیا، ان کے علمی ذوق وانہماک اور قابلیت واستعداد کو دیکھ کر قاضی عبدالمقتدر نے ان کے بارے میں کہا کہ:

''پیش من طالب علمی می آید کہ پوست اوعلم ومغز او ؔ م واستخواں اوعلم است''۔(۳)

(میری مجلس میں ایک ایسا طالب علم حاضر ہوتا ہے جس کی کھال، گوشت اور ہڈیاں سب علم ہی علم ہیں)

اس کے بعد قاضی صاحب نے دہلی کے مشہور عالم مولانا خواجگی کے حلقۂ تلمذ میں شمولیت اختیار کی اور فقہ واصول فقہ کے علاوہ دیگر علوم وفنون میں اعلا لیاقت پیدا کی، آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ وہ اپنی طالب علمی کے زمانہ میں اپنے تمام ساتھیوں میں فایق تھے (۴)۔

سفر کالپی ۸۰۱ھ/۱۳۹۸ء میں تیموری حملہ کے بعد دہلی کے علما واتقیاء وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے، قاضی شہاب الدین دولت آبادی بھی اپنے استاذ مولانا خواجگی کے ہمراہ دہلی سے کالپی پہنچے، پھر وہاں سے سلطان ابراہیم شرقی، والی سلطنت جون پور کی دعوت پر جون پور وارد ہوئے (۵)۔

قیام جون پور دہلی اوراس کے گردونواح سے جو علما وصلحا ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے، ان کی ایک بڑی تعداد شیراز ہند (جون پور) پہنچی اورانہوں نے اس شہر کو دارالعلم بنادیا، اس کی اصل

(۱) قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علما، ص ۱۳۴ (۲) عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، ص ۱۲۳ (۳) ایضاً و آزاد، ماثر الکرام، ص ۱۸۸ (۴) آزاد، ماثر الکرام، ص ۱۸۸ (۵) ایضاً وسبحۃ المرجان، ج ۱ ص ۹۵ ورحمان علی، حوالہ سابق، ص ۸۸۔

وجہ یہ تھی کہ سلطان ابراہیم شرقی علم وفضل کا بڑا قدرداں اور علما ومشایخ کا گرویدہ تھا، اس کی علم پروری اور شاہانہ جود وسخا سے علما کو جون پور میں اطمینان اور سکون حاصل ہوا، فرشتہ کا بیان ہے:

> ''ہندوستان کے اطراف واکناف سے لوگ فتنہ وفساد کی وجہ سے جون پور چلے آئے، یہاں ہر ایک کو اس کے مرتبہ ومقام کے مطابق اعزاز حاصل ہوا، علما، مشایخ وسادات غرض ہر طبقہ کے لوگ اس طور پر یہاں جمع ہوگئے تھے کہ جون پور کو دہلی ثانی کہا جانے لگا، لوگوں نے سلطان ابراہیم شرقی کی حکومت کے زیر سایہ اس طرح زندگی گزارنی شروع کی کہ شاہ وگدا سب مطمئن ومسرور تھے اور غم واندوہ کا اس خطہ میں گزر نہ تھا(۱)۔

قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے جون پور پہنچنے کی تفصیل مولانا خیر الدین محمد جون پوری نے بیان کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''سلطان ابراہیم شرقی کو جب قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے کالپی پہنچنے کی خبر ملی تو اس نے اہل علم سفرا کو ان کے پاس ہدایا وتحایف کے ہمراہ بھیجا اور ان کو جون پور آنے کی دعوت دی، چنانچہ قاضی صاحب اپنے استاذ مولانا خواجگی کے حکم کی تعمیل میں طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ جون پور وارد ہوئے، سلطان نے ان کا غیر معمولی اکرام کیا، ان کو ملک العلما کے خطاب سے نوازا اور اپنی جامع مسجد کے پہلو میں ان کے لیے خاص مدرسہ اور شاہی طرز کے مکانات تعمیر کروائے''(۲)۔

مذکورہ بالا بیان اور دوسرے ماخذ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان نے قاضی صاحب کے استاذ مولانا خواجگی کو جون پور آنے کی دعوت دی تھی جو اپنی علمی صلاحیت کی بنا پر کافی مشہور ومتعارف تھے، مگر مولانا خواجگی نے کالپی ہی میں اقامت گزیں ہونا پسند کیا اور اپنے لایق شاگرد قاضی شہاب الدین دولت آبادی کو جون پور روانہ فرمایا، چنانچہ سلطان نے قاضی صاحب کی آمد

(۱) فرشتہ، حوالہ سابق، ص ۳۰۶ (۲) خیر الدین محمد جون پوری، تذکرۃ العلما، الطافی پریس، کلکتہ، ص ۱۳۔

کو ہی غنیمت سمجھا اور ان کا والہانہ استقبال کیا، ان کو جون پور کا قاضی القضاۃ مقرر کیا(۱) فرشتہ کا بیان ہے کہ سلطان ان کو خاص موقعوں پر اپنی مجلس میں چاندی کی کرسی پر بٹھاتا تھا(۲)۔

ایک اشتباہ تذکرۃ العلما میں ''مناقب الصدیقین'' کے حوالہ سے قاضی صاحب کے استاذ قاضی عبدالمقتدر شریحی کے جون پور آنے کا ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے، جس میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ انہوں نے یہ سفر اپنے عزیز شاگرد قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی دعوت پر کیا تھا اور وہ اس وقت وہاں مقیم تھے، اس موقع پر سلطان ابراہیم شرقی نے ان کا والہانہ استقبال کیا اور قاضی عبدالمقتدر ایک سال جون پور میں رہے(۳)۔

یہ روایت متعدد وجوہ کی بنا پر صحیح نہیں ہے، اول تو قاضی عبدالمقتدر کا انتقال ۷۹۱ھ/ ۱۳۸۸ء میں دہلی میں ہوا اور اس مدت میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی کا قیام دہلی ہی میں تھا، دوسرے قاضی عبدالمقتدر کے انتقال کے کئی برس بعد سلطان ابراہیم سریرآرائے سلطنت ہوا۔

ہمارے خیال میں قاضی عبدالمقتدر شریحی کے بجائے قاضی شہاب الدین کے دوسرے استاد مولانا خواجگی کے بیان میں یہ یہ واقعہ قرین قیاس ہوسکتا ہے، تاہم اس کی صراحت تذکرہ کی کسی کتاب میں موجود نہیں ہے، اس قیاس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ جون پور میں قیام کے دوران قاضی صاحب مولانا خواجگی سے مراسلت کرتے رہتے تھے(۴) اور جون پور میں وہ جس محلہ میں اقامت گزیں تھے، اس کا نام بھی ''محلہ خواجگی'' تھا جو ممکن ہے کہ اسی واقعہ کی یادگار کے طور پر رکھا گیا ہو۔

درس وتدریس قاضی صاحب نے جون پور میں اپنی مسند درس آراستہ کی اور ان کے درس کو وہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہاں کی دوسری تمام درس گاہیں معطل ہوکر رہ گئیں(۵)، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا بیان ہے کہ قاضی صاحب کو جو شہرت حاصل ہوئی، وہ ان کے عہد کے اور کسی عالم کے حصہ میں نہیں آئی، جب کہ ان میں بیشتر لوگ ان کے ہم سبق اور بعض ان

(۱) ابوالبشارت نورالدین زیدی، تجلی نور، ج ۲، جادو پریس، جون پور، ۱۹۰۰ء، ص ۳۴ (۲) فرشتہ، ص ۳۰۶ (۳) خیرالدین، ص ۱۶ (۴) آزاد، ماثرالکرام، ص ۱۸۸ (۵) ایضاً سبحۃ المرجان، ص ۶۶۔

کے اساتذہ تھے (۱) اسی کے ساتھ قاضی صاحب نے تصنیف وتالیف کا شغل بھی جاری رکھا (۲)۔

اصحاب سلوک سے ربط وتعلق درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے ساتھ قاضی صاحب کے تعلقات اہل علم صوفیہ سے بھی برابر استوار رہے، جن میں سرفہرست جہاں گیر اشرف سمنانیؒ تھے، ان سے قاضی صاحب کی علمی مراسلت بھی ہوا کرتی تھی اور دونوں بزرگوں کے درمیان غایت درجہ محبت واحترام کا جذبہ کارفرما تھا (۳)۔

اتباع شریعت کا اہتمام قاضی صاحب نہایت متبع سنت تھے، عہدۂ قضا پر مامور ہونے کی وجہ سے وہ عام لوگوں کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے، شیخ رکن الدین جون پوری ان کے عہد کے ایک مشہور صوفی تھے، جن کے مریدین ان کو سجدہ تعظیمی کرتے تھے اور وہ ان کو اس حرکت سے منع نہیں کرتے تھے، قاضی صاحب کو جب اس کی اطلاع ملی تو ان کو اس سے باز رہنے کا سرکاری حکم نامہ جاری کیا (۴)، تجلی نور میں ہے کہ انہوں نے اپنے ایک شاگرد شیخ عبدالملک عادل کو ان کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ وہ اپنے مریدوں کو اس حرکت سے منع کریں ورنہ خود ان کو شہر بدر کردیا جائے گا (۵)۔

قاضی صاحب کی تعلیم وتربیت کا یہ فیضان تھا کہ ان کے تلامذہ بھی ان ہی کے نقش قدم پر چلتے تھے، کبیر جو اس دور میں وحدت ادیان کا علم بردار تھا، ایک مرتبہ جون پور آیا، قاضی صاحب کے شاگردوں کو اس کی اطلاع ہوگئی تو انہوں نے اس کو گھیر لیا، کسی طرح شیخ رکن الدین نے اس کو اپنی پناہ میں لے کر ان سے بچا کر جون پور سے روانہ کیا (۶)۔

شعر وشاعری قاضی صاحب کو شعر وشاعری سے بھی شغف تھا، غلام سرور لاہوری کے بیان کے مطابق وہ اس فن میں مکمل دست گاہ رکھتے تھے (۷)، ان کا ایک قطعہ جو انہوں نے بادشاہ کو ایک کنیز کی طلب گاری میں لکھا تھا بہت مشہور ہوا:

ایں نفس خاکسار کہ آتش سزائے اوست ۔۔۔ بر بادگشت لایق بے آب کردن است

(۱) شیخ عبدالحق محدث، ص ۱۶۹ (۲) رحمان علی، ص ۸۸ (۳) شیخ عبدالحق محدث، ص ۱۵۶ اور رحمان علی، ص ۲۳ (۴) مولانا عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۳۷ (۵) ابوالبشارت، حوالہ سابق، ج ۱، ص ۳۳
(۶) مولانا عبدالحئی بحولہ بالا (۷) غلام سرور، حوالہ سابق، ج ۱، ص ۳۳۔

یک کس خیال فرست کہ پا برسرم نہد ریزد ہمہ منی و تکبر کہ در من است

صاحب تذکرہ العلما کا بیان ہے کہ قاضی صاحب نے یہ قطعہ سلطان ابراہیم شرقی کو لکھ کر بھیجا تھا اور اس کا پس منظر یہ ہے کہ وہ مجرد تھے اور سلطان کی بڑی خواہش تھی کہ وہ متاہلانہ زندگی بسر کریں مگر وہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے، بعد میں ان کو ضرورت بشری کا احساس ہوا اور ان کی یکسوئی میں خلل واقع ہونے لگا تو انہوں نے یہ قطعہ لکھ کر سلطان سے ایک کنیز کی درخواست کی، سلطان اس سے بہت خوش ہوا اور ایک خوبرو کنیز خانہ داری کے لوازم سمیت ان کی خدمت میں بھیجی (۱)۔

سلطان ابراہیم شرقی کی قدردانی سلطان ابراہیم شرقی کو قاضی صاحب سے بے پناہ محبت وعقیدت تھی جس کا ذکر تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے، قاضی صاحب سے اس کی محبت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ قاضی صاحب بیمار ہوئے تو سلطان خود ان کی عیادت کے لیے حاضر ہوا، فرشتہ کا بیان ہے کہ اس موقع پر سلطان نے پانی کا ایک پیالہ منگوایا اور اس کو قاضی صاحب کے اوپر گھمایا اور یہ کہتے ہوئے پیالہ کا پانی پی گیا کہ:

"بارخدایا ہر بلائے کہ در راہ او باشد نصیب من گرداں و اورا شفا بخش"۔ (۲)

(خدایا قاضی صاحب پر جو بھی مصیبت مقدر ہو اس کو میرے حصہ میں ڈال دیجیے اور انہیں شفایاب فرمادیجیے)

سلطان کے دربار میں قاضی صاحب کی غیر معمولی قدر و منزلت کی بنا پر ان کے حاسدین بھی پیدا ہوگئے تھے، جس کی شکایت انہوں نے اپنے استاذ مولانا خواجگی کو لکھ بھیجی، اس کے جواب میں مولانا خواجگی نے شیخ سعدی کے دو شعر ان کو لکھے اور اطمینان دلایا۔

ازواج واولاد قاضی صاحب کے ازواج واولاد کے ذکر سے بھی تذکرہ کی کتابیں خاموش ہیں، مولانا خیر الدین جون پوری کے بیان کے مطابق وہ مجرد رہے (۳)، مولانا رحمان علی کا کہنا ہے کہ انہوں نے شادی کی تھی اور ان کے ایک دختر تھیں جو شیخ نصیر الدین بن نظام الدین سے منسوب تھیں اور ان کے بطن سے ان کے تین فرزند شیخ صفی الدین رودولوی، شیخ فخر الدین اور

(۱) خیر الدین، ص ۱۳ (۲) فرشتہ ص ۳۰۶ (۳) خیر الدین، ص ۱۳۔

شیخ رضی الدین پیدا ہوئے (۱) اور ان تینوں نے اپنے نانا قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے تعلیم حاصل کی (۲)۔

ہمارے خیال میں ان تینوں بھائیوں کا قاضی صاحب سے خاندانی رشتہ محل نظر ہے بلکہ یہ تینوں بھائی دراصل قاضی صاحب کے شاگرد تھے، حاجی خلیفہ نے شیخ صفی الدین کی تصنیف ''غایۃ التحقیق'' کے تعارف میں ان کی ایک عبارت نقل کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی صاحب سے ان کا تعلق محض شاگردی کا تھا، وہ عبارت یہ ہے:

انه شرح ممزوج ...... وهو من تلامذة الهندی ذکره فیه و مدح حاشیة وقال ان شروح الکافیه لیست بوافیة الا حواشی استاذنا شهاب الدین احمد بن عمر الدولة آبادی (۳)۔	یہ (کافیہ کی) ایک عمدہ شرح ہے، اس کے مصنف قاضی شہاب الدین ہندی کے شاگرد ہیں، اس میں مصنف نے اپنے استاذ کا ذکر کیا ہے اور کافیہ پر ان کے حاشیہ کی تعریف میں لکھا ہے کہ اس کی تمام شرحیں سوائے ہمارے استاذ شہاب الدین احمد بن عمر دولت آبادی کے حاشیہ کے سب کی سب نامکمل ہیں۔

شیخ صفی الدین کے اس بیان میں قاضی صاحب سے ان کے کسی خاندانی تعلق کا اظہار نہیں کیا گیا ہے، پھر ان کا انتقال ۸۱۹ھ / ۱۴۱۶ء میں قاضی صاحب کے ایام حیات ہی میں ہوگیا (۴) اور ۷۸۹ھ / ۱۳۸۷ء میں ان کے فرزند شیخ ابوالمکارم اسماعیل پیدا ہوئے (۵)، گویا اس تصریح کے مطابق محض چالیس برس کی عمر میں قاضی صاحب کے نواسے بھی صاحب اولاد ہوگئے جو بعید از قیاس ہے۔

وفات قاضی صاحب کی تاریخ وفات میں بھی تذکرہ نگار مختلف الرائے ہیں، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے بیان کے مطابق ۸۴۸ھ / ۱۴۴۴ء میں ان کی وفات ہوئی (۶)۔

(۱) رحمان علی، ص ۹۶ (۲) ایضاً اور مولانا عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۷۵، ۹۴، ۱۲۱ (۳) حاجی خلیفہ، ج ۲، ص ۱۳۷۵ (۴) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۹۴، رحمان علی محولہ بالا (۵) عبدالحئی محولہ بالا، ص ۳۳ و رحمٰن علی، ص ۷ (۶) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۶۹۔

غلام سرور لاہوری (۱) اور مولوی خیر الدین نے بھی اسی کی تائید کی ہے (۲)، اس کے برخلاف غلام علی آزاد بلگرامی نے ان کی تاریخ وفات ۲۵؍رجب ۸۴۹ھ/ ۲۸؍اکتوبر ۱۴۴۵ء بتایا ہے (۳)، کشف الظنون (۴) تذکرہ علمائے ہند (۵) اور نزہۃ الخواطر میں بھی یہی تاریخ وفات مذکور ہے (۶)، اس بارے میں فرشتہ کا بیان تمام تذکرہ نگاروں سے علاحدہ ہے، وہ لکھتا ہے کہ:

"قاضی صاحب کو سلطان ابراہیم شرقی سے غایت درجہ محبت تھی ۸۴۰ھ/ ۱۴۳۶ء میں سلطان کی وفات کے بعد وہ اس قدر مغموم ہوئے کہ اسی سال وہ بھی انتقال کر گئے، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ سلطان کی وفات کے دو سال بعد ۸۴۲ھ/ ۱۴۳۸ء میں ان کی وفات ہوئی"۔ (۷)

ہمارے خیال میں فرشتہ کا بیان سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے اور زیادہ قابل اعتبار نہیں ہے، پھر خود اس کی مرجحہ روایت کے مطابق ۸۴۴ھ/ ۱۴۴۰ء کو اس نے قاضی صاحب کا سن وفات بتایا ہے، اس سے بھی اس کا مندرجہ بالا بیان متناقض ہے۔ (۸)

تمام تذکرہ نگاروں کا متفقہ بیان ہے کہ جامع مسجد جون پور (اٹالہ) کے جنوبی سمت اپنے مدرسہ کے احاطہ میں دفن کیے گئے، مولانا رحمان علی نے مچھلی شہر سے غازی پور جاتے ہوئے اپنے ایک سفر میں ان کی قبر پر حاضری دی تھی (۹)، قاضی اطہر مبارک پوری کا بیان ہے کہ یہ مزار ایک کالج کے احاطہ کے دائرہ میں آ گیا ہے اور قاضی صاحب کی قبر شکستہ تعویذ کی شکل میں اب بھی موجود ہے۔ (۱۰)

تصنیفات قاضی صاحب نے گراں قدر کتابیں تصنیف کیں اور ان کی بعض تصانیف کو ان کی زندگی میں غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوگئی (۱۱) اور یہ کتابیں عرب و عجم میں یکساں مقبول تھیں (۱۲)، قاضی صاحب کی جن کتابوں کا سراغ ملتا ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) غلام سرور، ص ۳۹۱ (۲) خیر الدین، ص ۱۵ (۳) آزاد بلگرامی، مآثر الکرام، دفتر اول، ص ۱۸۹ و سبحۃ المرجان، ج ۱، ص ۹۶ (۴) حاجی خلیفہ، ج ۲، ۱۷۳۱ (۵) رحمان علی، ص ۸۹ (۶) عبد الحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۲۲ (۷) فرشتہ، ص ۳۰۶ (۸) ایضاً (۹) رحمان علی، ص ۸۹ (۱۰) قاضی اطہر مبارک پوری، ص ۲۱۰، حاشیہ (۱۱) شیخ عبد الحق، ص ۶۶ و فرشتہ، ص ۳۰۶ (۱۲) آزاد، سبحۃ المرجان، ج ۱، ص ۹۶ و مولانا عبد الحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۳، ص ۲۱۔

۱- حواشی کافیہ: ابن حاجب کی مفصل شرح ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا بیان ہے کہ یہ کتاب لطافت و متانت میں بے مثال ہے اور یہ مصنف کی زندگی ہی میں مشہور زمانہ ہو چکی تھی (۱)، اس کتاب پر ہندوستان اور بیرون ملک کے متعدد علما نے حاشیے لکھے (۲)، یہ عربی میں ہے، اس کو لکھنے کے بعد قاضی صاحب نے اسے اپنے ایک معاصر عالم قاضی نصیر الدین گنبدی کے پاس بھیجا اور ان سے فرمایش کی کہ وہ اس کی روشنی میں کافیہ پڑھایا کریں، قاضی نصیر الدین نے اس کتاب کی بہت تعریف کی اور کہا کہ اس اس کے بعد ہمارے درس کی ضرورت باقی نہیں رہی (۳)، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ ''کتاب الہندی'' کے نام سے پنجاب پبلک لائبریری میں محفوظ ہے (۴)، اس لائبریری میں کافیہ کا بھی ایک ایسا نسخہ موجود ہے جس کے حاشیہ اور بین السطور پر قاضی صاحب کی شرح مندرج ہے (۵)۔

۲- الارشاد فی النحو: یہ کتاب بھی عربی میں ہے اور فن نحو میں ہے، شیخ عبدالحق محدث نے اس کتاب کی بھی بڑی تعریف کی ہے اور اس کی ایک اہم خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں نحوی مسایل کو عبارتی مثالوں سے واضح کیا گیا ہے، جس سے اس فن میں ایک جدید طرز کا آغاز ہوا ہے (۶)، اس کتاب کی بھی متعدد شرحیں لکھی گئیں (۷) اور اس کے متعدد قلمی نسخے لیڈن لائبریری، کتب خانہ آصفیہ (۸) اور دارالعلوم پشاور میں موجود ہیں (۹)، مولانا رحمان علی کی نگاہ سے یہ کتاب مفتی علی کبیر مچھلی شہری کے کتب خانہ میں گزری تھی (۱۰)۔

۳- بدیع البیان: فن بلاغت میں ایک جامع کتاب تھی اور اس میں سجع و قوافی کا خاص اہتمام کیا گیا تھا (۱۱)، غالب گمان ہے کہ یہ بھی عربی ہی میں رہی ہوگی۔

۴- شرح بزدوی: اصول فقہ میں امام بزدوی کی مشہور کتاب کی شرح ہے جس کو قاضی نے اپنے

(۱) شیخ عبدالحق، ص ۱۶۹ (۲) حاجی خلیفہ، ج ۲، ص ۱۳۷۱ (۳) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۷۱ (۴) منظور احسن عباسی، مخطوطات عربیہ، پنجاب پبلک لائبریری، دی آئیڈیل پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۲۰۰ (۵) ایضاً ص ۱۷۹ (۶) شیخ عبدالحق، ص ۱۶۹ (۷) حاجی خلیفہ، ج ۱، ص ۸۶! (۸) سید تصدق حسین، ج ۲، ص ۸۳۶! (۹) عبدالرحیم، لباب المعارف العلمیہ، آگرہ، ۱۹۱۸ء، ص ۲۴۸ (۱۰) رحمان علی، ص ۸۸ (۱۱) شیخ عبدالحق محدث، ص ۱۷۱

ایک شاگرد محمد عیسیٰ کے لیے بحث امر تک لکھا تھا(۱) قراین سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فارسی میں رہی ہوگی۔

۵-۱ اصول ابراھیم شاھی: ایک فارسی رسالہ ہے جو سلطان ابراہیم شرقی کے لیے لکھا تھا، اس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونی ورسٹی، ذخیرہ شیروانی میں موجود ہے(۲)۔

ان کے علاوہ قاضی صاحب کی مندرجہ ذیل کتابوں اور رسالوں کا ذکر بھی ملتا ہے:

رسالہ الصنائع (فارسی، رسالہ تقسیم علوم (فارسی)، شرح قصیدہ بردہ، مناقب السادات (فارسی)، ہدایۃ السعداء (فارسی)، شرح قصیدہ بانت سعاد (عربی)، یہ قصیدہ مصدق الفضل کے نام سے ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں حیدر آباد سے طبع ہو چکا ہے(۳)۔

تفسیر بحر مواج قاضی صاحب کی یہ تفسیری تصنیف ہے جو فارسی میں ہے اور مکمل قرآن مجید کو محیط ہے، اس تفسیر کے متعدد ناقص قلمی نسخے ملک و بیرون ملک کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں(۴)، ڈاکٹر میاں محمد سعید کا بیان ہے کہ اس کا اصل نسخہ تاشقند لائبریری میں ہے اور اب تک بڑی عمدہ حالت میں نہایت قرینہ سے محفوظ ہے(۵)، پروفیسر محمد اسلم، استاذ شعبہ تاریخ، پنجاب یونی ورسٹی نے مختلف لائبریریوں سے اس کے مائیکروفلم حاصل کر کے اس کے تمام اجزا کو اپنے پاس جمع کر لیا ہے(۶)، اس کی جلد اول جو چار ابتدائی سورتوں پر مشتمل ہے ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۹ء میں نول کشور پریس سے طبع ہو چکی ہے اور مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہے(۷)۔

اس تفسیر کی نمایاں خصوصیات تفسیر بحر مواج ہندوستان کی ابتدائی تفسیروں میں شمار کی جاتی ہے اور فارسی میں غالباً یہ یہاں کی پہلی تفسیر ہے، ذیل میں اس تفسیر کی بعض اہم خوبیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) شیخ عبدالحق محدث، ص ۱۶۸ (۲) ڈاکٹر محمد بشیر حسین، فہرست مخطوطات شیرانی، ج ۲، ظفر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۲۷۲ (۳) یوسف الیان سرکیس، معجم المطبوعات العربیہ والمعربۃ، ج ۱، مطبعہ سرکیس، ۱۹۲۸ء، ص ۱۹۰ (۴) کامل حسین، فہرست سبحان اللہ اورینٹل لائبریری، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، مسلم یونی ورسٹی پریس، ۱۹۳۰ء، ص ۵، ڈاکٹر بشیر حسین، ص ۱ (۵) ڈاکٹر میاں محمد سعید، تذکرہ مشائخ شیراز ہند، اسلامک بک پبلیشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۲۰۱ (۶) اختر راہی، "کتب خانہ فاضلیہ کے چند نوادر" فکر و نظر، اسلام آباد، ج ۱۳، شمارہ ۴، ص ۳۵۵ (۷) خدا بخش اور کتب خانہ آصفیہ میں اس کے مطبوعہ نسخے موجود ہیں۔

۱- ترکیب نحوی کا اہتمام، قاضی صاحب کو فن نحو سے خاص مناسبت تھی، چنانچہ تفسیر میں بھی انہوں نے اس کا خاص اہتمام کیا ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا بیان ہے کہ اس تفسیر میں تراکیب نحو اور وصل و فصل کے معانی واضح طور پر بیان کیے گئے ہیں، البتہ عبارتوں میں سجع و قوافی کی رعایت میں تکلف سے کام لیا گیا ہے، جس کو مختصر اور واضح کرنے کی ضرورت تھی (۱)۔

۲- مسایل فقہ کا التزام، اس تفسیر کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علمی موشگافیوں کے بجائے عملی باتوں پر خاص توجہ کی گئی ہے، چنانچہ فقہ کے مسایل تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

قاضی صاحب کی تفسیر کا کوئی نسخہ ہم کو دست یاب نہیں ہے ورنہ اس کی خصوصیات پر تفصیل سے بحث کی جاتی، تاہم مثال کے طور پر ان کا ایک نمونہ تفسیر درج جاتا ہے جس سے ان کے طریقہ تفسیر کا اندازہ ہوگا، وہ "تلک حدود اللّٰہ فلا تقربوھا" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

تلک اشارت است باموِر مذکورہ، فا سببیہ است برائے ترتب سبب بر مسبب جملہ تلک حدود اللّٰہ تزنیل است، معنی این است بیانہا ی حل وحرمت حدودی است کہ تعیین کردہ خدا است وتجاوز کردن ازاں ناروا است، چوں حدود تعین شدہ. بس بکرانہ حرام نزدیک می شوند نباید کہ درو در آئید و بکرانہ حلال مروید کہ ازان بیروں آئید و در حرام رفتید۔ (۲)	تلک سے مذکورہ امور کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، "ف" سببیہ ہے تاکہ سبب کو مسبب سے جوڑ دے، جملہ تلک حدود اللّٰہ تزنیل ہے اور اس کے معنی یہ ہوئے کہ حرام وحلال اللّٰہ کی متعین کردہ حدیں ہیں جن سے تجاوز کرنا درست نہیں ہے اور جب حد متعین ہوگئی تو اس کے کنارے جانا بھی درست نہیں، چہ جائیکہ اس میں ملوث ہو جاؤ، اسی طرح حلال کے دائرہ سے بھی ذرہ برابر بھی نہ ہٹو کہ اس میں بے احتیاطی کے نتیجہ میں حرام کے شکار ہو جاؤ گے۔



(۱) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۶۹ (۲) ڈاکٹر قاضی نبی بخش بلوچ، "مذہب" تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، ج ۳، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۷۲ - ۷۳

حاجی عبدالوہاب بخاری

نام ونسب اور خاندانی حالات نام عبدالوہاب، لقب حاجی، والد بزرگوار کا نام محمد رفیع الدین اور والدہ ماجدہ کا نام فاطمہ تھا، سید جلال بخاری کے خاندان سے ہیں جن کے واسطہ سے ان کا نسبی تعلق حضرت حسینؓ سے جاملتا ہے۔

سید جلال بخاری کے دولڑکے تھے، سید احمد اور سید محمود، مشہور بزرگ مخدوم جہانیاں سید محمود کے فرزند تھے اور اسی خاندان میں حاجی صاحب کا ننہال تھا اور خود حاجی صاحب سید جلال بخاری کے بڑے صاحب زادے سید احمد کے خاندان میں پیدا ہوئے۔

ولادت ۸۶۹ھ/۱۴۶۴ء میں بہ مقام اچھ پیدا ہوئے اور وہیں پرورش و پرداخت ہوئی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا بیان ہے کہ ان کا ابتدائی زمانہ ملتان میں گزرا ہے۔

تعلیم وتربیت ان کی تعلیم وتربیت کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا ہے البتہ ان کے ایک استاذ سید صدرالدین بخاری کا نام تذکرہ نگاروں نے لیا ہے جو ان کے خسر اوران کے مربی بھی تھے(۱)۔

سفر حجاز شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ حاجی صاحب ابتداء عمر ہی سے صاحب علم وعمل تھے اوران پر حال واستغراق کی کیفیت طاری رہا کرتی تھی، زمانہ طالب علمی میں ایک روز اپنے مرشد سید صدرالدین بخاری سے یہ سنا کہ ”اس وقت جہاں میں سب سے بڑی دو نعمتیں ہیں جن سے بڑھ کر دنیا کی کوئی نعمت نہیں مگر افسوس کہ لوگ ان کی قدر نہیں جانتے اوراس کے لیے کوشاں نہیں ہوتے، ایک تو مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کا وجود مبارک اور دوسرے

(۱) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۴، دایرۃ المعارف، حیدرآباد، ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء، ص ۲۲۳ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۰۲

کتاب اللہ''۔

استاذ کی یہ بات سنتے ہی حاجی صاحب نے مدینہ منورہ جانے کی نیت کر لی اور ان سے اجازت لے کر خشکی کے راستہ سے وہاں پہنچے اور روضۂ اطہر ﷺ کی زیارت کے بعد اپنے وطن واپس ہوئے۔

سکونت دہلی اس دور میں ملتان کے حالات نہایت پر آشوب تھے، ملکی نظم ونسق کی ابتری کی بنا پر وہاں کے بہت سے لوگ سلطان بہلول لودھی اور سکندر لودھی کے عہد حکومت میں دہلی چلے آئے، حاجی صاحب بھی مصائب روزگار سے عاجز ہو کر سکندر لودھی کے زمانہ میں دہلی وارد ہوئے (۱)۔

دہلی میں قیام کے دوران ان کو وہاں کے ایک مجذوب بزرگ شاہ عبداللہ قریشی سے خاص انس پیدا ہو گیا، یہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے بعض خاندانی بزرگ بہلول لودھی کے عہد میں دہلی چلے آئے تھے (۲)۔

حجاز کا دوسرا سفر دہلی میں قیام کے دوران انہوں نے دوسری بار حرمین کی زیارت کی اور واپسی پر دہلی ہی میں مستقل طور پر اقامت گزیں ہوئے (۳)۔

شاہان لودھی سے تعلقات تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ سلطان سکندر لودھی کو حاجی صاحب سے بے حد محبت وعقیدت تھی اور وہ ان کا بڑا قدر دان تھا (۴)، اس کے برخلاف اس عہد کے بعض معاصر تذکروں میں ہے کہ سلطان سکندر لودھی کے ایک نامناسب رویہ کی وجہ سے وہ اس سے ناراض ہو کر اپنے وطن واپس چلے گئے تھے، جس کا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سکندر لودھی داڑھی ترشواتا تھا، ایک مرتبہ حاجی صاحب نے اس کو داڑھی رکھنے کی تلقین کی جس کے جواب میں اس نے ان کی شان میں گستاخی کی، چنانچہ وہ اس سے ناراض ہو گئے اور اس کو بددعا دی اور اپنے وطن چلے گئے (۵)۔

(۱) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۰۲ (۲) ایضاً ص ۲۰۱ (۳) ایضاً ص ۲۰۳ (۴) ایضاً وعبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۲۳ ورحمان علی، ص ۱۳۸ (۵) خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات: الجمعیۃ پریس دہلی، ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء، ص ۶۸، ۶۹، بحوالہ رزق اللہ مشتاقی، واقعات مشتاقی، روٹوگراف، قلمی نسخہ برٹش میوزیم، ص ۵۲، ۵۳ھ

ممکن ہے کہ سکندر لودھی کی گستاخانہ حرکت کی وجہ سے وہ ملتان چلے گئے ہوں مگر وہ وہاں زیادہ عرصہ تک نہیں رہے، کیوں کہ شیخ نور الحق کے بیان کے مطابق وہ سلطان ابراہیم لودھی کے عہد میں دہلی ہی میں تھے اور انہوں نے ابراہیم کے باغی بھائی جلال خان کو اپنی خانقاہ میں پناہ بھی دی تھی (۱)، جلال خان حاجی صاحب کا مرید تھا، سلطان ابراہیم لودھی نے اس کو حیلہ سے وہاں سے بلوا کر مار ڈالا، حاجی صاحب کو اس کا بہت صدمہ ہوا، انہوں نے ابراہیم لودھی کے حق میں بد دعا کی، جب پانی پت کا معرکہ ہوا، جس میں ابراہیم لودھی مارا گیا اور بابر دہلی پر قابض ہوا، اس وقت حاجی صاحب بستر مرگ پر تھے اور بار بار ابراہیم کے متعلق پوچھتے تھے اور کہتے تھے کہ:

" حضرت رسالت پناہ ﷺ سر او را بریدہ بدست من دادہ اند" (۲)۔	رسول اکرم ﷺ نے اس کا کٹا ہوا سر میرے ہاتھ پر رکھ دیا ہے۔

وفات ۹۳۲ھ / ۱۵۲۵ء میں عین اسی روز وفات پائی جس دن بابر دہلی میں داخل ہوا (۳)، شیخ حاجی سے اعداد وفات نکلتے ہیں، اپنے محبوب بزرگ شاہ عبداللہ قریشی کے پہلو میں دفن کیے گئے (۴)۔

ازواج واولاد ان کے صرف ایک صاحب زادے شیخ مدثر کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے جن کا نکاح شاہ جلال شیرازی (متوفی ۹۴۴ھ / ۱۵۳۷ء) کی صاحب زادی سے ہوا تھا (۵)۔

تصنیفات حاجی عبدالوہاب چوں کہ ایک مجذوب اور صاحب حال بزرگ تھے اس لیے ان کی تصنیفات میں بھی اس کا نمایاں اثر دکھائی دیتا ہے، انہوں نے مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں:

۱۔تفسیر: یہ قرآن مجید کی ایک عجیب وغریب تفسیر ہے جس میں تقریباً پورے قرآن مجید کی تفسیر رسول اللہ ﷺ کی نعت ومنقبت اور آپ ﷺ کے ذکر وتذکرہ سے کی گئی ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ یہ تفسیر غلبہ حال اور استغراق کے عالم میں لکھی گئی ہے، اس لیے اس

(۱) خلیق احمد نظامی، ص ۱۷۴ بحوالہ نور الحق، زبدۃ التواریخ، قلمی نسخہ برٹش میوزیم، ص ۸۷ (۲) خلیق احمد نظامی ص ۲۷۴ (۳) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۲۴ (۴) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۰۲ (۵) ایضاً ص ۲۰۷۔

کے بعض مقامات پر ظاہر لفظ کی رعایت ملحوظ نہ رکھی جا سکی ہے (۱)، مولانا عبدالحئی کا کہنا ہے کہ غلبہ حال کی بنا پر اس تفسیر کا بیشتر حصہ غیر درست ہے (۲)۔

اس تفسیر کا آغاز اوائل ربیع الثانی ۹۱۵ھ / جولائی ۱۵۰۹ء میں ہوا اور ۱۷ رشوال ۹۱۵ھ / ۲۸ / جنوری ۱۵۱۰ء کو چھ ماہ اور چند ایام کے عرصہ میں یہ مکمل ہوئی (۳)، اس تفسیر کا کوئی نسخہ دست یاب نہیں ہے، البتہ شیخ عبدالحق محدث نے ''اخبار الاخیار'' میں اس کے کچھ اقتباسات نقل کیے ہیں (۴)۔

۲- رسالہ شمائل النبی ﷺ: موضوع سے پتہ چلتا ہے کہ نعت و منقبت رسول اللہ ﷺ پر کوئی رسالہ تھا۔

۳- قصائد عربی (۵)۔



(۱) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۰۳ (۲) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۲۴ (۳) ایضاً و شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۰۷ (۴) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۰۳ تا ۲۰۶ (۵) عبدالحئی، بحوالہ بالا۔

شیخ حسن محمد احمد آبادی گجراتی

نام ونسب اور خاندانی حالات حسن محمد (۱) اور ایک روایت کے مطابق جمال الدین نام تھا (۲)، والد کا نام احمد میاں جی، اور ان کی کنیت ابو صالح تھی (۳) سلسلۂ نسب یوں ہے:

حسن محمد بن احمد میاں جی بن نصیر الدین بن امجد الدین بن سراج الدین بن کمال الدین علامہ (۴)۔

مولانا رحمان علی کے بیان کے مطابق ان کے خاندان کا نسبی تعلق حضرت حسنؓ سے ملتا ہے (۵) اور یہ خاندان مدت دراز سے علم وفضل کا گہوارہ رہا ہے، شیخ کمال الدین علامہ جو شیخ حسن محمد کے مورث اعلا تھے، خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے حقیقی بھانجے اور ان کے خلیفہ تھے، وہ احمد آباد پہنچے اور مدتوں وہاں خلق خدا کو نفع رسانی کا فریضہ انجام دے کر دوبارہ دہلی واپس ہوئے اور دہلی ہی میں اپنے مرشد اور ماموں کے پہلو میں آسودہ خاک ہوئے (۶)۔

شیخ کمال الدین کے ایک فرزند شیخ سراج الدین تقوی و بزرگی میں اپنے والد کے جانشین تھے اور وہ بھی شیخ چراغ دہلویؒ سے بیعت تھے (۷)، وہ گجرات وارد ہوئے اور اپنی پوری زندگی یہیں گزاردی، ۲۱؍جمادی الاولیٰ ۸۱۷ھ/ ۹؍اگست ۱۴۱۴ء کو پیران پٹن نہروالہ میں انتقال کیا (۸)۔

(۱) غلام سرور، ج ۱، ص ۴۳۶ و رحمان علی، ص ۲۱۴ (۲) حافظ محمد حسین مراد آبادی، انوار العارفین، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۸۷۶ء، ص ۳۸۰ (۳) رحمان علی، ص ۲۱۴ (۴) غلام سرور، ص ۴۳۶ (۵) رحمان علی، ص ۱۷۳ (۶) محمد حسین، ص ۱۷۳ اور رحمان علی، ص ۲۱۴ (۷) محمد حسین، ص ۳۷۵ و مولانا ابوظفر ندوی، تاریخ اولیائے گجرات، ترجمہ مرأۃ احمدی، حمایت اسلام پریس، لاہور، ۱۹۳۳ء، ص ۱۳۹ (۸) ابوظفر ندوی، تاریخ اولیائے گجرات، ص ۱۳۹

شیخ سراج الدین کے دو بیٹے تھے، شیخ علم الدین اور شیخ امجد الدین، شیخ علم الدین خواجہ گیسو دراز کے مرید تھے (۱)، ان کے فرزند محمود راجن تھے جو اپنے عہد کے باکمال بزرگ تھے اور ان کے لڑکے جمال الدین جمن تھے جو اپنے والد کے خلیفہ اور شیخ حسن محمد کے مرشد تھے (۲)۔

شیخ امجد الدین کے صاحب زادے شیخ نصیر الدین ثانی تھے جو اپنے والد کے جانشین ہوئے اور شیخ خواجہ ان کا لقب تھا، ان ہی کے فرزند شیخ حسن محمد کے والد احمد میاں جی تھے، غرض ان کا پورا خاندان علم و فضل اور رشد و ہدایت کا سرچشمہ تھا۔

ولادت شیخ حسن محمد ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء میں احمد آباد کے ایک محلہ شاہ پور میں پیدا ہوئے (۳)۔

تعلیم و تربیت ابتدائی تعلیم و تربیت خاندان کے بزرگوں کے زیر سایہ ہوئی شیخ علی بن نور بخش سے قرآن مجید پڑھا (۴) اور سولہ برس کی عمر میں تمام علوم متداولہ سے فراغت حاصل کر لی (۵)۔

تصوف و سلوک شیخ حسن محمد کا خاندان عرصہ دراز سے مشائخ صوفیہ کا مرکز تھا اور انہوں نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس لیے ابتدا ہی سے ان پر اس کا اثر نمایاں تھا، چنانچہ چھ سال کی کم سنی ہی میں وہ اپنے والد سے بیعت ہو گئے اور جب بارہ برس کے ہوئے تو اپنے خاندانی چچا شیخ جمال الدین جمن کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے اور مجاہدہ و ریاضت کی منزلیں طے کر کے ان سے خلافت حاصل کی (۶)، شیخ جمال الدین جمن کی وفات کے بعد انیس برس کی نوعمری ہی میں وہ ان کے جانشین منتخب ہوئے جب کہ خود ان کے والد شیخ احمد میاں جی زندہ تھے، اپنے مرشد کی مسند پر بیٹھنے کے بعد ان کو غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اور اپنی وفات تک متواتر اکتالیس برس وہ اس منصب پر فائز رہے (۷)۔

سلطان محمود شہید کی قدردانی شیخ حسن محمد کو احمد آباد کے والی سلطان محمود شہید کی خاص عنایت اور توجہ حاصل تھی، سلطان کے علاوہ دوسرے امرا بھی ان کی عزت و توقیر کرتے تھے، سلطان نے ان کو احمد آباد سے متصل ایک قدیم آبادی اساورہ اور دوسرے چار گاؤں جاگیر میں دے دیے تھے (۸)، محلہ شاہ پور کا باہری حصہ اور رکن الملک کا چکلہ بھی ان ہی کی تحویل

(۱) محمد حسین، ص ۷۷۳ (۲) ایضاً، ص ۳۸۰ (۳) ایضاً (۴) ابوظفر ندوی، تاریخ اولیائے گجرات، ص ۱۳۹ (۵) محمد حسین، ص ۷۷۳ (۶) ایضاً (۷) ایضاً و رحمان علی، ص ۲۱۴ (۸) ابوظفر ندوی، تاریخ اولیائے گجرات، ص ۲۳۔

میں تھا(۱)۔

رفاہی کام شیخ حسن محمد کو علم وفضل کی دولت کے ساتھ دنیوی ثروت ونعمت بھی حاصل تھی جس کو وہ بزرگوں کی یادگاروں کو قایم کرنے اور محتاجوں کی حاجت روائی میں بے دریغ خرچ کرتے تھے، اپنے محلہ میں ایک عظیم الشان سنگی مسجد اپنے خرچ پر تعمیر کرائی جس پر ایک لاکھ روپے صرف ہوئے (۲)، یہ مسجد تقریباً آٹھ نو سال کے عرصہ میں بن کر مکمل ہوسکی پھر بھی اس کے ایک حصہ کی دیوار اور مینارے تعمیر نہ ہوسکے، تاریخ اولیاے گجرات میں ہے کہ انقلاب سلطنت کے سبب سے شیخ حسن محمد کی مالی حالت دگرگوں ہوگئی، اس لیے یہ کام ناتمام رہ گیا (۳)، بہ ظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی وفات کے سبب سے یہ کام ادھورا رہ گیا، کیوں کہ اس مسجد کی بنیاد کی تاریخ محراب کے بائیں جانب اشعار کی صورت میں کندہ ہے، جس میں بنا شیخ (۹۷۳) سے اس کی تاریخ نکالی گئی ہے، تاریخ اولیاے گجرات کی تصریح کے مطابق آٹھ نو سال میں اس کی تعمیر ہوئی، اس حساب سے ۹۸۲ھ/ ۱۵۷۴ء میں اس کا کام مکمل ہوا ہوگا اور یہی ان کا سال وفات ہے۔

وفات ۲۸/ذی قعدہ ۹۸۲ھ/۱۱/مارچ ۱۵۷۵ء کو ظہر کے وقت وفات پائی، انتقال کے وقت ان کی عمر انسٹھ برس کی تھی، اپنے آبائی قبرستان میں اپنی والدہ ماجدہ کے پہلو میں دفن کیے گئے (۴)۔

ازواج واولاد شیخ حسن محمد کے چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں، کمال الدین محمد، قطب محمد، صالح محمد، بی خدیجہ اور بی عائشہ (۵)، ان کی اولاد میں شیخ محمد ان کے جانشین ہوئے اور ان کے خاندان میں تصوف کا سلسلہ تادیر قایم رہا، شیخ یحییٰ مدنی جو بلند پایہ چشتی بزرگ گزرے ہیں، اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے (۶)۔

تصنیفات شیخ حسن محمد فقہ، تفسیر، تصوف اور دیگر علوم عربیہ کے بلند پایہ عالم تھے، انہوں

(۱) ابوظفر ندوی، تاریخ اولیائے گجرات، ص ۹۴ (۲) رحمان علی، ص ۲۱۴ (۳) ابوظفر ندوی، تاریخ اولیائے گجرات، ص ۹۴ (۴) محمد حسین، ص ۳۷۷ (۵) ابوظفر ندوی، تاریخ اولیائے گجرات، ص ۹۴ (۶) محمد حسین، ص ۳۸۱

نے متعدد گراں قدر کتابیں لکھیں جن میں صرف تین کتابوں کا ذکر ملتا ہے، ۱-تفسیر محمدی، ۲- حاشیہ بیضاوی، ۳- حاشیہ نزہۃ الارواح (۱) تفسیر محمدی کے علاوہ کوئی کتاب دست یاب نہیں ہے۔

تفسیر محمدی

یہ ایک گراں قدر تفسیری تصنیف ہے، یہ عربی میں ہے اور ایک سال کی مدت میں مکمل ہوئی، اس کی تصنیف کے دو ماہ بعد شیخ حسن محمد کا انتقال ہوا، رمضان ۹۸۲ھ/ دسمبر ۱۵۷۴ء میں یہ کتاب مکمل ہوئی اور اسی سال ذی القعدہ میں ان کا انتقال ہوا، یہ کتاب ابھی تک طبع نہیں ہوئی، اس کا ایک مکمل قلمی نسخہ کتب خانہ انڈیا آفس لندن میں موجود ہے (۲) اور ایک نامکمل نسخہ سالار جنگ لائبریری حیدرآباد میں ہے (۳)، ڈاکٹر زبید احمد کے بیان کے مطابق یہ تفسیر بہت مختصر ہے اور اس کا ایک نسخہ برلن کے کتب خانہ میں ہے (۴)۔

تفسیر محمدی کی بعض نمایاں خصوصیات

تفسیر محمدی ہندوستان کی اہم اور نمایاں تفسیروں میں شمار کی جاتی ہے، ذیل میں اس تفسیر کی بعض اہم خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱- آیتوں کے درمیان ربط کا خاص اہتمام

اس تفسیر کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آیتوں کے درمیان ربط و مناسبت کو نمایاں کیا گیا ہے، مصنف نے مقدمہ میں اس پر خاص بحث کی ہے اور اس کو اپنی اولیت بتایا ہے (۵)، تفسیر کے خاتمہ میں بھی انہوں نے اس کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

وقد اتفق اتمام هذا التفسير المشتمل على ربط كل آية بآية اخرى رباطا تاما الموسوم بالتفسير المحمدى ـ(۶)	یہ تفسیر جس کی ہر آیت دوسری آیت سے مکمل ربط پر مشتمل ہے اور جس کا نام تفسیر محمدی ہے، مکمل ہوئی۔

(۱) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۸۷ (۲) اوٹولوتھ، حوالہ سابق، ص ۲۲ (۳) محمد سالم، مقالہ تفسیر محمدی، ماہنامہ معارف، ج ۹۷، شمارہ ۲، ص ۱۴۱ (۴) ڈاکٹر زبید احمد، ہندوستان کی عربی تصانیف متعلقہ علوم قرآنیہ، روداد ادارہ معارف اسلامیہ، اجلاس دوم، منعقدہ لاہور، گیلانی پریس، لاہور، ۱۹۳۸ء، ص ۴۰۱ (۵) محمد سالم، محولہ بالا، ص ۱۴۲ (۶) اوٹولوتھ، ص ۲۲

اس تفسیر میں ربط و مناسبت کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ مسائل کی تشریح میں بھی اس کی رعایت کی گئی ہے، جس میں بعض موقعوں پر مصنف کی تشریح سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے، مثلاً وہ آیت ''واعلموا انما غنمتم من شئی فان للّٰه خمسه......'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وانما جعلت الغنيمة اخماسا	مال غنیمت کے پانچ حصے مقرر کیے گئے
لانه يرتب العسكر على خمسة	کیوں کہ فوج پانچ حصوں میں تقسیم کی
مقدمة وقلب وساقة وجناحين	جاتی ہے، مقدمہ، قلب، پچھلا حصہ اور
فجعل سبحانه خمسها	دونوں بازو، چنانچہ اللہ نے پانچواں حصہ
لنفسه ۔(۱)	اپنا مقرر فرمایا۔

غرض ربط و مناسبت ہی تفسیر محمدی کا اصل موضوع ہے۔

۲۔مسائل کے استخراج میں باریک بینی اس تفسیر میں مسائل کی توضیح خوب صورت اور منطقی انداز میں کی گئی ہے اور ان میں جا بجا لطیف نکتے بیان کیے گئے ہیں، مثلاً وہ آیت ''وما اهل به لغير الله'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

يعني ما رفع به الصوت عنهم	اس سے مراد وہ صدا ہے جو بتوں کے
عند ذبحه للضم فانه وان	لیے ذبح کرتے وقت وہ لگاتے تھے
خرج الدم منه ولكن الرطوبات	کیوں کہ اس صورت میں بھی خون فاسد
وما بقي منه باق في ذالك	نکل جاتا ہے مگر اس کے اندر کی دوسری
ولم يخرج منه فلابد له من	چیزیں باقی رہتی ہیں، اس لیے ضروری
مطهر يوثر في اعماقه	ہے کہ کوئی ایسی پاک کرنے والی شئے ہو
الباطنة التي لا يصل اليها	جو اس کو اندر سے صاف کر دے اور اس
شئي من هذا العالم مع بقائه	عالم کی کوئی چیز بایں صورت اس کے اندر
منتفعا به وانما قلنا ذالك	داخل نہیں ہو سکتی کہ اس کے داخلہ کے بعد

(۱) محمد سالم، تفسیر محمدی، ص ۱۴۵

لان النار یصل ولکن لایبقی بعد وصوله منتفعا به فطهره هو اسمه تعالی یجعله فما لم یذکر علیه اسمه تعالی غیر طاهر۔ (۱)

وہ چیز قابل انتفاع بھی ہو، ہم نے یہ بات اس لیے کہی ہے کہ آگ بھی جسم میں داخل ہوسکتی ہے مگر اس کے بعد انتفاع ناممکن ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذبیحہ کی تطہیر کے لیے اللہ تعالیٰ کا نام لینا ضروری ہے، اس کے بغیر ذبیحہ پاک نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح آیت قصاص کی تفسیر میں وہ لکھتے ہیں:

ولم ینظر الی الرفعة الظاهرية ولم یحکم لقتل الحر بالعبد اذا کان المقتول عبد الشرفاء والقاتل من الاراذل وکذا فی الذکر والانثی فاعلموا انه لاعبرة للشرف وهذه الآیة لیست بدالة علی انه لا یقتل الحر بالعبد والذکر بالانثی فانها مسوقة لبیان عدم الاعتداد بالشرف الظاهری ولدفع الرذائل وحدوث الشرف الباطنی۔ (۲)

قصاص میں ظاہری عزت وشرف کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، چنانچہ غلام کے بدلہ میں آزاد کو نہیں قتل کیا جاسکتا جب کہ مقتول شرفا کا غلام ہو اور قاتل پست طبقہ سے تعلق رکھتا ہو، اسی طرح مرد وعورت کے قصاص میں کوئی امتیاز درست نہیں ہے کیوں کہ ظاہری شرف کا کوئی اعتبار نہیں ہے بلکہ معتبر ایمان وعمل ہے اور وہی اصل شرف ہے، اس آیت کا مدلول یہ نہیں ہے کہ غلام کے بدلہ میں آزاد اور عورت کے بدلہ میں مرد قتل نہ کیا جائے بلکہ اس میں دراصل ظاہری مجد وشرف کے غیر معتبر ہونے، رذائل سے مجتنب رہنے اور شرف باطنی پیدا کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

۴- اقوال ائمہ سے استدلال اس تفسیر کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں ائمہ کے اقوال اور ان کی آرا کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے اور اس بارے میں مصنف نے کسی مخصوص مسلک کی

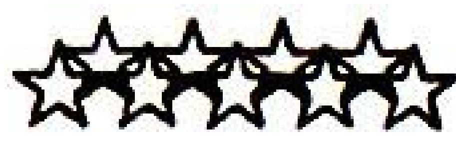
(۱) محمد سالم، تفسیر محمدی، ص ۱۴۳ (۲) ایضاً، ص ۱۴۴۔

پیروی نہیں کی ہے (۱)

۴- انبیا کرام کے واقعات کی تفصیل　اس میں انبیا کرام کے حالات وواقعات بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، حضرت یوسفؑ کے بیان میں قرآن مجید میں ''وھم بھا لولا ان رای برھان ربہ'' کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، مفسرین نے ''وھم بھا'' کی مختلف توجیہیں کی ہیں، مگر شیخ حسن محمد نے بڑی لطیف توجیہ کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

لکن للمیل الطبعی لا للقصد الاختیاری فان ذالک مما لا یدخل تحت التکلیف اذ الاختیار فیہ وکان صرف ذالک السوء عن یوسفؑ من ربہ لا من نفسہ (۲)	اس سے فطری اور طبعی میلان مراد ہے قصد واختیار سے نہیں کیوں کہ طبعی میلان تکلیف میں داخل نہیں ہے، اس کا تعلق قصد واختیار سے ہے، یعنی حضرت یوسفؑ کا اس برائی سے رک جانا من جانب اللہ تھا، جس میں ان کی ذات کو دخل نہ تھا۔

اس کے علاوہ اس تفسیر میں مختلف غزوات کی تفصیل اور آیات وسور کے شان نزول کی وضاحت بھی کی گئی ہے اور یہ تفسیر بجا طور پر ہندوستان کی اہم تفسیروں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔



(۱) محمد سالم، تفسیر محمدی، ص ۱۴۶ (۲) ایضاً، ص ۱۴۸۔

شیخ مبارک ناگوری

شیخ مبارک بن خضر ناگوری عہد اکبری کے ممتاز عالم دین تھے، ان کے اسلاف کا اصل وطن یمن تھا، ان کے خاندانی سلسلہ میں شیخ موسیٰ نام کے ایک بزرگ تھے جو یمن سے سیرو سیاحت کی غرض سے نکلے اور ۸۰۰ھ/ ۱۳۹۷ء میں سیوستان سندھ کے ایک قصبہ ''ایل'' میں آکر آباد ہوئے، دسویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی میں ان کے پر پوتے شیخ خضر کو ہندوستان کے صوفیا اور بزرگوں سے ملاقات کا شوق دامن گیر ہوا، چنانچہ وہ اپنے اعزہ واقربا کے ہمراہ اجمیر کے قریب ''ناگور'' وارد ہوئے، یہ مقام ان کو اس قدر پسند آیا کہ انھوں نے یہیں بود و باش اختیار کرلی اور اس مقام کے بزرگوں میں شیخ یحییٰ اچی جانشیں مخدوم جہانیاں گشت، شیخ عبدالرزاق قادری بغدادی ورشیخ یوسف سندھی سے رُوحانی فیوض حاصل کیا۔

ولادت اور تعلیم شیخ مبارک ۹۱۱ھ/ ۱۵۰۵ء میں پیدا ہوئے، چار برس کی عمر ہوئی تو تعلیم شروع کی، وہ نہایت ذکی وفطین تھے، فکروشعور کی منزل میں پہنچے تو مزید تعلیم کے لیے گجرات کے شہر احمد آباد کا رخ کیا، اس زمانہ میں یہ شہر علوم وفنون کا مرکز تھا، جہاں علما وفضلا اور ارباب کمال کی علمی اور تدریسی سرگرمیاں اپنے شباب پر تھیں، چنانچہ وہ وہاں علامہ جلال الدین دوانی کے دو مایہ ناز شاگرد مولانا عماد الدین طارمی اور ابوالفضل خطیب گازرونی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور نہایت کم عمری میں جملہ علوم وفنون کی تحصیل کرلی (۱)، ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' میں لکھا ہے کہ ''علوم متداولہ کے علاوہ اسالیب تصوف واشراق کی تعلیم بھی حاصل کی، ابن عربی، ابن فارض اور صدرالدین قونوی کی بہت سی کتابیں پڑھیں''۔ (۲)

(۱) سعید احمد مارہروی، بوستان اخیار، ابوالعلائی، اسٹیم پریس، آگرہ، ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۶ء، ص ۱۴۷ تا ۱۵۱

(۲) ابوالفضل، آئین اکبری، ج ۳، نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۲ء، ص ۲۰۳۔

غرض شیخ مبارک نے ابتداء عمر ہی میں علم وفضل میں اس درجہ کمال حاصل کرلیا کہ ان کے ہم عصروں میں ان کا کوئی حریف نہ تھا، وہ علمی مجالس اور تحقیقی محفلوں میں شریک ہونے لگے اوران کے اسلوب بحث اور انداز گفتگو سے اس دور کے بڑے بڑے علما دنگ رہ جاتے، تصوف سے بھی ان کو لگاؤ تھا، شیخ عمر تیتوی اور شیخ یوسف وغیرہ مشائخ طریقت کی مجلسوں میں شرکت کرتے اور سلسلہ شطاریہ، چشتیہ اور سہروردیہ میں اجازت بھی حاصل کی۔(۱)

آگرہ میں آمد اپنے مرشد شیخ یوسف کے حکم کی تعمیل میں وہ مزید تعلیم کے لیے آگرہ پہنچے، وہاں میر رفیع الدین الایجی الشیرازی حدیث کے بلند پایہ استاد تھے جو شیخ سخاوی مصری شاگرد علامہ ابن حجر عسقلانی کے شاگرد تھے، شیخ مبارک نے حدیث کا درس ان ہی سے لیا اور اس طرح وہ بدو واسطہ حافظ ابن حجر کے شاگرد ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ سیر و رجال کا خاص ذوق ان کو ملا تھا۔

آگرہ میں شیخ مبارک کی آمد انتالیس برس کی عمر میں ۶ رمحرم الحرام ۹۵۰ھ/ بہ مطابق ۱۱راپریل ۱۵۴۳ء کو بدھ کے دن ہوئی، جس وقت انہوں نے وہاں قدم رکھا، ان کو وہاں کے ایک بزرگ شیخ علاء الدین مجذوب نے بشارت دی کہ تم اس شہر میں قیام کرو، یہ شہر تمہارے لیے مبارک ہے، آگرہ میں ان کا قیام میر رفیع الدین کے مدرسہ میں تھا، کچھ دنوں بعد انہوں نے شیخ چندن قریشی کی دختر سے نکاح کرلیا اور اپنے استاذ میر رفیع الدین کے محلہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور ان کے اس قدر مقرب بن گئے کہ ان کے انتقال کے بعد ان کی مسند درس پر متمکن ہوئے اور تقریباً پچاس سال تک تشنگانِ علم کو سیراب کرتے رہے۔(۲)

اخلاق وعادات اور تلون مزاجی ابتدا میں شیخ مبارک کے اندر وہ تمام صفتیں موجود تھیں جو علمائے حق کا خاصہ ہیں، وہ عادات واطوار کے لحاظ سے نہ صرف زاہد ومتقی تھے بلکہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر بھی سختی سے عمل پیرا تھے مگر بعد میں حالات زمانہ کے اثر سے ان میں ایسا تغیر پیدا ہوا کہ وہ نشانہ تنقید بن گئے، مشہور مورخ ملا عبد القادر بدایونی جو ان کے شاگرد ہیں اور ان کے فضل وکمال کے معترف بھی ہیں، انہوں نے ان کی بہت سی بشری کمزوریوں کا ذکر کیا ہے جو ان میں بعد میں پیدا ہوگئی تھیں، وہ لکھتے ہیں:

(۱) سعید احمد مارہروی، ص ۱۴۸ (۲) ایضاً ص ۱۴۷۔

''شیخ مبارک اپنے عہد کے جلیل القدر عالم تھے، تقوی، توکل اور صلاح میں ممتاز تھے، ابتدا میں انہوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے، ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہر وقت خیال رکھتا تھا، اگر ان کی مجلس میں کوئی شخص سونے کی انگوٹھی یا ریشم یا سرخ و زرد موزے یا کپڑے پہن کر آجاتا تو اس کو فوراً مجلس ہی میں ان چیزوں کو اتار دینے کا حکم دیتے، اسی طرح جن لوگوں کا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے ہوتا تھا ان کو اسے پھاڑ دینے کا حکم دیتے، اگر راستہ چلتے کسی مقام پر راگ یا نغمہ کی بھنک کان میں پڑ جاتی تو تیزی سے قدم بڑھا کر نکل جاتے تھے، مگر آخر میں ان کا یہ حال ہو گیا تھا کہ راگ، گانا یا ساز سنے بغیر ان کو سکون نہیں ملتا تھا، ان کا مسلک و طریقہ ہمیشہ بدلتا رہتا تھا، طبیعت میں بڑا تلون تھا، پٹھانوں کے دور میں کچھ عرصہ تک شیخ علائی کے ساتھ رہے اور جب اکبر کے عہد میں نقشبندی صوفیوں کو اقتدار حاصل ہوا تو اس سلسلہ سے وابستہ ہو گئے، کچھ مدت تک ہمدانی مشائخ سے متعلق رہے اور آخر میں جب عراقیوں نے دربار میں اپنا رنگ جما لیا تو ان ہی کے رنگ میں رنگ گئے گویا لوگوں کی عقلوں اور طبیعتوں کے مطابق وہ اپنے عمل میں تبدیلی لاتے رہے۔

ہمیشہ دینی علوم کی تدریس میں مشغول رہا کرتے، ہندوستان کے علما کے برخلاف ان کو شاعری، معمہ گوئی اور مختلف فنون میں بڑی دست رس حاصل تھی، تمام علوم پر ان کی یکساں نگاہ تھی، خاص طور سے تصوف پر عبور حاصل تھا، شاطبی مکمل حفظ تھی اور اس کے درس دینے کا حق انہیں کو پہنچتا تھا، قرآن مجید کی دسوں قرأت کے حافظ و قاری تھے، کبھی بادشاہ کے محل میں جانا پسند نہیں کیا، نہایت خوش گفتار اور صاحب مجلس بر رگ تھے''۔

شیخ مبارک کی ان متضاد خصوصیات کا ذکر ملا عبد القادر نے ان لفظوں پر ختم کیا ہے:

''ان کے مثل جامع عالم پھر نظر نہیں آیا''۔(۱)

(۱) عبد القادر بدایونی، منتخب التواریخ، ج ۳، کالج پریس، کلکتہ، ۱۸۶۹ء، ص ۷۳-۷۴۔

خواجہ نظام الدین بخشی نے ''طبقات اکبری'' میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

''از فحول علمائے روزگار و مشائخ کرام بود، در توکل شانے عظیم داشت''۔(۱)

صاحب اخبار الاصفیاء جو شیخ مبارک کے نواسے ہیں لکھتے ہیں کہ:

''ان کے کتب خانہ میں پانچ سو کتابیں خود ان کے قلم سے لکھی ہوئی موجود تھیں''۔(۲)

علما کی مخالفت اور شاہی عتاب جلال الدین محمد اکبر کے ابتدائی عہد حکومت میں جاہ طلب علما کا بہت زور تھا اور یہ طبقہ شیخ مبارک اور ان کے لڑکوں سے بہت نالاں تھا اور ہمیشہ ان کے درپے آزار رہتا تھا جس کی وجہ سے کچھ دنوں کے لیے شیخ مبارک کو آگرہ چھوڑنا بھی پڑا، ان لوگوں کے ہاتھوں اس خاندان کو جو مصیبتیں اٹھانی پڑیں ان کا مفصل تذکرہ ابوالفضل نے ''اکبرنامہ'' کے آخر میں کیا ہے، ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی مختصر مگر جامع الفاظ میں اس کی روداد لکھی ہے، ان کا بیان ہے کہ جن دنوں میر جیش اور دوسرے اہل بدعت گرفتار اور قتل ہوئے، انہیں ایام میں شیخ عبدالنبی صدرالصدور اور مخدوم الملک وغیرہ نے مل کر بادشاہ کے کان بھرے کہ شیخ مبارک مہدوی ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ اہل بدعت یعنی شیعہ بھی ہے، خود گمراہ ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا رہتا ہے، یہ کہہ کر ان لوگوں نے بادشاہ سے برائے نام اجازت لی اور شیخ مبارک کا خاتمہ کرنے کے درپے ہوگئے، انہوں نے محتسبوں کو روانہ کیا کہ شیخ کو دربار میں حاضر کریں مگر وہ اپنے بچوں سمیت روپوش ہوگئے اور محتسب ان کی مسجد کا منبر توڑ کر واپس لوٹ آئے۔(۳)

ابوالفضل نے نہایت تفصیل سے لکھا ہے کہ اس کے بعد کس طرح ان کا خاندان دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرا، ملا عبدالقادر لکھتے ہیں کہ شیخ سلیم چشتی اور مرزا عزیز کوکہ نے اکبر کے سامنے شیخ مبارک کی درویشی اور ان کے علم و فضل کی تعریف کی تو اس نے ان کو سزا دینے کا خیال ترک کردیا اور ان کو دوبارہ اپنے گھر واپس آنے کی اجازت دے دی۔

(۱) نظام الدین بخشی، طبقات اکبری، بشپ مشن پریس، کلکتہ، بدون تاریخ، ص ۲۷۴ (۲) اخبار الاصفیاء، قلمی
(۳) ملا عبدالقادر بدایونی، ج ۲، ص ۱۹۸-۱۹۹۔

۱۵۶۷ء میں شیخ مبارک کا بڑا بیٹا فیضی اپنی شاعری کے ذریعہ اکبر کے دربار میں پہنچا اور مارچ ۱۵۷۴ء میں ان کا دوسرا بیٹا ابوالفضل بھی دربار میں میر منشی مقرر ہوا، ان دونوں بھائیوں کے آنے کے بعد درباری علما کے چراغ ٹمٹمانے لگے اور شیخ مبارک کے خاندان کو اکبری دربار میں بڑا عروج حاصل ہوا۔

علما کے اختیارات کے بارے میں محضر کی تیاری

۱۵۷۹ء میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے علما کے اختیارات کے مسئلہ کو نہایت نازک بنا دیا اور اسی واقعہ کے بعد شیخ مبارک کو دربار شاہی میں خاص مرتبہ و مقام حاصل ہوا، واقعہ یہ ہوا کہ متھرا کے قاضی عبدالرحیم نے ایک مسجد تعمیر کرنے کے لیے خام مسالہ جمع کیا تھا، جس پر ایک مقامی دولت مند برہمن نے قبضہ کر لیا اور اس کو ایک مندر کی تعمیر میں صرف کر دیا، جب قاضی اور دوسرے لوگوں نے اس کو منع کیا تو اس نے پیغمبر اسلام ﷺ کو برا بھلا کہا اور مذہب اسلام پر ناروا حملے کیے، قاضی یہ شکایت لے کر شیخ عبدالنبی صدر الصدور کے پاس پہنچے، شیخ عبدالنبی نے برہمن کو بلا بھیجا مگر وہ حاضر نہ ہوا، چنانچہ دربار شاہی کی جانب سے ابوالفضل اور بیربل بھیجے گئے، جو جا کر اس برہمن کو لائے اور ابوالفضل نے اس امر کی تصدیق کی کہ برہمن نے رسول اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے، اب اس برہمن کو سزا دیے جانے کا مسئلہ درپیش ہوا جس میں علما کے درمیان اختلاف ہو گیا، بعض کا کہنا تھا کہ اہانت نبوی ﷺ کی شرعی سزا موت ہے اور دوسرے کہتے تھے کہ ذمی اگر پیغمبر کی شان میں بے ادبی کرے تو عہد شکنی اور ابراء ذمہ جایز نہیں، اس لیے قتل کے علاوہ کوئی اور سزا دی جا سکتی ہے، شیخ عبدالنبی نے اس قضیہ میں بادشاہ سے استصواب کیا، بادشاہ نے کہا کہ یہ خالص شرعی معاملہ ہے اس لیے علما اس کے متعلق فیصلہ کریں، غرض علما کی کشمکش میں معاملہ طول پکڑتا چلا گیا اور دوسری جانب بادشاہ کی راج پوت بیگمات بھی اس برہمن کی رہائی کے لیے کوشاں تھیں، بالآخر شیخ عبدالنبی نے برہمن کے قتل کا فیصلہ سنا دیا اور وہ قتل کر دیا گیا، اس پر محل میں ایک طرف بیگمات نے اور باہر دوسرے لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ بادشاہ نے ان علما کو اتنا سر چڑھا رکھا ہے کہ وہ بادشاہ کی مرضی کے برخلاف لوگوں کو قتل کرتے رہتے ہیں۔

شیخ مبارک خودسر علما کے رویہ کی بنا پر برسوں سے بادشاہ کو یہ مشورہ دے رہے تھے کہ

بادشاہ عادل احکام ملکی کی طرح احکام شرعی کے اجرا ونفاذ میں جھوٹی شہرت کے حامل علما کی رائے ومشورہ کا محتاج نہیں ہے، اس لیے بادشاہ کو دونوں منصب اپنی تحویل میں لے لینے چاہئیں، اس واقعہ کے بعد بادشاہ نے ان سے علما کے اختیارات کے سلسلہ میں گفتگو کی تو انہوں نے کہا کہ بادشاہ عادل خود امام وقت اور مجتہد زمانہ ہے اور بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ اجتہاد کا دعوا کرے اور علما سے محضر طلب کرے اور خود شیخ مبارک نے آیات وروایات کی روشنی میں ایک محضر مرتب کیا۔(۱)

محضر کے مضمون میں یہ صراحت موجود تھی کہ امام عادل کو علما اور مجتہدین سے زیادہ اختیارات محض ان ہی اختلافی امور میں حاصل ہوں گے جو نص شرعی کے مخالف نہ ہوں اور عوام کی ترقی کا باعث ہوں، چنانچہ علما کا ایک جلسہ بلایا گیا جس میں بحث وتمحیص کے بعد محضر کے مضمون پر علما کے دستخط ثبت ہوئے، مخدوم الملک، شیخ عبد النبی، قاضی جلال الدین، قاضی خان بدخشی، میران صدر جہاں اور شیخ مبارک جیسے اصحاب علم وفضل نے اس مضمون پر دستخط کیے۔

اس محضر کا منفی پہلو یہ ہوا کہ اس میں جو شرایط رکھی گئی تھیں، عملی طور پر ان کی پابندی نہیں ہوئی اور بجائے اس کے کہ اس سے ملک کی اصلاح ہوتی اکبر نے خود شریعت کی بے حرمتی کرنی شروع کردی اور خوشامدی درباری اس کی ہر نئی بات کی تایید میں نص شرعی اور اجماع کے برعکس کوئی روایت یا من گھڑت قول پیش کردیتے اور اس سلسلہ میں شیخ مبارک کے دونوں بیٹے فیضی اور ابو الفضل نے زبردست کردار ادا کیا۔

آخری عمر کا کارنامہ آخر عمر میں شیخ مبارک کی بصارت کمزور ہوگئی تھی اور وہ مطالعۂ کتب سے معذور ہوگئے تھے، اسی زمانہ میں انہوں نے اپنی تفسیر قرآن املا کرائی جو چار ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی اور جس کا نام ''منبع عیون المعانی ومطلع شموس المثانی'' رکھا، ان کی زندگی کا یہ بڑا کارنامہ ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ان کا دینی مزاج پھر اپنی اصلی حالت پر لوٹ آیا، کیوں کہ آخری ایام میں وہ ابن الفارض کا تائیہ، بصیری کا قصیدہ بردہ اور دوسرے نعت ومنقبت رسول ﷺ کے قصاید پڑھتے رہتے تھے جو ان کو زبانی یاد تھے۔

وفات ۱۷/ذی القعدہ ۱۰۰۱ھ/ ۵/اگست ۱۵۹۳ء کو بہ مقام لاہور وفات پائی، آگرہ میں

(۱) ملا عبد القادر بدایونی، ج ۳، ص ۸۰ تا ۸۳۔

سپرد خاک کیے گئے، فیضی نے ''فخر الکمل'' اور ملا عبد القادر بدایونی نے ''شیخ کامل'' سے مادہ تاریخ نکالا ہے۔

اولاد شیخ مبارک کے سات فرزند پیدا ہوئے اور یہ تمام علم وفضل میں نمایاں اور ممتاز تھے، بالخصوص فیضی اور ابو الفضل تو یگانہ روزگار تھے، ساتوں کے نام حسب ذیل ہیں: ۱- شیخ ابو الفیض فیضی فیاضی، ۲- شیخ ابو الفضل، ۳- شیخ ابو الخیر، ۴- شیخ ابو البرکات، ۵- شیخ ابو المکارم، ۶- ابو تراب، ۷- ابو الحامد۔

تفسیر مبارک کی خصوصیات شیخ مبارک کی تفسیر کا ذکر نظام الدین بخشی، ملا عبد القادر بدایونی، شیخ فرید بھکری اور ان کے علاوہ دوسرے متاخرین مصنفین کی کتابوں میں ملتا ہے مگر کچھ دنوں پہلے تک اس تفسیر کے کسی نسخہ کا پتہ نہیں چلتا تھا، ڈاکٹر محمد سالم قدوائی قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اس تفسیر کو ڈھونڈ نکالا، ان کو اس کا ایک قلمی نسخہ جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے، کتب خانہ ناصریہ لکھنؤ میں ملا، اس نسخہ کی حصولیابی کے بعد اکثر مصنفین کے اس عام خیال کی تردید ہوئی کہ اس تفسیر کا نام ''منبع العیون'' یا ''منبع نفائس العیون'' تھا کیوں کہ اس نسخہ کے سرورق پر تفسیر کا نام ''منبع عیون المعانی و مطلع شموس المثانی''[۸] درج ہے، اس کی پہلی جلد کے چند اوراق غایب ہیں اور پانچوں جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد تقریباً تین ہزار ہے۔

تفسیر کے مقدمہ میں شیخ مبارک نے اپنی سرگذشت بھی بیان کی ہے، لاہور میں آمد اور قیام کا ذکر کیا ہے اور اپنے عہد کے چند بزرگوں اور اصحاب علم کا تذکرہ بھی کیا ہے، خود اپنی تعلیم، اساتذہ اور اپنے مذہب و مسلک کی بھی وضاحت کی ہے اور ان علما کا ذکر کیا ہے جن سے انہوں نے استفادہ کیا ہے، آگرہ کے بزرگوں میں شیخ عطاء الدین مجذوب اور شیخ رفیع الدین کا خاص طور پر نام لیا ہے، پھر اس تفسیر کی غرض وغایت کی وضاحت کی ہے اور اس کی بعض اہم خصوصیات گنائی ہیں۔

نظم قرآن اور قرأتوں کا اہتمام اس تفسیر کی بنیادی خصوصیت شیخ مبارک نے یہ تحریر کی ہے کہ انہوں نے اس میں وجوہ نظم قرآن اور قرأت عشرہ اور اس کے متعلقات کو پیش نظر رکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''میں اس کتاب میں وجوہ نظم قرآن، قرأت عشرہ، انواع وقوف و

فواصل آیات کا ذکر کروں گا، نیز علماے راسخین، حکما اور صاحب کشف عارفین نے جو معانی و مطالب بیان کیے ہیں انہیں بتاؤں گا، جملوں میں ربط اور آیتوں اور سورتوں کے درمیان جو مناسبت ہے اسے واضح کروں گا"۔(۱)

شیخ مبارک اپنی تفسیر میں کسی سورہ کی ابتدا کرتے ہیں تو آغاز ہی میں اس کا مضمون بیان کر دیتے ہیں تاکہ اس سورہ کے مطالب ذہن نشین ہو جائیں، پھر اس کا نظم اور وجہ نظم بھی بیان کرتے ہیں، مثلاً وہ سورہ والضحیٰ کا ربط سورہ واللیل سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سورہ واللیل میں حضرت ابوبکرؓ کی تعریف کی گئی ہے اور سورہ والضحیٰ میں رسول اللہ ﷺ کی نعت بیان کی گئی ہے"۔(۲)

مقدمہ تاریخ قرآن شیخ مبارک نے علوم قرآنی سے متعلق ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں یہ وضاحت کی ہے کہ عرب کون تھے اور سب سے پہلے عربی زبان کس نے استعمال کی، علاوہ ازیں عربی زبان کی فضیلت، نزول قرآن کا ذکر، سورتوں کی تنزیل و ترتیب، قرائتوں کا اختلاف، الفاظ کی کتابت، مفسرین کے انداز بیان، اہل لغت و فصحا کے اسالیب وغیرہ پر مفصل اور جامع بحث کی ہے جس سے ان کی غیر معمولی لیاقت کا پتہ چلتا ہے۔

اسما سور کی توجیہ و تشریح شیخ مبارک نے سورتوں کے مختلف ناموں کی وضاحت بھی کی ہے، چنانچہ انہوں نے سورہ فاتحہ کے تیس نام تحریر کیے ہیں اور ہر نام کی الگ الگ توجیہ کی ہے اور اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ یہ نام کیوں رکھا گیا، وہ پہلے سورہ کا اصل نام لکھتے ہیں پھر یہ بتاتے ہیں کہ اس کے کتنے اور نام ہیں، یہ سورہ مکی ہے یا مدنی اور اس کے حروف و آیات کی تعداد کے ساتھ یہ بھی بتاتے جاتے ہیں کہ کہاں وقف لازم ہے، کتنے رکوع ہیں اور سورہ کا مضمون کیا ہے۔(۳)

احکام و مسائل کی تشریح شیخ مبارک نے بنیادی اور روزمرہ کے مسائل و احکام کی وضاحت بھی تفصیل سے کر دی ہے، روزہ کی فرضیت کے بیان میں انہوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ اس کی فضیلت اور اہمیت بیان کی ہے اور اس کے مسائل بھی تفصیل سے لکھے ہیں، اسی طرح وضو، نماز اور حج وغیرہ کے مسائل پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔

(۱) ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، ہندوستانی مفسرین، ص ۵۴ (۲) ایضاً ص ۵۷-۵۸ (۳) ایضاً ص ۵۴ تا ۵۶۔

مراجع تفسیر اس تفسیر میں شیخ مبارک نے قدما کی تفسیروں سے مدد لی ہے اور اپنے ماخذ میں طلبی، غسانی اور زاہدی کا نام لیا ہے۔(۱)

انبیا کے واقعات کا ذکر اس تفسیر میں انبیا کرام کے واقعات بھی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، البتہ غلط اور لایعنی روایات سے اجتناب کیا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں خاص طور پر وہی روایتیں درج کی ہیں جن سے ان کی براءت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔(۲)

غرض شیخ مبارک کی تفسیر عہد اکبری کی ایک شاہ کار تصنیف ہے مگر اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی ہے۔



(۱) ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، ہندوستانی مفسرین، ص ۵۶-۵۷ (۲) ایضاً ص ۵۷۔

شیخ یعقوب صرفی کشمیری

نام ونسب یعقوب نام، صرفی تخلص اور والد کا نام حسن گنائی تھا، کشمیر کے علمائے کبار میں شمار کیے جاتے تھے۔

ولادت صاحب نزہۃ الخواطر نے ان کا سن ولادت ۹۰۸ھ/ ۱۵۰۲ء بتایا ہے، محب الحسن کے بیان کے مطابق ان کی پیدائش ۹۳۵ھ/ ۱۵۲۸ء میں ہوئی۔

تعلیم ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن کشمیر میں پائی، صرف سات برس کی عمر میں انہوں نے قرآن مجید حفظ کرلیا تھا، نحو، صرف اور فقہ کی کتابیں مولانا رضی الدین کشمیری سے پڑھیں، پھر ایک عرصہ تک شیخ نصیر الدین امی کی خدمت میں رہ کر علوم عقلیہ کا درس لیا۔

شعروشاعری ان کو شعروشاعری سے بھی خاص لگاؤ تھا، نہایت کم سنی سے انہوں نے فارسی اشعار کہنا شروع کر دیا تھا، اس فن میں ان کو عبدالرحمان جامی کے شاگرد محمد آنی سے شرف تلمذ بھی حاصل تھا۔

ملا عبدالقادر بدایونی سے ان کو خاص تعلق تھا، چنانچہ ان کے نام اپنے خطوط میں انہوں نے اپنے اشعار بھی لکھے ہیں جن کو ملا عبدالقادر نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے، ان کا ایک قطعہ حسب ذیل ہے:

در ہر چہ بینم آں رخ نیکوست جلوہ گر　　در صد ہزار آئینہ یکروست جلوہ گر
حلقے بہر طرف شدہ سرگشتہ بہر دوست　　دین طرفہ ترکہ دوست بہرسواست جلوہ گر(۲)

(۱) عبدالحیٔ، نزہۃ الخواطر، ج ۵، دائرۃ المعارف، حیدرآباد، ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۵ء، ص ۴۳۸ و محب الحسن، کشمیر سلاطین کے عہد میں (اردو ترجمہ از علی حماد عباسی)، معارف پریس، اعظم گڈھ، ۱۹۶۷ء، ص ۴۰۱

(۲) بدایونی، ج ۳، ص ۱۴۳۔

علمی اسفار شیخ یعقوب نے حصول تعلیم کے لیے کشمیر سے باہر متعدد مقامات کا سفر کیا، وہ لاہور اور سیالکوٹ پہنچے، پھر سمرقند، مشہد اور حرمین کے کبار اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے اکتساب فیض کیا، شیخ احمد حجر ہیثمی مکی سے حدیث کا درس لیا، بغداد کے مشائخ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا، سمرقند کے بزرگ شیخ حسین خوارزمی سے بیعت ہوئے، اس سلسلہ میں انہوں نے حرمین کا متعدد بار سفر کیا اور وہاں سے حدیث، تفسیر اور فقہ کی بیش قیمت کتابیں اپنے ساتھ لائے (۱)۔

درس وتدریس ابتدا میں ان کا زیادہ وقت علمی سیاحت میں گزرا اور غالباً اس میں اس دور کی ملکی سیاست کا بھی دخل تھا، مگر بعد میں انہوں نے اپنے وطن میں مسند درس آراستہ کی اور تشنگان علم کی ایک بڑی تعداد ان کی علمی مجلس میں شامل ہوئی، ان کے مایہ ناز شاگرد مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ ہیں، جنہوں نے ان سے حدیث کی کئی کتابیں پڑھیں (۲)۔

سیاسی سرگرمیاں کشمیر کی اکثر آبادی سنیوں پر مشتمل تھی، وہاں چک خاندان کی حکمرانی جب قایم ہوئی تو شیعہ سنی اختلافات پیدا ہوئے، کیوں کہ چک شیعہ تھے اور وہ اپنے مذہب و مسلک کی ترویج پر زور دیتے تھے، اس خاندان میں علی شاہ کے دور تک کسی حد تک سنی علما کی قدر و منزلت باقی تھی مگر اس کے جانشین یہ رواداری نبھا نہ سکے، خاص طور پر یعقوب شاہ کے عہد حکومت میں سنیوں پر بہت مظالم توڑے گئے جس کے نتیجہ میں سنی علما کشمیر سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے، اسی دوران کشمیر کے بہت سے سردار شیخ یعقوب صرفی کی قیادت میں اکبر کے دربار میں لاہور پہنچے اور اس کو کشمیر پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی اور مندرجہ ذیل معاہدہ کی بنیاد پر اس کو اپنی حمایت کا یقین دلایا:

۱- عبادت میں پوری آزادی ہوگی اور مذہبی امور میں کوئی مداخلت نہیں ہوگی۔

۲- اشیا کے خرید و فروخت اور خورد و نوش کی چیزوں کے بھاؤ میں کوئی مداخلت نہ کی جائے۔

۳- کشمیریوں کو غلام نہ بنایا جائے۔

(۱) محب الحسن، حوالہ سابق و عبدالحیٔ، نزہۃ الخواطر، ج ۵، ۴۳۹ (۲) محمد حسین مرادآبادی، ص ۴۴۴۔

۴-کشمیریوں کو تنگ نہ کیا جائے اور نہ ان سے بیگار لی جائے۔
۵-ایسے کشمیری امرا جو شر انگیزی کے ذمہ دار ہیں ان کو نظم و نسق سے دور رکھا جائے (۱)۔
غرض شیخ یعقوب صرفی اور ان کے ہم نوا کشمیری سرداروں کی حمایت سے اکتوبر ۱۵۸۶ء میں اکبر کے سپہ سالار میر قاسم نے کشمیر کو فتح کر لیا اور اسی وقت سے کشمیر سلطنت مغلیہ کا ایک حصہ بن گیا۔

اکبر سے قرب و تعلق ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ شیخ یعقوب اکبر کے بہت مقرب تھے اور یہی تعلق ان کا ہمایوں سے بھی تھا (۲) ہمارے خیال میں ہمایوں سے ان کا تعلق محل نظر ہے کیوں کہ کشمیری سلطان علی شاہ کے بعد یوسف شاہ کے عہد حکومت میں کشمیری حکمرانوں کے مسلکی تشدد کی بنا پر ان کا تعلق سلطنت مغلیہ سے قایم ہوا اور بعد میں بھی ان کا زیادہ وقت کشمیر ہی میں بسر ہوا۔

وفات ۱۲/ذی القعدہ ۱۰۰۳ھ/۹ جولائی ۱۵۹۵ء کو ان کی وفات ہوئی، ملا عبدالقادر نے ''شیخ امم بود'' سے تاریخ وفات کہی ہے (۳)۔

تصنیفات شیخ یعقوب اپنے عہد کے بلند پایہ عالم تھے، ملا عبدالقادر ان کے بے حد مداح تھے، ابوالفضل نے بھی ان کو مذہبی امور کا مستند عالم قرار دیا ہے (۴)، انہوں نے درس و تدریس اور ملکی سیاسی مشغولیات کے ساتھ مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں جن سے ان کی علمی بزرگی کا اندازہ ہوتا ہے:

۱-تفسیر القرآن (فارسی): ملا عبدالقادر نے اس تفسیر کو ان کی ذہانت کا اعلا نمونہ بتایا ہے (۵) یہ تفسیر مکمل ہونے کو قریب تھی کہ ان کا وقت موعود آپہنچا اور یہ عظیم الشان کارنامہ نامکمل رہ گیا، اس کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ رمضان ۱۰۷۱ھ/۱۶۶۰ء بہ قلم روح اللہ بن نذیر بیگ، ذخیرہ شیرانی، پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں موجود ہے (۶)۔

(۱) محب الحسن، کشمیر سلاطین کے عہد میں، ص ۲۵۰، ۲۸۹-۲۹۰ (۲) بدایونی، ج ۳، ص ۱۴۲ (۳) ایضاً، ص ۱۴۸ (۴) محب الحسن، کشمیر سلاطین کے عہد میں، ص ۴۰۱ (۵) بدایونی، ج ۳، ص ۱۴۲ (۶) ڈاکٹر محمد بشیر حسین، ج ۱، ص ۱۔

۲-مثنوی مغازی النبی ﷺ (فارسی): اس کی تالیف ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱ء میں ہوئی، اس کا بھی ایک قلمی نسخہ ذخیرہ شیرانی میں محفوظ ہے، ڈاکٹر بشیر حسین کے بیان کے مطابق یہ مثنوی لاہور سے طبع ہو چکی ہے(۱)۔

محب الحسن کا بیان ہے کہ نظامی کے تتبع میں بھی انہوں نے کئی مثنویاں لکھیں (۲)، مولانا عبدالحئی نے ان کی مندرجہ ذیل کتابوں کے نام گنائے ہیں:

۱-شرح صحیح بخاری، ۲-مسلک الاخیار، ۳-مناسک حج، ۴-روائح، ۵-شرح رباعیات، ۶-رسالہ اذکار، ۷-رسالہ مقامات، ۸-حواشی تلویح دراصول فقہ، ۹-جواہر خمسہ بطرز خمسہ جامی (۳)۔

مگر یہ تمام کتابیں ناپید ہیں، اس کے علاوہ انہوں نے ابوالفیض فیضی کی تفسیر ''سواطع الالہام'' پر ایک تقریظ بھی لکھی ہے جس سے ان کی عربی پر قدرت اور علوم قرآن سے شغف کا اندازہ ہوتا ہے، فیضی کے تذکرہ میں اس تقریظ کے اقتباسات آگے درج ہیں۔



(۱) ڈاکٹر محمد بشیر، ج۱، ص۱۹ (۲) محب الحسن، ص ۴۰۲ (۳) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۴۳۹۔

شیخ ابوالفیض فیضی

ابتدائی حالات نام ابوالفیض، تخلص فیضی اور فیاضی تھا، یہ شیخ مبارک ناگوری کا سب سے بڑا لڑکا اور ذہانت و فطانت میں عدیم المثال تھا، ۹۵۴ھ/ ۱۵۴۷ء میں آگرہ میں پیدا ہوا، ابتدائی تعلیم اپنے والد شیخ مبارک سے پائی، جنہوں نے اپنے ہونہار فرزند کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ کی، چنانچہ فیضی نہایت کم سنی میں فارغ التحصیل ہوکر درجۂ کمال کو پہنچ گیا، اس کا اعتراف خود فیضی نے اپنے دیوان کے آغاز میں کیا ہے، وہ لکھتا ہے:

''ولی نعمت من پدر حقیقی وخدائے مجازی است کہ از ریحان وریحان طفولیت کہ عقل ہیولانی درشتم صور معنی بمن والی نمود، قریحہ جامدہ را بہ بلندی را ہمنون شد''۔

فیضی کی تمام تعلیم و تربیت اس کے والد ہی نے کی البتہ وہ خواجہ حسین ہروی کے فیض صحبت سے بھی مستفید ہوا اور مختلف علوم وفنون میں کامل ہوگیا، شعر، معمہ گوئی، فن عروض و قافیہ، تاریخ، لغت، طب، انشا، علم ہیئت و ہندسہ، غرض ہر فن میں اس کو مکمل عبور حاصل تھا، عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں میں بھی اس کو مہارت تامہ حاصل تھی۔

دربار شاہی میں رسائی فیضی جب بڑا ہوا تو تلاشِ معاش میں اپنے والد کے ہم راہ شیخ عبدالنبی صدر الصدور کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے منصب کا طلب گار ہوا، مگر شیخ عبدالنبی اس کے والد سے خلش رکھتے تھے، اس لیے انہوں نے اس پر اور اس کے والد پر شیعیت کا الزام رکھ کر ان دونوں کو اپنی مجلس سے اٹھا دیا(۱)، یہی نہیں بلکہ شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک نے ان کی شکایت بادشاہ سے بھی کی اور اس وقت ان دونوں کو دربار شاہی میں بڑا اثر ورسوخ حاصل تھا، جس کے نتیجہ میں شیخ مبارک اور اس کے لڑکوں کو آگرہ چھوڑ کر دربدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔

(۱) شاہ نواز خان، ماثر الامرا، ج ۲، اردو گائڈ پریس کلکتہ، ۱۸۹۰ء، ص ۵۸۶۔

۹۷۵ھ / ۱۵۶۷ء میں فیضی اپنی شاعری کی بہ دولت دربار شاہی میں باریاب ہوا، اس وقت اس کی عمر اکیس برس کی تھی، وہ جب دربار میں پہنچا تو ایک نقرئی پنجرہ کے پاس سے جہاں وہ کھڑا تھا، اس نے برجستہ ایک قطعہ کہا:

بادشاہان درون پنجرہ ام از سر لطف خود مرا جادہ
زانکہ من طوطی شکر خوائم جائے طوطی درون پنجرہ بہ

یہ فی البدیہ قطعہ بادشاہ کو بہت پسند آیا، اس نے فوراً اس کو اپنے قریب بلایا، چنانچہ اسی روز سے فیضی کو تقرب شاہی حاصل ہوا، اس کے چند روز بعد اس نے ڈھائی سو اشعار پر مشتمل ایک پرزور قصیدہ بادشاہ کی شان میں کہا، جس کا مطلع یہ تھا:

سحر نوید رسان قاصد سلیمانی رسید ہم چو سعادت کشادہ پیشانی

دربار میں قدرومنزلت فیضی روز بہ روز اکبر کا محبوب ہوتا چلا گیا اور شاہی دربار میں اس کی قدرومنزلت کافی بڑھ گئی، چنانچہ اکبر جب کسی مہم پر جاتا تو اس کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا تھا، ۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء میں بنگال کی مہم میں وہ اکبر کے ہم رکاب تھا(۱)، ۹۸۹ھ / ۱۵۸۱ء میں وہ دوآب یعنی ستلج اور بیانہ کے درمیانی علاقہ کا صدر بنا دیا گیا(۲)، ۹۹۳ھ / ۱۵۸۳ء میں یوسف زئی پٹھانوں کی سرکوبی کے لیے جو شاہی لشکر بھیجا گیا اس میں بھی فیضی کو شامل کیا گیا تھا۔

سلطنت کے انتظامی امور میں رائے ومشورہ فیضی دن بہ دن اپنی گوناگوں صلاحیتوں کی بنا پر سلطنت کے انتظامی امور ومعاملات میں دخیل ہوتا چلا گیا، ۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء میں اکبر نے اہل الرائے مشیروں کی ایک مجلس بلائی جس میں ان سے سلطنت کے معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور تجارتی اصلاحات کے متعلق رائیں طلب کیں، اس مجلس میں شہزادہ سلیم، خان اعظم، مرزا عزیز کوکہ، خان خاناں، راجہ ٹوڈرمل، مرزا یوسف خان، راجہ بیربل، قاسم خان اور شیخ جمال جیسے اساطین سلطنت کے ساتھ فیضی اور اس کے بھائی ابوالفضل کو بھی شریک کیا گیا تھا، اس مجلس میں فیضی نے اپنی اہم اور قیمتی رائے یہ دی کہ:

(۱) ابوالفضل علامی، اکبرنامہ، حصہ ۳، بشپ مشن پریس، کلکتہ، ۱۸۸۶ء، ص ۸۷۔ (۲) بدایونی، ج ۲، ص ۲۹۹۔

"شہر میں تجربہ کار اور رحم دل نگہبان مقرر کیے جائیں جو اشیا کی قیمتوں کی نگرانی کر سکیں"۔

چنانچہ ۹۹۱ھ/ ۱۵۸۳ء میں اکبر نے اپنے نظام سلطنت پر نظر ثانی کی اور مختلف محکموں کو دیانت دار اور تجربہ کار امرا کے حوالہ کیا، محل شاہی کے اندرونی معاملات کی نگرانی شہزادہ سلیم کے سپرد کی گئی اور اس کی معاونت کے لیے مرزا خان، فتح اللہ شیرازی اور فیضی مامور کیے گئے(۱)۔

ملک الشعرا کا خطاب اکبر کے دربار میں غزالی مشہدی ملک الشعرا کے خطاب سے موصوف تھا، اس کی وفات کے بعد جب فیضی نے اپنا مہابھارت کا منظوم ترجمہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تو اس نے فیضی کو ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا۔

ملکی سفارت ۹۹۹ھ/ ۱۵۹۰ء میں اکبر نے فیضی کو خاندیس کے فرماں روا راجہ علی خان کے پاس اپنا ایلچی خاص بنا کر بھیجا، فیضی نے اس سفارت کے فرایض نہایت حسن وخوبی سے انجام دیے، برہان پور پہنچ کر اس نے ایک دربار آراستہ کیا، جس میں تخت پر شاہی تلوار، خلعت اور فرمان رکھا، راجہ علی خان اس تخت کے سامنے حاضر ہوا اور تسلیمیں بجالا کر شاہی فرمان حاصل کیا۔

برہان پور سے وہ احمد نگر برہان شاہ سے جا کر ملا، اس سفر میں اس کی ملاقات ملک قمی اور ظہوری سے بھی ہوئی، ان کے اشعار سے محظوظ ہوا اور جو پسند آئے ان کو لکھ بھیجا، اس سفارت میں فیضی کے ایک سال آٹھ مہینے چودہ دن صرف ہوئے، ۱۰۰۱ھ/ ۱۵۹۲ء میں وہ جب واپس آیا تو اکبر نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور اس کو نعمتوں سے مالا مال کیا(۲)۔

دین الٰہی کے فروغ میں فیضی کا کردار اکبر شروع میں علما ومشائخ کا بڑا قدر دان اور معتقد تھا مگر ان کے شدید باہمی اختلافات سے وہ سخت بددل ہو گیا اور ان کے مذہبی اختیار کے خلاف اس نے ملا مبارک سے محضر تیار کرایا، جس کی بنا پر اختلافی مسائل میں فیصلہ کا حق اس کو حاصل ہو گیا، اس محضر کے بعد اکبر کے دربار میں مختلف اقوام وملل کے لوگ شرکت کرنے لگے اور انہوں نے اس کو جگت گرو کہنا شروع کیا اور اپنی مذہبی کتابوں سے یہ ثابت کرنے لگے کہ اکبر اقوام وادیان

(۱) ابوالفضل، اکبر نامہ، ص ۳۸۰۔ (۲) ایضاً، ص ۶۳۹۔

کے اختلاف کو مٹادے گا، اکبر کو سلطنت کے ساتھ مذہبی پیشوائی کا منصب بھی محضر کے بعد حاصل ہوگیا تھا، اس لیے اس کو وحدت ادیان کا نظریہ بہت پسند آیا اور اس نے اسی نہج پر لوگوں کے لیے احکام جاری کرنے شروع کیے اور اس کے خوشامدی درباریوں نے اس کی تائید کی۔

اکبر کے اس نئے طریقہ کار سے عوام میں یہ بات پھیل گئی کہ وہ مدعی نبوت ہے، حالاں کہ ایسا نہیں تھا، البتہ اس نے مریدان شاہی کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کے عجیب و غریب اصول وضوابط مقرر کیے تھے اور اس سے غلط فہمیاں پیدا ہونے کا پورا امکان تھا اور چوں کہ اس بارے میں فیضی اور اس کے بھائی ابو الفضل نے نمایاں حصہ لیا تھا، اس لیے ان کے سلسلہ میں یہ بات مشتہر ہوئی کہ اکبر کو دین حق سے منحرف کرنے میں ان دونوں بھائیوں کا بڑا ہاتھ ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ فیضی نے اپنے محبوب آقا کی خوش نودی میں مسلّم طریقہ زندگی سے ہٹ کر روش اختیار کی، جس کی بنا پر علما اور مذہبی طبقہ کر اس سے ناراضگی پیدا ہوئی، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ جو اسی عہد میں تھے اور فیضی سے ان کے گہرے مراسم تھے، انھوں نے بھی اس سے قطع تعلق کرلیا اور اس کے بارے میں اور اس نئے نظام کے حاملین کے سلسلہ میں ان کی رائے یہ تھی:

"فیضی اگر چہ کہ در فصاحت و بلاغت و متانت و رصانت سخن ممتاز روزگار بود لیکن حیف کہ بہ جہت وقوع و ہبوط در ہاویہ کفر وضلالت رقم انگار دو ادبار بر ناصیہ احوال خود کشیدہ زبان اہل دین وملت جناب نبوت را از بردن نام وے ونام جماعت شوم وے باک است تاب اللّٰہ علیھم ان کانوا مومنین"(۱)۔

لیکن اس کے باوجود اپنے زمانہ میں فیضی کی شخصیت غیر معمولی سمجھی جاتی تھی اور خود فیضی نے اپنی کسی تصنیف میں ان عقاید ونظریات کا اظہار نہیں کیا ہے جو اس کی جانب منسوب کیے

(۱) خلیق احمد نظامی، حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، خواجہ برقی پریس، ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء، ص ۲۴۳، بحوالہ شیخ عبدالحق، فہرس التوالیف، قلمی۔

جاتے ہیں۔

وفات ۱۰ رصفر ۱۰۰۴ھ/ ۶ /اکتوبر ۱۵۹۵ء کو اتوار کے دن ضیق النفس کی بیماری میں سفر آخرت اختیار کیا، جب وہ عالم نزع میں پہنچا تو اکبر کو خبر کی گئی، باوجودیکہ نصف شب گذر چکی تھی مگر اکبر اسی وقت اپنے محبوب دوست کے گھر شاہی حکیم لے کر پہنچا اور مضطربانہ فیضی کا سر پکڑ کر بولا "شیخ جیو، بولو، حکیم علی کو ساتھ لایا ہوں، بولتے کیوں نہیں"، مگر فیضی کی زبان بند ہو چکی تھی، اکبر نے اسے جھنجھوڑا لیکن اس کی روح پرواز کر چکی تھی، اکبر نے صدمہ میں اپنے سر سے دستار اتار کر زمین پر پھینک دی (۱)۔

ابوالفضل نے "آئین اکبری" میں اس کی خوبیوں کے متعلق لکھا ہے کہ:

"وہ فطرتاً شگفتہ مزاج، کشادہ دست بیدار مغز اور سحر خیز تھا، بادشاہ کا خاص ارادت مند اور صلح کل اس کا مشرب تھا، اس کی بہترین عادتیں اس کے فضایل کا باعث ہیں، اس کے گھر کا دروازہ دوست، دشمن اپنے بیگانے سب کے لیے کھلا رہتا تھا، اس کا مکان غربا کی پناہ گاہ تھا، اس نے کبھی دست سوال دراز نہیں کیا اور نہ کبھی انعام و بخشش کا آرزومند ہوا"۔ (۲)

وفات کے بعد فیضی کے متروکہ میں چار ہزار چھ سو مجلد نفیس کتابیں نکلیں، ان میں اکثر کتابیں خود اسی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں اور یہ سب شاہی کتب خانہ میں داخل کر دی گئیں (۳)۔

تصنیفات ماثر الامرا میں ہے کہ فیضی نے سو کتابیں لکھیں (۴)، فیضی کی تمام کتابوں کی تفصیلات معلوم نہیں ہیں، جن کتابوں کے بارے میں تفصیلات فراہم ہوئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱-**موارد الکلم:** یہ علم اخلاق میں ایک غیر منقوط کتاب ہے، جس میں فیضی نے انشا پردازی کا جوہر دکھایا ہے۔

۲-**مرکز ادوار:** نظامی کی مخزن اسرار کے مقابلہ میں یہ مثنوی لکھی، اس میں چار ہزار اشعار تھے۔

(۱) بدایونی، ج ۲، ص ۴۰۶۔ (۲) ابوالفضل علامی، آئین اکبری، ص ۱۶۸۔ (۳) بدایونی، ج ۳، ص ۳۰۵۔
(۴) شاہنواز خان، ج ۲، ص ۵۸۷۔

۳-نل ودمن: لیلیٰ مجنوں کے طرز پر ایک ہندوستانی قصہ کو نظم کیا ہے، یہ بھی چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے، ابوالفضل نے لکھا ہے کہ ۱۰۰۳ھ/ ۱۵۹۴ء میں فیضی نے نل ودمن لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کی اور اس کی بہت تعریف ہوئی (۱)۔

۴-ہفت کشور: ہفت پیکر کے طرز پر یہ مثنوی لکھی جس میں پانچ ہزار اشعار تھے۔

۵-اکبرنامہ: سکندر نامہ کے انداز پر اکبرنامہ لکھنے کا ارادہ کیا مگر یہ نامکمل رہا۔

۶-سلیمان وبلقیس: یہ بھی ناقص ہے، اس کو ابوالفضل نے اکبرنامہ میں نقل کیا ہے (۲)۔

ان کے علاوہ فیضی نے سنسکرت سے مہابھارت کا منظوم ترجمہ اور اتھرویں اور لیلاوتی کے ترجمے بھی کیے، اس نے اپنے دیوان کا نام ''طباشیر الصبح'' رکھا جس میں تقریباً نو ہزار اشعار تھے، اس کے خطوط کا بھی ایک مجموعہ ''لطائف فیضی'' کے نام سے مرتب کیا گیا ہے۔

تفسیر سواطع الالہام

فیضی کی شاہکار تصنیف اس کی تفسیر سواطع الالہام ہے، یہ تفسیر غیر منقوط الفاظ میں لکھی گئی ہے، جس سے عربی پر اس کی غیر معمولی قدرت اور اس کی اعلا لیاقت وذہانت کا اندازہ ہوتا ہے، غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

''برہان فضیلت شیخ فیضی سواطع الالہام تفسیر بے نقاط است کہ دریں هزار سال پیشتر ہیچ مستعدی رامیسر نہ شد، طرفہ ایں کہ چنیں کار دشوار در عرصہ دو سال از مبدا بہ منتہی رسانید'' (۳)۔

یہ تفسیر ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء میں نول کشور پریس، لکھنؤ سے نہایت اہتمام کے ساتھ طبع ہو چکی ہے، مطبوعہ نسخے کے سرورق پر حسب ذیل غیر منقوط عبارت درج ہے:

''هو الله لا اله الا هو علم ادم الاسماء كلها ، اللهم لك الحمد لما كمل رسم طوس مكمل هو لصدع كلام الله او اصرح ماول سماء عامله الهمام سواطع الالهام للعالم الطمطام والكامل الهمام ابو الفيض فيضى و صحه العلماء الاعلام و

(۱) ابوالفضل، اکبرنامہ، ج ۳، ص ۶۶۱۔ (۲) ایضاً، ص ۶۷۷۔ (۳) آزاد بلگرامی، ماثر الکرام، دفتر اول، ص ۱۹۹۔

الکملاء الکرام "۔

تفسیر کے آخر میں حروف تہجی کے اعتبار سے مشکل الفاظ کے معانی بھی ایک علاحدہ باب میں بیان کیے گئے ہیں اور اس باب کا نام حل معاسر سواطع الالہام رکھا گیا ہے، مہتممین طباعت کی جانب سے دو غیر منقوط تقریظین بھی اس میں شامل کی گئی ہیں اور تفسیر کے کاتب منشی اشرف علی نے مندرجہ ذیل قطعہ سے اس کی تاریخ طباعت بھی بیان کی ہے:

گشت مطبوع نسخہ عالی فیض بخش دل صغیر و کبیر

اشرف نکتہ سنج تاریخش گفت شد طبع بے نقط تفسیر

۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء

تفسیر فیضی کے بارہ میں علما کے خیالات فیضی کے عقاید وخیالات جو کچھ بھی رہے ہوں، اس کی تفسیر میں آزاد خیالی کی ادنی جھلک بھی نظر نہیں آتی ہے، ملا عبد القادر بدایونی چوں کہ اس کے سخت مخالف اور ناقد تھے، اس لیے انہوں نے اس کی بے دینی و بے راہ روی کے ذیل میں اس کی تفسیر کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے:

"تفسیر بے نقط برائے شستن بدنامی کہ تا در روز جزا بصد آب دریا شستہ نہ گردد، در عین حالت مستی و جنابت می نوشت، وسگان آن را از ہر طرف پائمال می ساختند" (۱)۔

درحقیقت ملا عبد القادر کے اسی انداز کے بیانات سے فیضی کی شخصیت آج تک مورخین وعلما کے درمیان مابہ النزاع بنی ہوئی ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تفسیر میں اپنے عقاید کے اظہار سے اس کے لیے کیا چیز مانع تھی؟ محمد حسین آزاد کے بہ قول:

"زبانی باتوں میں ملا صاحب جو چاہیں کہیں مگر نفس مطالب میں جب نہ اب کوئی دم نہیں مار سکتا، ورنہ ظاہر ہے کہ وہ بے دینی اور بدنفسی پر آجاتے تو جو چاہتے لکھ جاتے انہیں ڈر کس کا تھا" (۲)۔

(۱) بدایونی، ج ۳، ص ۳۰۰۔ (۲) محمد حسین آزاد، دربار اکبری، شاہی برقی پریس، لکھنؤ، بدون تاریخ، ص ۴۳۰۔

تفسیر سواطع الالہام کے مضمون کے بارے میں مولانا شبلیؒ رقم طراز ہیں:

''فیضی نے یہ تفسیر ان واقعات کے بعد لکھی ہے لیکن ایک ذرہ مسلمات کی شاہ راہ سے نہیں ہٹا، حالاں کہ تفسیر میں ہر قدم پر اس کو آزاد خیالی دکھانے کا موقع حاصل تھا، ملا صاحب تو فرماتے ہیں کہ وہ تمام عقاید اسلام کا منکر تھا لیکن وہ ان تمام عقاید کا معترف نظر آتا ہے، جن کو معتقدات عوام کہتے ہیں، سچ تو یہ کہ فیضی کی مذہبی آزادی ہم جو کچھ سنتے ہیں زبانی سنتے ہیں، تصنیفات میں تو وہ ملائے مسجد ہی نظر آتا ہے''(۱)۔

ملا صاحب کا یہ بیان کہ یہ تفسیر نشہ اور جنابت کی حالت میں لکھی گئی اور اس کے مسودے پر کتے لوٹا کرتے تھے، اس لیے بھی درست نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی تالیف کے دوران فیضی کے تعلقات اس عہد کے کبار علما سے استوار تھے اور وہ اس کام میں اس کی معاونت بھی کرتے تھے، حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفہ خواجہ محمد ہاشم کشمی زبدۃ المقامات میں لکھتے ہیں:

''ایک روز مجدد صاحب ابوالفضل کے بھائی فیضی کے گھر تشریف لے گئے، اس وقت وہ تفسیر غیر معجمہ لکھنے میں مشغول تھا، مجدد صاحب کو دیکھا تو بہت خوش ہوا اور کہا کہ آپ اچھے وقت آئے، میری تفسیر میں ایک مقام ایسا آپڑا ہے جہاں ادائیگی مطلب کے لیے غیر منقوط الفاظ مجھ کو نہیں مل رہے ہیں مجدد صاحب نے باوجودیکہ ان کو غیر منقوط عبارت لکھنے کا ملکہ حاصل نہ تھا، اس مقام کی تفسیر غایت فصیح و بلیغ عبارت میں لکھ دی جس کو دیکھ کر فیضی تیران رہ گیا''۔(۲)

مجدد صاحب کے دوسرے سوانح نگار مولانا بدر الدین سرہندی نے بھی حضرات القدس میں لکھا ہے کہ انہوں نے تفسیر غیر منقوط لکھنے میں فیضی کی بڑی مدد کی تھی اور اس کا ایک حصہ اسے لکھ کر دیا تھا، اس امر کی تائید بختاور خان نے بھی مرأۃ العالم میں کی ہے۔

(۱) مولانا شبلی نعمانی، شعر العجم، حصہ ۳، معارف پریس، اعظم گڈھ، ۱۹۲۰ء، ص ۵۲۔ (۲) خواجہ محمد ہاشم کشمی، زبدۃ المقامات، محمود پریس، لکھنؤ، ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء، ص ۱۳۲۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ عہد اکبری کے مقتدر علما نے اس تفسیر پر تقریظین لکھی ہیں، سواطع الالہام میں درج ذیل علما کی تقریظیں موجود ہیں:

۱- شیخ یعقوب صرفی کشمیری، ۲- قاضی نور اللہ شوستری، ۳- مولانا جمال تلہ، ۴- احمد بن مصطفےٰ الشریف الحسینی، ۵- امان اللہ بن غازی السرہندی۔

ان کے علاوہ اس دور کے دو اہم شاعر ظہوری اور حیدر رفیعی طباطبائی معمائی نے بھی اس تفسیر پر منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

تفسیر سواطع الالہام پر جتنی تقریظیں لکھی گئیں وہ سب عربی میں تھیں اور تمام لوگوں نے اس تفسیر کی نہایت مدح سرائی کی ہے اور خود بدایونی کے بیان کے مطابق یہ تمام علما جن کی تقاریظ اس تفسیر پر موجود ہیں، اپنے عہد کے صاحبان صلاح وتقویٰ اور جامع کمالات تھے(۱)، غور طلب بات ہے کہ کیا ان علما کو یہ پتا نہ تھا کہ یہ تفسیر کس حالت میں لکھی گئی ہے اور اس کے لکھنے والے کا عقیدہ ومسلک کیا ہے؟ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اس قدر مخالفت کے باوجود خود ملا صاحب نے اس تفسیر کی تاریخ کہی ہے، وہ لکھتے ہیں:

”و فقیر من احسن التفاسیر بسم الله الرحمان الرحيم
علم القران ،تاریخ یافت،تو قیعی نوشت بتقریبی در محل خود مذکور گردد“۔(۲)

اسی سے ملا صاحب کی تضاد بیانی اور بہ قول مولانا آزاد بے لچک تنگ نظری کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فیضی کی مخالفت میں اس پر گھناؤنے الزامات بھی لگاتے ہیں اور خود ”احسن التفاسیر“ سے اس کی تاریخ نکالتے ہیں۔

تفسیر سواطع الالہام کی خصوصیات تفسیر سواطع الالہام ایک حیرت انگیز علمی کارنامہ ہے، جس کی نظیر فصاحت و بلاغت کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے، اس تفسیر کے آغاز میں فیضی نے ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے جو دو حصوں میں ہے، پہلے حصہ میں اس نے اپنا اور اپنے اہل خاندان کا تعارف کرایا ہے اور جلال الدین محمد اکبر کی بڑی مدح سرائی کی ہے، اپنے عہد کے اہم مقامات کی تفصیل بھی لکھی ہے جس سے اس دور کی علمی اور سیاسی زندگی پر خاص روشنی پڑتی ہے۔

(۱) بدایونی، ج ۳، ص ۱۰۵، ۱۱۳، ۷، ۱۴۲، ۱۴۸۔ (۲) ایضاً ص ۳۹۳۔

مقدمہ کے دوسرے حصہ میں فیضی نے علوم القرآن پر بحث و گفتگو کی ہے اور تمام موضوعات کو اس نے مختلف فصلوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر فصل کو اس نے ساطعہ کا نام دیا ہے، اس کے بعض سواطع کافی مختصر اور بعض خاصے طویل ہیں، جن سے اس کی حیرت انگیز علمی لیاقت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، مقدمہ کے پہلے حصہ کے خاتمہ پر خود فیضی نے اپنے اس انوکھے کارنامہ کی تحسین اشعار میں کی ہے اور یہ اشعار بھی اس نے غیر منقوط الفاظ میں کہے ہیں، ان کا مطلع ملاحظہ ہو:

الواح سحر ام طلسم مکرم ☆ لاسرار روح للسواطع ملهم (۱)

فیضی کو صنعت مہملہ کے اہتمام کی وجہ سے اپنی تفسیر میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، چنانچہ منقوط ناموں کو اس نے عجیب معمائی انداز میں لکھا ہے، مثلاً اپنے والد شیخ مبارک کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"ھو اساس العلم و اصل الروع و مطلع الالهام و مراس الرؤس و امام الکرام"۔(۲)

فیضی نے مقدمہ میں یہ وضاحت بھی کی ہے کہ کس طرح اس کے ذہن میں یہ تفسیر لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور جب اس نے اس کا کچھ حصہ لکھ کر اپنے والد کو دکھایا تو وہ بہت مسرور ہوئے اور بعض مقامات میں اصلاح بھی کی (۳)۔

فیضی کے بیان کے مطابق اس تفسیر کی تکمیل لاہور میں ہوئی، فیضی کو اس شہر سے خاص انس تھا، جس کا ذکر اس نے اس طرح کیا ہے:

"سواطع الالہام ایک ایسا شاہکار علمی کارنامہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے گویا الہام کے ذریعہ مکمل کرایا ہے، یہ اہم کارنامہ دارالکمال لاہور میں انجام پذیر ہوا، جو ایک وسیع اور پررونق شہر ہے، جس کو علما اور باکمال بزرگوں کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہے، یہ شہر قافلوں کا نشانہ منزل اور اہل عرفان کی

(۱) شیخ ابوالفیض فیضی، تفسیر سواطع الالہام، نول کشور پریس، ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء، ص ۹۔ (۲) ایضاً ص ۵۔
(۳) ایضاً ص ۸۔

گذرگاہ ہے اور بادشاہوں کے لیے مناسب اور موزوں ترین چھاؤنی کا درجہ رکھتا ہے''۔(۱)

فیضی کے انداز بیان سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس تفسیر کے بارے میں اس دور میں بھی عوام الناس غلط فہمی میں مبتلا تھے اور فیضی کے سیاسی حریف اس کی بدنمائی میں لگے ہوئے تھے، جس کے سد باب کے لیے اس دور کے مقتدر علمانے اس کی تائید میں تقریظیں لکھیں، فیضی کا بیان ہے:

''سواطع الالہام ایک عمدہ اور پاکیزہ کتاب ہے، یہ اسم بامسمی کے طور پر رفعت و بلندی میں نمایاں ہے، انصاف پسند اور صاحبان تقوی علمانے جب اس تفسیر کا بہ غور مطالعہ کیا تو اس کی نازک بیانی اور نادر الخیالی پر دنگ رہ گئے، جب کہ یہ سب لوگ علم کے بادشاہ ہیں، ان لوگوں نے اس تفسیر کی تعریف میں تقریظیں لکھیں اور فیصلہ کیا کہ یہ متوازن اور وہم وگمان یا ذاتی رجحان سے مبرا کتاب ہے، تاہم اس کی اہمیت کا انکار محض خاین اور متعصب لوگوں کو ہے''۔(۲)

فیضی نے اسی ضمن میں علمائے حق اور علمائے سوء کے امتیازات بھی بیان کیے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اعلا اخلاقی قدروں کے حامل علما کا وہ قدر دان اور معترف تھا، وہ لکھتا ہے:

''علمائے حق نیک بخت لوگ ہیں، ان کی پوری توجہ مذہب اسلام کے فروغ پر مرکوز ہوا کرتی ہے، ان کو اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی سے خوشی ہوتی ہے، ان کا مقصود محض رضائے الٰہی اور اس کے احکامات کی نشر و اشاعت ہوتا ہے۔

علما سوئے اسلام کے بدترین خاین افراد ہوتے ہیں، یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں، یہ لوگ کلام اللہ اور کلام رسول ﷺ میں تحریف کرتے ہیں، ان کے کارنامے سیاہ اور خواہشیں دراز ہوتی ہیں، ان کے دل برائیوں کے مرکز اور ان کا مقصود محض حصول دنیا ہوتا ہے، یہ لوگ عوام الناس کو

(۱) تفسیر سواطع الالہام، ص۹۔(۲) ایضاً۔

تباہی و بربادی کی طرف لے جاتے ہیں"۔(۱)

پہلے گزر چکا ہے کہ تفسیر سواطع الالہام کے مقدمہ کا دوسرا جز علوم قرآن کے موضوع پر ہے، اس حصہ کا نام فیضی نے "السواطع اللوامع لعلوم کلام اللہ العلام و اسراره الصوالح لصدر المرام" رکھا ہے، اس حصہ میں فیضی نے نہایت موثر انداز میں کلام اللہ کی فضیلت و منقبت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

العلوم کلها صداع الا علم کلام اللہ و کل علم سواه عطله و اهمله لا اعد لمحامده ولاحد لمكارمه ولا حصر لرسومه ولا احصاء لعلومه وهو امام اهل الاسلام و مدار اصل المرام و مصرح علم الحلال و الحرام و مطرح سرالا و امر والاحکام و مصدر العلوم ۔(۲)

کلام اللہ کے علم کے علاوہ سارے علوم عبث اور دردِ سر ہیں، ان کے علاوہ علم کو لغو اور قابل ترک سمجھو، اس علم کے فضایل بے پایاں ہیں جن کی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی اور نہ اس کے علوم کا احاطہ کیا جاسکتا ہے، اللہ کا کلام ہی مسلمانوں کا ہادی اور ان کو منزل مقصود تک پہنچانے والا ہے، اسی سے حلال وحرام کی تمیز ہوتی ہے اور احکام و اوامر کی عقدہ کشائی ہوتی ہے، یہی کتاب سارے علوم کا ماخذ ہے۔

پھر اس کے بعد فیضی نے مختلف سواطع میں نزول قرآن مجید، کیفیت نزول اور جمع و ترتیب قرآن وغیرہ کے موضوعات پر بحث کی ہے اور صدر اول کے حفاظ و رواۃ اور مفسرین کے اسما بھی تحریر کیے ہیں (۳)۔

مقدمہ کے آخر میں اس نے اللہ رب العزت کے حضور میں نیک عمل کی توفیق کی دعا مانگی ہے، جس سے اس کے مذہبی رجحان کی عکاسی ہوتی ہے، مختلف مقامات پر حضور اکرم ﷺ کا ذکر والہانہ انداز میں کیا ہے (۴)، ایک جگہ لکھتا ہے:

"رسولوں میں سب سے پہلے حضرت آدمؑ اور آخری پیغمبر حضرت

(۱) تفسیر سواطع الالہام ص ۱۱۔ (۲) ایضاً۔ (۳) ایضاً ص ۱۱، ۱۲۔ (۴) ایضاً ص ۲، ۳، ۱۰، ۲۰۔

محمد ﷺ ہیں جو تمام رسولوں میں سب سے برتر، اللہ کے راز داں اور قابل تعریف ہیں، آپ ﷺ کے کمالات سب سے بلند و بالا ہیں اور آپ ﷺ اللہ کے سب سے زیادہ مقرب ہیں، آپ ﷺ کا پرچم سب سے بلند ہے اور آپ ﷺ ہی کے لیے لوائے حمد اور مقام محمود مختص ہے، آپ ﷺ کی دعائیں آسمان کی الواح کا نقش ہیں"۔(۱)

تفسیر سواطع الالہام از ابتدا تا انتہا مکمل قرآن مجید پر مشتمل ہے، ہر سورہ کے آغاز میں فیضی نے مختصر لفظوں میں اس کا شان نزول بھی بیان کیا ہے اور یہ بھی وضاحت کی ہے کہ کون سورتیں مکی ہیں اور کون مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں، صنعت اہمال کی رعایت کی بنا پر اس نے مکی سورتوں کے لیے مورد ھا ام الرحم اور مدنی سورتوں کے لیے مورد ھا مصر رسول اللہ ﷺ کی اصطلاح وضع کی ہے اور اس کی تشریح یوں کی ہے:

"اللہ کی کتاب مختلف مواقع اور متعدد مقامات پر نازل ہوئی اور ان کی دو قسمیں کی جاتی ہیں، مکی اور مدنی، میں نے اپنی تفسیر میں جن سورتوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ام الرحم میں نازل ہوئیں، اس سے مراد وہ سورتیں ہیں جن کا نزول قبل ہجرت مکہ مکرمہ میں یا اس کے اطراف مثلاً غارِ حراء وغیرہ میں ہوا، اسی میں وہ آیتیں بھی شامل ہیں جو ہجرت کے موقع پر مدینہ منورہ کے سفر میں اتریں اور جن سورتوں کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ یہ مصر رسول اللہ ﷺ میں نازل ہوئیں تو اس سے مراد بعد ہجرت کی سورتیں ہیں، خواہ ان کا نزول مدینہ منورہ میں ہوا ہو یا اس کے علاوہ فتح مکہ اور حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ مکرمہ ہی میں کیوں نہ ہوا ہو، مکی اور مدنی سورتوں کی یہی عام اور موزوں اصطلاح ہے"۔(۲)

تفسیر سواطع الالہام کے مطالعہ سے یہ بخوبی پتا چلتا ہے کہ حروف مہملہ کی مکمل رعایت کے باوجود اس میں ادائے مطلب میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا ہے اور اسی بنا پر عہد اکبری کے ممتاز علما نے اس کی تعریف و تحسین کی ہے، شیخ یعقوب صرفی کشمیری جو اس دور کے ایک صاحب تصنیف مفسر

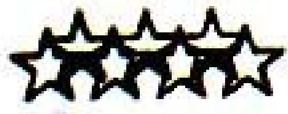
(۱) تفسیر سواطع الالہام، ص ۱۰۔ (۲) ایضاً ص ۱۳۔

گزرے ہیں، اس کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:

ولعمری انہ لم یقتدر ولن یقتدر احد من اساطین الکلام علی ذالک الابراز وھو تفسیر الکلام المجید وتاویل الفرقان الحمید المرسوم ببدائع الارقام والمرسوم بسواطع الالھام، مامست مثلہ ایدی الافکار ولم یکتحل بنظیرہ اعین الاحقاب والاعصار (۱)	بہ خدا کبھی نہ تو کوئی عالم ایسی کتاب لکھ سکا ہے اور نہ آئندہ لکھ سکے گا، جیسی عجوبہ روزگار کتاب سواطع الالہام ہے، اس سے پہلے انسانی تصور میں بھی یہ خیال نہیں آیا اور نہ صدیوں میں اس کی کوئی نظیر ملتی ہے۔

فیضی کے اس عجوبہ روزگار کارنامہ کی تعریف میں شیخ یعقوب صرفیؒ نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:

فواللّٰہ لم یکن الفوز باختراع ھذا التفسیر الخارج عن الطوق الانسانی الا بسوانح الالقاء السبحانی وسواطع الالھام الربانی: (۲)	خدا تعالیٰ کی قسم انسان کے تصور و خیال سے باہر اس تفسیر کے لکھنے میں کامیابی حاصل ہونا محض اللہ جل سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے القاء والہام کے نتیجہ میں ہوا ہے۔



(۱) تفسیر سواطع الالہام، ص ۷۳۹۔ (۲) ایضاً، ص ۷۴۰۔

شیخ منور بن عبدالحمید لاہوری

ابتدائی حالات نام منور اور والد کا نام عبدالحمید ہے، سلسلہ نسب یوں ہے:

شیخ منور بن عبدالحمید بن عبدالشکور بن سلیمان بن اسرائیل لاہوری (۱)، لاہور میں پیدا ہوئے، اس کے علاوہ ان کے ابتدائی حالات معلوم نہیں ہیں۔

تعلیم ابتدائی تعلیم اپنے ماموں شیخ سعد اللہ بن ابراہیم لاہوری سے حاصل کی (۲)، شیخ اسحاق کاکو لاہوری سے بھی ان کو شرف تلمذ حاصل ہے جو اس عہد کے بیشتر لاہوری علما کے استاد تھے، جن میں ان کے ماموں شیخ سعد اللہ بھی شامل ہیں (۳)۔

بیس برس کی عمر میں مروجہ علوم وفنون کی تحصیل سے فارغ ہو گئے، حافظہ قوی تھا، فن تجوید وقرأت سے خاص مناسبت تھی، اس فن میں وہ اپنے تمام ساتھیوں سے فایق تھے (۴)، بختاور خاں نے ان کے حافظہ کا یہ حال لکھا ہے کہ تفسیر کی بہت سے کتابیں ان کو زبانی یاد تھیں بالخصوص تفسیر بیضاوی ان کو مکمل حفظ تھی (۵)۔

درس وتدریس نظام الدین احمد بخشی کا بیان ہے کہ وہ اپنے عہد کے جلیل القدر عالم تھے اور انہوں نے سالہا سال درس وافادہ میں بسر کیے (۶)

دربارشاہی میں رسائی شیخ منور کے علم وفضل کا شہرہ بادشاہ جلال الدین محمد اکبر تک پہنچا تو اس نے انہیں دربارشاہی میں طلب کیا اور اپنے مقربین خاص میں شامل کرلیا اور ان کے ساتھ نہایت عزت واحترام کے ساتھ پیش آتا تھا (۷)، غالباً یہ اکبر کا ابتدائی دور تھا جب وہ علما وصلحا کا معتقد وقدرداں تھا، چنانچہ ۹۸۵ھ/۱۵۷۷ء میں وہ دربارشاہی سے مالوہ کے گورنر بنا کر

(۱) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۱۱۔ (۲) بختاور خاں، مراۃ العالم، ظفر پرنٹرز، لاہور ۱۹۷۹ء، ص ۴۳۶۔

(۳) بدایونی، ج ۳، ص ۵۲۔ (۴) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۱۱۔ (۵) بختاور خاں، ص ۴۳۶۔

(۶) نظام الدین بخشی، ج ۲، ص ۴۶۱۔ (۷) بختاور خاں، ص ۴۳۶۔

روانہ کیے گئے جہاں وہ دس سال تک اس منصب پر رہے (۱)، ملا عبدالقادر بدایونی کے بیان کے مطابق ان کی مالوہ کی گورنری درحقیقت ایک طرح کی جلاوطنی تھی جو اکبر نے متعدد لاہوری علما کے ساتھ کی تھی (۲)۔

قید و بند ۹۹۵ھ/۱۵۸۶ء میں وہ مالوہ کی گورنری سے معزول کردیے گئے اور گوالیار کے قلعہ میں قید کردیے گئے (۳)، بختاور خان کے بیان کے مطابق عہد اکبری میں علما پر مظالم کا جو سلسلہ شروع ہوا یہ اس کا ایک حصہ تھا (۴)، غرض پانچ برس وہ گوالیار میں قید رہے اور اسی اثنا میں انہوں حالت اسیری میں اپنی تفسیر "الدار النظیم فی ترتیب الآی وسور القرآن الکریم" لکھی، حالت قید و بند میں اس عظیم الشان علمی کارنامہ کی تکمیل سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ ان کے حافظہ کے بارے میں تذکرہ نگاروں کے بیانات مبالغہ آرائی پر مبنی نہیں ہیں۔

وفات اکبر کے آخری زمانہ میں ان پر مظالم کا سلسلہ مزید سخت کردیا گیا، ان کی تمام املاک کو ضبط کرلیا گیا جن میں ان کی ڈیڑھ ہزار کتابوں کا سرمایہ بھی شامل تھا، صرف ان کے پاس ان کی تفسیر الدار النظیم باقی بچی، اکبر کی سختیوں کے نتیجہ میں ۱۲/ذی القعدہ ۱۰۱۱ھ/۱۳/اپریل ۱۶۰۳ء کو حالت قید ہی میں ان کی وفات ہوئی، مولانا عبدالحئی کے بیان کے مطابق انتقال سے پہلے وہ آگرہ منتقل کردیے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا (۵)، بختاور خاں کا بیان ہے کہ قلعہ گوالیار ہی میں ان کی وفات ہوئی (۶)۔

گلزار ابرار کی روایت ہے کہ آگرہ کے عام قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی، چار سال بعد ۱۰۱۵ھ/۱۶۰۶ء میں ان کے لڑکے ان کا جسد آگرہ سے نکال کر لاہور لے گئے اور اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیا (۷)۔

ازواج و اولاد ان کے صرف ایک لڑکے شیخ کبیر کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے، ملا عبدالقادر بدایونی کے بیان کے مطابق وہ علم و فضل میں اپنے والد کے جانشیں تھے (۸)۔

(۱) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۱۱۔ (۲) بدایونی، ج ۲، ص ۲۷۷۔ (۳) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۱۲۔ (۴) بختاور خاں، ص ۴۳۶۔ (۵) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۱۲۔ (۶) بختاور خاں، ص ۴۳۶۔ (۷) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۱۲ (۸) بدایونی، ج ۳، ص ۱۰۶۔

تصنیفات شیخ منور کی متعدد کتابوں کے نام تذکرہ کی کتابوں میں ملتے ہیں مگر ان کی کوئی تصنیف دست یاب نہیں ہے، ان کے نام حسب ذیل ہیں:

۱- **الدر النظیم فی ترتیب الآی وسور القرآن الکریم :** علم تفسیر پر ان کی یہ کتاب تھی، اس کے عنوان ہی سے پتا چلتا ہے کہ قرآن مجید کی آیتوں اور سورتوں کے درمیان ربط و مناسبت اس کا موضوع تھا، غالباً امام بقاعی کی تصنیف تناسب الدرر کے نہج پر یہ کتاب تھی۔

۲- **ترجمہ تفسیر بحر مواج :** گوالیار کے قید خانہ میں انہوں نے قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تفسیر بحر مواج کو فارسی سے عربی میں منتقل کیا (۱)۔

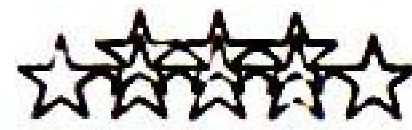
۳- **الحق الصریح فی اثبات عدم قبول التوبۃ لساب النبی ﷺ :** متھرا کے برہمن کا واقعہ عہد اکبری کا اہم قصہ ہے جس کی بنا پر علما کے درمیان بحثیں ہوئیں (۲)، اسی موقع پر مولانا عبداللہ سلطان پوری کے جواب میں یہ رسالہ لکھا تھا، اس کے عنوان ہی سے پتا چلتا ہے کہ شیخ منور علما کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو برہمن کی نازیبا حرکت کی وجہ سے اس کو قابل گردن زدنی سمجھتا تھا۔

۴- **حدائق البیان شرح بدیع البیان -**

۵- **شرح الطوالع -**

۶- **شرح قصیدہ بردہ بوصیری -**

اس کے علاوہ شیخ منور نے قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی کتاب الارشاد فی النحو اور امام صغانی کے مجموعہ احادیث مشارق الانوار کی بھی شرحیں لکھیں۔



(۱) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۱۲ـ۴۱۳ _ (۲) تفصیل کے لیے شیخ مبارک کے حالات ملاحظہ فرمائیں۔

شیخ غلام نقشبند گھوسوی ثم لکھنوی

نام ونسب اور خاندانی حالات غلام نقشبند نام اور والد کا نام عطاء اللہ تھا، سلسلہ نسب یوں ہے:

غلام نقشبند بن عطاء اللہ بن قاضی حبیب اللہ بن احمد بن ضیاء الدین بن یحیٰ بن شرف الدین بن نصیر الدین بن حسین عثمانی اصفہانی۔(۱)

اس نسب نامہ سے پتا چلتا ہے کہ ان کا نسبی تعلق امیر المومنین حضرت عثمان بن عفانؓ کے خاندان سے تھا اور غالباً اس خاندان کے لوگ پہلے حجاز سے آکر اصفہان میں آباد ہوئے، پھر وہاں سے کوئی بزرگ ہندوستان وارد ہوئے لیکن تذکرہ کی کتابوں میں اس کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے۔

شیخ غلام نقشبند کے دادا قاضی حبیب اللہ اپنے عہد کے باکمال بزرگ اور فقہ اور افتا میں ممتاز تھے، چنانچہ وہ قصبہ گھوسی ضلع مئو کے قاضی مقرر ہوئے اور اس منصب پر مدۃ العمر فائز رہے(۲) وہ شیخ علی بن قوام جون پوری مشہور بہ میر علی عاشقان سرائے میری سے بیعت تھے۔

شیخ غلام نقشبند کے خاندانی حالات کے بارے میں غلام آزاد بلگرامی کا بیان زیادہ معلوماتی ہے کیوں کہ ان کے نانا میر عبد الجلیل بلگرامی شیخ غلام نقشبند کے ارشد تلامذہ میں تھے(۳) وہ لکھتے ہیں:

"آبائے کرام آں جناب متوطن قصبہ گھوسی تابع بلدہ جون پور و از علمائے آں مکان اند"۔(۴)

شیخ غلام نقشبند کے آبا و اجداد قصبہ گھوسی کے رہنے والے تھے جو اس عہد میں جون پور کے ماتحت تھا، ان کے خاندان کے لوگ اس قصبہ کے شرفا میں شمار کیے جاتے تھے۔

(۱) عبد الحئی، نزہۃ الخواطر ج ۶، دائرۃ المعارف، حیدر آباد، ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۷ء، ص ۲۱۲۔ (۲) ایضاً، ج ۴، ص ۵۸۔ (۳) آزاد بلگرامی، ماثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۵۸ و ۲۵۹۔ (۴) ایضاً ص ۲۱۳۔

آزاد کے اس بیان سے پتا چلتا ہے کہ شیخ غلام نقشبند کا خاندان عرصہ سے گھوسی میں آباد تھا اور اس کو اس علاقہ میں بڑی قدر و منزلت اور عزت حاصل تھی۔

شیخ غلام نقشبند کے والد عطاء اللہ بھی اپنے والد کی طرح صاحب نسبت بزرگ اور عالم و فاضل تھے، وہ گھوسی میں پیدا ہوئے اور اسی اطراف کے علما سے اکتساب فیض کیا، قراین سے یہ پتا چلتا ہے کہ ان کی تمام عمر درس و تدریس میں گزری، ان کے ایک شاگرد میر محمد شفیع دہلوی تھے جن کی آغوش میں ان کے فرزند ارجمند شیخ غلام نقشبند کی تعلیم و تربیت ہوئی (۱)، شیخ عطاء اللہ اخیر عمر میں گھوسی سے لکھنؤ جا کر آباد ہو گئے اور وہیں ۵/ربیع الثانی ۱۰۶۳ھ (۲۳/فروری ۱۶۵۳ء) کو ان کی وفات ہوئی۔(۲)

پیدائش شیخ غلام نقشبند ۱۹/ذی الحجہ ۱۰۵۱ھ/۱۱/مارچ ۱۶۴۲ء کو قصبہ گھوسی میں پیدا ہوئے (۳) گویا اس وقت تک ان کے والد گھوسی ہی میں مقیم تھے اور انہوں نے اپنے فرزند کا نام حضرت بہاء الدین نقشبند کے نام نامی کی نسبت سے غلام نقشبند رکھا۔

تعلیم و تربیت آزاد بلگرامی کے بیان کے مطابق شیخ غلام نقشبند کی تعلیم شروع سے اخیر تک میر محمد شفیع کے دامن فضل و کمال میں ہوئی جو دہلی میں رہتے تھے، ممکن ہے کہ شیخ عطاء اللہ نے کم سنی ہی میں انہیں تعلیم کے لیے دہلی روانہ کر دیا ہو، غالب گمان یہ ہے کہ ۱۰۶۳ھ/۱۶۵۳ء میں ان کی وفات کے بعد شیخ غلام نقشبند نے دہلی کا سفر کیا اور اس وقت وہ صرف بارہ سال کے تھے، چنانچہ میر محمد شفیع کے سایۂ عاطفت میں رہ کر محض اٹھارہ سال کی عمر میں جملہ علوم و فنون کی تعلیم حاصل کر لی، اس کے بعد اپنے استاد کے شیخ پیر محمد لکھنوی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے کچھ کتابیں تبرکا پڑھیں اور اس وقت ان کی عمر اکیس برس کی تھی (۴)۔ مولانا عبدالحئی کے بیان کے مطابق انہوں نے پیر محمد لکھنوی سے شرح چغمینی، قدوری اور تفسیر بیضاوی کے چند اجزا پڑھے تھے (۵)، ہمارے خیال میں پیر محمد لکھنوی سے ان کا درس لینا محل نظر ہے کیوں کہ شیخ غلام نقشبند کی طفولیت کے زمانہ میں ہی ان کی وفات ہو گئی تھی۔

---

(۱) آزاد بلگرامی، ماثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۱۳ (۲) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۷۴ (۳) ایضاً، ج ۶، ص ۲۱۳ (۴) آزاد بلگرامی، ماثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۱۳ (۵) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۳۔

علمی تبحر شیخ غلام نقشبند علومِ دینیہ کے ساتھ عقلی علوم میں بھی مہارت رکھتے تھے، صاحب نزہتہ الخواطر کا بیان ہے:

"کان من کبار الاساتذة لم یکن فی زمانه اعلم منه بالنحو واللغة والاشعار وایام العرب ومایتعلق بها متوفرا علی علوم الحکمة"۔(۱)

وہ کبار اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، ان کے زمانہ میں لغت، جاہلی اشعار اور ایام عرب وغیرہ کا ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں تھا، علاوہ ازیں وہ علوم حکمت سے بھی بہرہ ور تھے۔

سلوک و معرفت تذکرہ نگاروں نے سلوک وعرفان میں بھی ان کو ممتاز بتایا ہے، سبحۃ المرجان میں ہے:

هو اوحد الزمان والجامع بین العلم والعرفان ۔(۲)

وہ یکتائے زمانہ اور علم وعرفان کے جامع تھے۔

ماثر الکرام میں اس کی تفصیل یوں کی گئی ہے:

علامہ ایست جامع عجائب وغرائب علوم و خدا رسی است خازن اسرار معلوم و مکتوم ۔(۳)

وہ ایسے جلیل القدر عالم ہیں جو علوم عجائب کے ساتھ خدارسی کے بھی جامع اور معلوم و مخفی اسرار کے خازن ہیں۔

چنانچہ خود شیخ غلام نقشبند کا بیان ہے کہ زمانہ طالب علمی میں ایک شب حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ اپنے دست مبارک سے میرے سامنے کے بٹن کھول رہے ہیں اور اسی حالت خواب میں یہ تعبیر بھی القا ہوئی کہ آپ ﷺ مجھ پر علم کے دروازے کھول رہے ہیں اور شرح صدر فرما رہے ہیں ۔(۴)

سجادہ نشینی شیخ غلام نقشبند اپنی خداداد لیاقت اور صلاحیت کی بنا پر اپنے استاد میر محمد شفیع کی موجودگی میں ان کے پیر و مرشد شیخ پیر محمد لکھنوی کے جانشین مقرر کیے گئے، جس کے بعد ان کا فیض

(۱) عبد الحئی، نزہتہ الخواطر ج ۶، ص ۲۱۲۔ (۲) آزاد، سبحۃ المرجان، ج ۱، ص ۲۰۱۔ (۳) ماثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۱۳۔ (۴) ایضاً۔

بہت عام ہوا، آزاد بلگرامی نے اس واقعہ کی تفصیل یوں لکھی ہے:

"شیخ پیر محمد کی وفات ۱۰۵۸ھ/ ۱۶۴۸ء کے بعد ان کے تمام خلفا اور مریدین نے متفقہ طور پر یہ طے کیا کہ میر محمد شفیع کو جو ان کے اجل خلفا میں تھے ان کا جانشیں منتخب کیا جائے، وہ اس وقت دہلی میں تھے، اس لیے ان کے لکھنؤ آجانے تک انہوں نے مسند شیخ کو تہ کر کے رکھ دیا، جب میر محمد شفیع لکھنؤ پہنچے تو ان کے دل میں یہ خیال ہوا کہ کیوں نہ اپنے بجائے اپنے شاگرد شیخ غلام نقشبند کو اپنے مرشد کا جانشیں مقرر کردیں، مگر انہوں نے اپنے اس خیال کو عام لوگوں سے مخفی رکھا، حتی کہ شیخ غلام نقشبند کو بھی اس سے آگاہ نہیں کیا، ایک روز خانقاہ کے علاوہ شہر کے مشائخ اور معززین کو جمع کیا اور اس مجلس میں اکابر کی صف کے سامنے اپنے استاد کی مسند بچھائی، پھر شیخ غلام نقشبند کا ہاتھ پکڑ کر اس مسند پر بٹھا دیا اور خود ان کے روبرو مودب ہو کر بیٹھ گئے، یہ دیکھ کر سارے حاضرین نے بھی ان کی پیروی کی"۔(۱)

صاحب نزہۃ الخواطر نے بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

اجلسه میر محمد شفیع المذکور علی سجادة شیخه فاستقل بها مدة حیاته "۔(۲)	میر محمد شفیع نے ان کو اپنے استاد کی مسند پر بٹھایا جس پر وہ تمام عمر متمکن رہے۔

مگر اس کے برخلاف خود صاحب نزہۃ الخواطر نے شیخ پیر محمد کے ایک معمر مرید اور عالم شیخ محمد آفاق بہاری (متوفی ۲۲ ربیع الثانی ۱۰۸۹ھ/ ۳ جون ۱۶۷۸ء) کے مسند نشیں ہونے کا ذکر کر کے (۳) یہ صراحت کی ہے کہ ان کو اس مسند پر میر محمد شفیع نے بٹھایا تھا (۴)، مولانا رحمان علی کا بھی یہی بیان ہے کہ شیخ پیر محمد کی رحلت کے بعد شیخ محمد آفاق بہاری مسند نشیں ہوئے۔(۵)

(۱) آزاد بلگرامی، ماثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۱۴، سبحۃ المرجان، ج ۱، ص ۱۰۲ (۲) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۲۱۳ (۳) ایضاً، ج ۵، ص ۳۵۷ (۴) ایضاً، ج ۶، ص ۳۱۹ (۵) رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۳۵ اور ۱۸۲۔

ہمارے خیال میں شیخ پیر محمد کی وفات کے بعد شیخ محمد آفاق بہاری کا ہی انتخاب عمل میں آیا ہوگا، کیوں کہ وہ اپنے ساتھیوں میں سب سے معمر تھے اور ان کو اپنے شیخ کی طویل صحبت میسر آئی تھی، غالباً ۱۰۸۹ھ/۱۶۷۸ء میں ان کے انتقال کے بعد میر محمد شفیع کا انتخاب ہوا، جس واقعہ کی تفصیل آزاد نے بیان کی ہے، اس امر کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ شیخ پیر محمد کی وفات کے وقت شیخ غلام نقش بند محض سات آٹھ برس کے تھے۔

درس وتدریس شیخ غلام نقشبند نے تمام عمر درس وتدریس میں گزاری، وہ مختلف علوم وفنون کے جامع تھے، مگر فن تفسیر سے ان کو خاص شغف تھا، وہ تفسیر بیضاوی کا درس دیتے تھے (۱)، ان کے درس کی ایک اہم خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے تلامذہ کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے، ذہین اور باصلاحیت طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے اور تعلیم سے فراغت کے بعد بھی ان سے برابر ربط رکھتے اور ان کی کامیابیوں پر خوش ہوتے تھے (۲)، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے بیشتر ہندوستانی فضلا ان کے دامن فیض سے وابستہ ہوئے، جن میں ملا نظام الدین سہالوی، میر عبدالجلیل بلگرامی، سید فرید الدین بلگرامی، سید قادری بلگرامی، شیخ محمد قاسم کاکوروی بجنوری، شیخ نور الہدی امیٹھوی اور مفتی شرف الدین لکھنوی کے نام شامل ہیں۔ (۳)

شعروشاعری قدیم عربی شاعری سے ان کی واقفیت کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس کے علاوہ وہ خود بھی ایک کہنہ مشق شاعر تھے، فن عروض سے بھی بخوبی واقف تھے اور اس فن میں ایک کتاب بھی لکھی (۴)، تذکرہ کی کسی کتاب میں ان کے دیوان کا ذکر موجود نہیں ہے، صرف ان کے ایک قصیدہ کا ذکر ملتا ہے جس کو انہوں نے اپنے استاذ میر محمد شفیع کی مدح میں لکھا تھا اور یہ تیس اشعار پر مشتمل ہے، یہ پورا قصیدہ مشہور جاہلی شاعر امرؤالقیس کے معلقہ کے وزن وقافیہ اور اسی طرز وانداز پر کہا گیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری پر قدیم شعرا کا رنگ غالب تھا، ان کے قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

---

(۱) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۱۰۴ (۲) آزاد بلگرامی، ماثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۵۹ (۳) نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۱۰۴، ۶-۴۳-۹۶-۳ و ماثر الکرام، دفتر اول، ص ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۵۸، ۱۵۹، ۲۱۴ (۴) آزاد بلگرامی، ماثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۱۶۔

خلیلی ھل ھاتان دارۃ جلجل　　و دارۃ سلمی فی قفاق عقنقل

دربارشاہی میں عزت افزائی شیخ غلام نقشبند کا دایرہ محض درس وافادہ تک محدود تھا مگر اس کی بہ دولت ان کے تلامذہ دور دور تک پھیل گئے، جن میں بعض بادشاہوں کے مقرب اور اہم سرکاری عہدوں پر بھی فایز ہوئے (۱)، چنانچہ ان کا علمی شہرہ سن کر شاہ عالم بہادر شاہ اول فرزند اورنگ زیب عالم گیر نے ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور ملاقات ہونے پر نہایت عزت وتکریم کے ساتھ پیش آیا۔(۲)

مولانا عبدالحئی نے سبحۃ المرجان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بہادر شاہ نے ان سے لکھنؤ میں ملاقات کی تھی (۳)، مگر سبحۃ المرجان میں یہ صراحت نہیں کی گئی ہے، دراصل یہ ملاقات دہلی ہی میں بہادر شاہ اول کی تخت نشینی ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء کے بعد اس وقت ہوئی جب شیخ غلام نقشبند کی شہرت کے شباب کا زمانہ تھا، رحمان علی لکھتے ہیں:

"شاہ عالم ابن اورنگ زیب بادشاہ شہرہ	شاہ عالم ابن اورنگ زیب کو جب ان کے
کمالش اصغا کردہ اورا بخو دطلبید وباعزاز	شہرہ کمال کی اطلاع ہوئی تو ان کو دربار میں بلایا
واکرام تمام پیش آمدہ"۔(۴)	اور نہایت عزت واکرام کے ساتھ پیش آیا۔

اخلاق وعادات شیخ غلام نقشبند بڑے خلیق، متواضع اور خداترس بزرگ تھے، وہ شریعت کے آئین واصول کی پابندی پر خاص زور دیتے تھے اور اس بارے میں کسی قدر متشدد بھی تھے، آزاد کے بیان کے مطابق" وہ حدود شریعت کے محافظ اور ملت بیضا کے نگراں تھے (۵)۔ جب کسی شخص کو خلاف شرع حرکت کا مرتکب دیکھتے تو بڑے کبیدہ خاطر ہوتے تھے اور اس شخص سے ترک تعلق کر لیتے تھے لیکن اگر وہ شخص اپنی غلط روش سے باز آتا اور صدق دل سے توبہ کر لیتا تو اس کی جانب سے ان کا دل صاف ہو جاتا تھا اور وہ اس پر پہلے سے زیادہ لطف ومدارات کا معاملہ کرنے لگتے، ماثر الکرام میں ہے:

"مزاج اقدس ہمہ مصروف حفظ شریعت	مزاج اقدس میں ہروقت حفظ شریعت ہی کا خیال

(۱) آزاد بلگرامی، ماثر الکرام، دفتر اول ص ۱۰۵ (۲) ایضاً ص ۲۱۴ وسبحۃ المرجان، ج ۱ ص ۲۰۲ (۳) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۱۳ (۴) رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۵ (۵) آزاد، سبحۃ المرجان، ج ۱ ص ۲۰۲۔

بودو بروفق الحب للہ و البغض للہ از کسے امر نا ملایم می سرزد غبار سخت خاطر والا می نشست واگر آن کس توفیق توبہ می یافت زیادہ تر از سابق مورد الطاف می گردید''۔(۱)	رہتا تھا، الحب للہ و البغض للہ کے مصداق اگر کسی سے کوئی نامعقول حرکت سرزد ہو جاتی تو اس کی جانب سے ان کے دل میں گرد و غبار جم جاتا اور اگر اس شخص کو توبہ کی توفیق ہو جاتی تو پھر یہ پہلے سے بھی زیادہ اس پر مہربان ہو جاتے۔

وفات لکھنؤ میں اخیر رجب ۱۱۲۶ھ/ ۱۷۱۴ء میں وفات پائی (۲)، ایک قول کے مطابق جمادی الاولی کا مہینہ تھا اور لکھنؤ ہی میں دریائے گومتی کے کنارے ٹیلہ شیخ پیر محمد میں تدفین ہوئی (۳) اسی ٹیلہ پر شیخ پیر محمد مدفون ہوئے تھے، جس کے بعد سے یہ ٹیلہ ان ہی کی نسبت سے مشہور ہے۔(۴)

اولاد ان کے صرف ایک صاحب زادے شیخ احمد کا ذکر تذکرہ کی کتابوں میں ملتا ہے، جو اپنے والد کے بعد مدرسہ شیخ پیر محمد کے مدرس مقرر ہوئے، پھر منصب مشیخت پر فائز ہوئے اور ان کے بعد ان کے فرزند قطب الہدیٰ ان کے جانشیں ہوئے۔(۵)

تصنیفات پہلے گذر چکا ہے کہ شیخ غلام نقشبند کو فن تفسیر سے خاص مناسبت تھی، چنانچہ ان کی اکثر کتابیں اسی موضوع پر ہیں، تاہم وہ دوسرے علوم میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے، علم ہیئت، فن عروض اور تصوف میں بھی ان کی کتابیں ہیں، ان کی اکثر تصنیفات ناپید ہیں، جن کتابوں کا سراغ ملتا ہے، وہ یہ ہیں:

۱-تفسیر انوار الفرقان و ازھار القرآن: یہ قرآن مجید کے ربع اول کی عربی زبان میں تفسیر ہے، جس پر مصنف کے حواشی بھی ہیں، اس کے قلمی نسخے کتب خانہ ریاست رام پور (۶)، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ (۷) اور مکتبہ رحمانیہ مدراس میں موجود ہیں (۸)، آگے

(۱) آزاد بلگرامی، ماثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۱۴ (۲) ایضاً، ص ۲۱۶ (۳) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۱۴ (۴) ایضاً، ج ۵، ص ۹۷ (۵) ایضاً، ج ۶، ص ۲۴ و ۲۱۳ (۶) مولوی محمد نبی، فہرست کتب عربیہ، کتب خانہ ریاست رام پور، ج ۲، مطبع احمدی، ۱۹۰۲ء، ص ۵۶ (۷) سید اطہر شیر، مفتاح الکنوز، ج ۳، یونین پریس پٹنہ، ۱۹۶۵ء، ص ۱۷ (۸) ڈاکٹر محمد سالم، ہندوستانی مفسرین، ص ۱۲۱۔

اس تفسیر کا مفصل تذکرہ آئے گا۔

۲- تفسیر سورۂ اعراف : یہ تفسیر بیضاوی کے دو قدیم حاشیوں پر تشریحی نوٹ کا مجموعہ ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن میں موجود ہے۔(۱)

۳- مختلف سورتوں کی علاحدہ علاحدہ تفسیریں۔

۴- بعض مشکل آیات کی تفسیر۔

۵- فرقان الانوار۔

۶- لامعہ عرشیہ در مسئلہ وحدت الوجود۔

۷- شرح قصیدہ خزرجیہ در علم عروض۔

۸- شرح قصیدہ مطالع الدقائق در علم ہیئت۔(۲)

تفسیر انوار الفرقان وازھار القرآن اس تفسیر کے تین قلمی نسخے ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں ملتے ہیں، مدراس کے مکتبہ رحمانیہ کے نسخہ کو مصنف کے قلم کا لکھا ہوا بتایا جاتا ہے، اس پر ان کی مہر بھی ہے، جو ۱۱۲۱ھ/ ۱۷۰۹ء کی ہے، خدا بخش لائبریری کا نسخہ بڑی تقطیع میں ۳۷۵ اوراق پر مشتمل ہے، اس کے ہر صفحہ میں ۲۹ سطریں ہیں اور کتابت ۱۱۱۵ھ/ ۱۷۰۳ء کی ہے (۳)، اس میں قرآن کی آیتیں سرخ روشنائی سے لکھی ہیں، کتابت صاف ہے اور حاشیہ پر جا بجا نوٹ درج ہیں، شروع کے چند صفحات بوسیدہ ہیں مگر نسخہ مکمل ہے، تیسرا نسخہ جو کتب خانہ ریاست رام پور میں ہے وہ زیادہ واضح اور مفصل ہے (۴)، یہ نسخہ ۶۸۳ صفحات پر مشتمل ہے اور

(۱) سی-اے استوری، ج ۲، ص ۶۳ و ۶۴ (۲) آزاد بلگرامی، ماثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۱۶ و مولوی محمد نبی، حوالہ سابق، ص ۵۷ (۳) سید اطہر شیر محولہ بالا ص ۱۷ (۴) ڈاکٹر محمد سالم قدوائی نے اس تفسیر کے دو قلمی نسخے رام پور میں بتائے ہیں، ان کے بیان کے مطابق دوسرا نسخہ نامکمل ہے، جس کے کچھ ابتدائی اوراق غائب ہیں، (ص ۱۲۱) مگر کتب خانہ ریاست رام پور میں اس تفسیر کا صرف ایک ہی نسخہ ہے، البتہ اس لائبریری میں ایک دوسری تفسیر ''انوار فی تفسیر القرآن'' کا ایک نسخہ ہے، جس کے مصنف ابن مقسم نحوی (م ۳۴۱ھ/ ۸۵۲ء) ہیں، غالباً اسی نسخہ کو ڈاکٹر صاحب نے شیخ غلام نقشبند کی تفسیر کا دوسرا نسخہ سمجھ لیا ہے، کیوں کہ اس تفسیر کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی بیان کردہ تفصیلات اور مرتب فہرست کا بیان یکساں ہے، ملاحظہ ہو مولوی محمد نبی، حوالہ سابق، ج ۱، ص ۲۰)۔

اس کے تعارف میں مرتب فہرست نے حسب ذیل نوٹ لکھا ہے:

"تقطیع کتابت طولاً مختلف، کہیں ۸ انچ کہیں اس سے کم وبیش، عرضاً تقریباً ۴ انچ، سطور ۲۱ سے ۲۳ تک، صفحہ ۶۶۹ تک، خط نسخ عمدہ ایک قلم سے لکھا ہوا ہے، اس کے بعد آخر کتاب تک خط نسخ مختلف ہے، اکثر اوراق کتاب پر حواشی بھی نستعلیق پختہ خط میں تحریر ہیں جن کا کاتب دوسرا شخص معلوم ہوتا ہے، تمام اوراق پر دیمک کا زیادہ اثر پایا جاتا ہے، ۱۹۱۴ء میں بحالات کذائی خرید ہوئی، آیات قرآنیہ شنجرف سے معرب، تفسیر سیاہی سے غیر معرب لکھی ہے، کاتب نے اپنا نام آخر کتاب پر اس عنوان سے تحریر کیا ہے" کتبہ محمد التفات مبارز خانی تحریر فی التاریخ پانز دہم شہر ربیع الثانی روز یکشنبہ یک نیم پہر روز بر آمدہ قصبہ لاہر پور در حویلی متبرکہ مولوی صاحب قبلہ عظیم الدین خاں باتمام رسید" سال کتابت نہیں لکھا ہے، اسی آخری صفحہ پر ایک عربی قطعہ نستعلیق خط میں تحریر ہے جس سے ۱۱۱۰ھ / ۱۶۹۸ء نکلتے ہیں، یہ امر منقح نہیں ہوتا کہ تالیف کا سن ہے یا کتابت کا، قطعہ یہ ہے:

سیختم بشری ان ھذا لعامہ
ینادی علی قولی و ذلک یختم
فعلیک شیخ القوم للہ ختمہ
وللہ ختمہ فیہ سر معظم
۱۱۱۰ھ / ۱۶۹۸ء

یہ تفسیر باحواشی ربع اول قرآن شریف کی ہے، حضرت مصنف نے پورے قرآن کی بالاستیعاب تفسیر نہیں لکھی ہے، تفسیر ربع قرآن میں زیادہ بسط نہیں کیا گیا ہے، ضروری قدر پر اکتفا ہے، عبارت آغاز صفحہ اول "الحمد للہ الذی جعل الفرقان خاتمہ نوراً للھدی" ص ۸۶۳ "صار فی الدنیا خلیفتہ و عند اللہ ملکا"۔(۱)

(۱) مولوی محمد نبی، حوالہ سابق، ج ۲، ص ۵۶، ۵۷۔

شیخ غلام نقشبند کی یہ تفسیر ابتدائے قرآن مجید سے سورۂ انعام کے اختتام تک ہے، اس کے آغاز میں مصنف نے ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں فن تفسیر کی اہمیت اور ضرورت بیان کی ہے اور اسی سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ یہ تفسیر ۱۱۱۰ھ/ ۱۶۹۸ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی (۱)، اس طور پر یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ تفسیر کے آخر میں عربی قطعہ میں جو تاریخ بیان کی گئی ہے، اس کا تعلق کتابت سے نہیں ہے بلکہ تکمیل تصنیف سے ہے۔

شیخ نقشبند کی تفسیری خصوصیات شیخ غلام نقشبند کی تفسیر انوار الفرقان اور ان کے دوسرے تفسیری رسایل کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی کتابوں میں طلبہ کو مخاطب بنایا ہے، چنانچہ ان میں زیادہ تر تفسیر بیضاوی کی شرح اور اس پر حواشی ہیں، پھر بھی ان کی بعض تفسیری خصوصیات کا علم ہوتا ہے، جن کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱- ربط سور کا اہتمام، شیخ غلام نقشبند قرآن مجید کی سورتوں کے درمیان ربط و مناسبت کے قایل نظر آتے ہیں جب کہ اکثر مفسرین اس موضوع کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے، چنانچہ وہ سورۂ اعراف کی تفسیر کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"وجه المناسبته بين السورتين ان خاتمه الالى وعد ووعيد و فاتحة الثانية انذار وتذكير وبيان اهلاك القرون الخالية والقرى الماضية"۔(۲)	دونوں سورتوں (انعام و اعراف) کے درمیان وجہ مناسبت یہ ہے کہ سورۂ انعام کا اختتام وعد و وعید پر ہوا ہے اور سورہ اعراف کا آغاز انذار و تذکیر اور اقوام ماضیہ کی ہلاکت و بربادی کے ذکر سے ہوا ہے۔

۲- تفسیر بیضاوی کی تشریح و توضیح، شیخ غلام نقشبند تفسیر بیضاوی کے بڑے شیدائی تھے اور اسی کا درس دیا کرتے تھے، اس لیے ان کی تمام تحریریں اسی کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہوتی تھیں، انہوں نے اپنے ایک شاگرد سے اس تفسیر پر کیے گئے بعض اعتراضات کے جوابات بھی لکھوائے تھے، جس کا ایک قلمی نسخہ "تسعة كلمات تتعلق بتفسير البيضاوی" کے

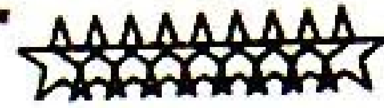
(۱) ڈاکٹر محمد سالم، ہندوستانی مفسرین، ص ۱۲۱ (۲) استوری، حوالہ سابق، ج ۲، ص ۶۴۔

نام سے انڈیا آفس میں نہایت بوسیدہ حالت میں موجود ہے۔(۱)

۳- جدت وابتکار، شیخ غلام نقشبند کا تمام تفسیری سرمایہ محض تشریح وحاشیہ نویسی تک محدود نہ تھا بلکہ انہوں نے بعض آیات کی تفسیر میں جدت وابتکار سے بھی کام لیا ہے، سورۂ آل عمران کی آیت "ماکان لنبی ان یغل" (۲) کی تفسیر میں جمہور مفسرین کے برخلاف وہ لکھتے ہیں:

"یہ احکام جہاد میں سے ایک حکم ہے، غلالہ ایک قسم کا لباس ہے جو زرہ کے نیچے پہنا جاتا ہے، درخت کی جڑ میں جو پانی دیا جاتا ہے اسے بھی غلالہ کہتے ہیں"۔

غلالہ کے معنی جمہور مفسرین کے نزدیک خیانت کے ہیں اور اسی مفہوم کے تحت کچھ جزوی اختلاف کے ساتھ انہوں نے اس لفظ کی تشریح کی ہے، مگر شیخ غلام نقشبند کی تفسیر ان سے بالکل منفرد ہے، غرض شیخ غلام نقشبند کی تفسیر انوار الفرقان اور ان کے دوسرے تفسیری رسائل کے بارے میں مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا اصل موضوع قدیم مفسرین کی شرح وتوضیح ہے اور چوں کہ یہ تفسیری اجزا طلبہ کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں، اس لیے اس میں فنی نکات اور لغت کے مسایل سے زیادہ بحث نہیں کی گئی ہے، بلکہ ان کے معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان سے متعلق زیادہ امور مثلاً نماز، روزہ اور وضو وغیرہ کے مسایل تفصیل سے پیش کیے گئے ہیں اور ان مسایل کی تائید میں احادیث نبوی ﷺ اور ائمہ فقہ کے اقوال بھی نقل کیے گئے ہیں۔(۳)



(۱) اوٹو لوتھ، حوالہ سابق، ص ۴۳ (۲) سورۂ آل عمران، آیت نمبر ۱۶۱ (۳) ڈاکٹر محمد سالم، ہندوستانی مفسرین، ص ۱۲۲، ۱۲۳۔

ملا جیون امیٹھوی

نام ونسب اور خاندانی حالات ملا جیون کا نام احمد تھا مگر وہ اپنے عرف جیون سے مشہور ہوئے، اپنی کتاب مناقب الاولیا میں جوان کے خاندان کے بزرگوں کے ساتھ خودان کی ستر سالہ سوانح عمری پر مشتمل ہے، اپنا نام جین لکھا ہے(۱)، لفظ جیون یا جیو ہندی الاصل ہے، جس کے معنی حیات وزندگی کے ہیں، یہ غالباً کوئی دعائیہ کلمہ تھا جوان کے نام کا مستقل جز بن گیا۔

ملا جیون کا خاندان اودھ کے قدیم علمی خاندانوں میں سے تھا، ان کا سلسلہ نسب شیخ عبداللہ مکیؒ سے ملتا ہے جن کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ حضرت صالحؑ سے نسبی تعلق رکھتے تھے(۲)، ملا جیون نے شیخ عبداللہ مکیؒ تک اپنے شجرۂ نسب کو بیان کیا ہے اوراس کو محقق بتایا ہے(۳)، فقیر محمد جہلمی نے ملا جیون کا نسبی تعلق حضرت ابوبکرؓ سے بتایا ہے(۴) مگر خود ملا جیون کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ ان کے خاندان کا خلیفہ اول سے نسبی تعلق نہ تھا بلکہ یہ تعلق اس خلافت پر مبنی ہے جو بعض روایات کے مطابق شیخ مکیؒ کو خلیفہ اول سے حاصل تھی۔(۵)

ملا جیون نے اپنے خاندانی بزرگوں میں مندرجہ ذیل اشخاص کا مفصل تذکرہ کیا ہے،
ملا ابوسعید والد ملا جیون، عبداللہ داد، عبدالرزاق والد عبداللہ اوران کے والد مخدوم خاصہ خدا، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس خاندان میں علم وتقوی کا سلسلہ کئی پشتوں سے چل رہا تھا، ملا جیون کے والد ملا ابوسعید (م ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء) متقی اور پرہیز گار عالم تھے، راستہ چلتے ہوئے اپنے چہرہ کورومال سے ڈھکے رہتے کہ کسی غیر محروم پر نگاہ نہ پڑ جائے، تقوی کا یہ حال تھا کہ استنجا کے کلوخ بھی کسی دوسرے کی زمین سے مالک کی اجازت کے بغیر نہیں اٹھاتے تھے، اکثر روزہ

(۱) ملا احمد جیون، مناقب الاولیا، قلمی، کتب خانہ دارالمصنفین، اعظم گڈھ، ورق ۳۲۔ (۲) ایضاً، ورق ۲۔ (۳) ایضاً، ورق ۲ و خادم حسن علوی، صبح بہار، ترجمہ اردو مناقب الاولیا، ص ا و ۲۔ (۴) آزاد بلگرامی، ماثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۱۶۔ (۵) ملا احمد جیون، حوالہ سابق، ورق ۳۷۔

سے رہتے اور ہمیشہ درس وتدریس میں مشغول رہا کرتے تھے (۱)، ملا جیون کی والدہ ماجدہ بھی بڑی نیک خاتون تھیں، وہ بادشاہ عالم گیر کے میر آتش عبداللہ عرف نواب عزت خان کی ہم شیرہ بتائی جاتی ہیں۔ (۲)

ولادت ملا جیون سہ شنبہ کے دن صبح صادق کے وقت ۲۵؍شعبان المعظم ۱۰۴۷ھ/۲؍جنوری ۱۶۳۸ء کو قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ (۳)

تعلیم وتربیت ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد بزرگوار ملا ابو سعید سے پائی، پھر شیخ محمد صادق سترکھی اور مولانا لطف اللہ کوڑہ جہاں آبادی سے علوم نقلیہ وعقلیہ کی تحصیل کی (۴) لکھنؤ کے مفتی محمد سعید الحسینی سے بھی ان کو تلمذ کا فخر حاصل ہے انہوں نے اپنی تعلیمی سرگزشت خود بیان کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''سات سال کی عمر میں والد کی صحبت میں رہ کر قرآن مجید کا حافظ ہوگیا، اس کم عمری میں باوجودیکہ قواعد تہجی اور اعراب سے واقفیت نہ تھی بحمد اللہ کے فضل سے پورا قرآن مجید الفاظ ومعانی کے ساتھ یاد ہوگیا تھا، یہی حال دوسرے علوم وفنون کی کتابوں کا بھی تھا، گو اُن کے مطالعہ میں تقدیم وتاخیر کی رعایت ملحوظ نہ تھی، پھر بھی بفضلہ ہر کتاب کا مفہوم سمجھ لیتا تھا''۔ (۵)

تصنیفی زندگی کا آغاز ملا جیون کو علم وتعلیم اور درس وتدریس سے خاص مناسبت تھی، اسی کے ساتھ تصنیف وتالیف کا ذوق بھی ان کو ورثہ میں ملا تھا، ان کے خاندانی بزرگوں میں شیخ علم اللہ بڑے پایہ کے بزرگ اور صاحب تصنیف تھے (۶)، چنانچہ ملا جیون نے نہایت کم سنی ہی میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کردیا، وہ لکھتے ہیں:

> ''تیرہ سال کی عمر ہوئی تو والد ماجد کا انتقال ہوگیا، اسی عمر میں آداب احمدی علم سلوک میں لکھی اور خطبات جمعہ وعیدین بھی فصیح وبلیغ عربی میں لکھا، اپنے

(۱) ملا احمد جیون، بحوالہ سابق، ورق ۲۸ (۲) خادم حسن علوی، حوالہ سابق ص ۳۴ (۳) ملا احمد جیون، ورق (۴) غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، ج ۲، ص ۶۵ ۳ وآزاد بلگرامی، ماثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۵۰ (۵) ملا احمد جیون، ورق ۳۲، ۳۷ (۶) ایضاً، ورق ۱۸۔

دادا شیخ عبید اللہ اور ان کے بڑے بھائی شیخ علم اللہ کے مسودات کو مرتب کرنا شروع کیا، سولہ سال کی عمر میں جب کہ حسامی میرے زیر درس تھی، تفسیر احمدی لکھنا شروع کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کام سے فارغ ہو گیا، غرض بائیس برس کی عمر میں علوم معقولات و منقولات کی تحصیل سے فراغت حاصل کر لی''۔(۱)

ملا جیون کے اس بیان سے ان کی ذہانت و عبقریت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

''ان کا حافظہ بڑا قوی تھا، درسی کتابوں کے کئی کئی صفحے بغیر اصل کتاب کو دیکھے پڑھتے جاتے تھے، لمبے لمبے قصیدے ایک دفعہ سن کر یاد کر لیتے تھے''۔(۲)

درس و تدریس تعلیم سے فراغت کے بعد بائیس سال کی عمر میں اپنے وطن امیٹھی میں مسند درس آراستہ کی اور اس کا سلسلہ ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء تک برقرار رہا، اس اثنا میں بے شمار طالبان علم ان سے مستفید ہو کر درجہ کمال کو پہنچے، جن میں احمد بن ابی المنصور رگو پامئوی جو فتاوی عالم گیری کے مولفین میں شامل تھے اور مفتی تابع محمد مفتی لکھنؤ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اسی دوران ملا جیون نے علم تجوید و قرأت میں شاطبی کے منتخبات کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا۔

تصوف و سلوک زمانہ درس و تدریس ہی سے ان کو تصوف و سلوک سے دلچسپی تھی، چنانچہ وہ صوفیہ کے مختلف سلسلے نقشبندی، چشتی اور قادری بزرگوں کی خدمت میں حاضری دیتے تھے اور ان سے اوراد و ظائف کی تعلیم حاصل کی، پھر اپنے استاذ شیخ محمد صادق سترکھی سے قادری سلسلہ میں بیعت ہو گئے اور ان سے اجازت بھی حاصل کی۔(۳)

دہلی و اجمیر کا سفر ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء میں وہ اجمیر اور دہلی کے سفر پر روانہ ہوئے، دہلی میں وہ تقریباً پندرہ سال رہے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ قایم کیا اور ان کے حلقہ درس کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔(۴)

حج بیت اللہ اور نور الانوار کی تالیف دہلی میں قیام کے دوران ان کو حج بیت اللہ کا اشتیاق

(۱) ملا احمد جیون، حوالہ سابق، ورق ۳۳ (۲) آزاد، سبحۃ المرجان، ج ۱، ص ۲۰۵ (۳) ملا احمد جیون، ورق ۳۳ (۴) قرائن سے پتا چلتا ہے کہ شاہی خاندان اور امرا کے بچے بھی اس میں شریک ہوتے تھے۔

پیدا ہوا، ۱۱۰۱ھ/ ۱۶۹۰ء میں وہ اس کے لیے عازم سفر ہوئے، حرمین کی زیارت اور حج کی سعادت کے بعد مدینہ منورہ میں پانچ سال تک رک گئے اور وہاں بھی درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

مدینہ منورہ ہی میں ۱۱۰۵ھ/ ۱۶۹۳ء میں انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب نور الانوار جو المنار کی شرح ہے صرف دو ماہ کے عرصہ میں روضۂ اطہر علیہ السلام کے سامنے بیٹھ کر تصنیف کی۔(۱)

شعر گوئی

ملا جیون کو شعر وسخن کا بھی ذوق تھا، ان کے بیان کے مطابق ان کے کئی شعری مجموعے تھے مگر اب ان میں کوئی دست یاب نہیں ہے، انہوں نے تمام اشعار دہلی اور اجمیر کے قیام اور سفر حج کے دوران کہے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''اس عرصہ میں دوبار محبت کا غلبہ ہوا، پہلی مرتبہ غلبہ جوش وسرمستی میں ایک مثنوی مولانا روم کی مثنوی کے طرز پر لکھی، جس میں چھ دفتر پچیس ہزار اشعار پر مشتمل تھے اور ایک دیوان جو دیوان حافظ کے انداز پر تھا، پانچ ہزار اشعار پر مشتمل لکھا اور جب فقیر کی عمر پچپن سال کی ہوئی تو حرمین شریفین کی زیارت کے لیے روانہ ہوا اور ملک دکن کی سیر کرتا ہوا عرب پہنچا، اس زمانہ میں ایک قصیدہ دوسو سات اشعار کا ہم وزن قصیدہ بردہ کہا اور اس کو وسیلہ خوشنودی روح اطہر علیہ السلام بہ طور تحفہ مدینہ طیبہ لے چلا، جب بندرگاہ سورت پہنچا تو اس قصیدہ کی عربی شرح لکھی اور اس میں کچھ تغیر وتبدیل بھی کیا، دوبارہ پھر سودائے محبت میں گرفتار ہوا اور اس دفعہ غلبہ شوق سے انتیس فصیح وبلیغ عربی قصیدے کہے، جن کو حرمین کے اکثر لوگوں نے تحسین کی نظر سے دیکھا''۔(۲)

شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر سے تعلق

ملا جیون اورنگ زیب عالم گیر کے بڑے مداح تھے، اپنی تفسیر کے مقدمہ میں انہوں نے بادشاہ کا ذکر عقیدت واحترام سے کیا ہے اور اسے گراں قدر خطابات سے نوازا ہے(۳) ۱۱۰۷ھ/ ۱۶۹۰ء میں جب وہ حج سے واپس لوٹے تو دکن میں شاہی لشکر میں رک گئے اور چھ سال وہیں رہ گئے(۴)، اس وقت عالم گیر وہاں کی ریاستوں سے برسرپیکار تھا،

(۱) ملا احمد جیون، حوالہ سابق، ورق ۴۳ ونور الانوار مطبع علی بخش، ۱۲۶۶ھ/ ۱۸۶۹ء، خاتمہ (۲) ایضاً، خودنوشت، ورق ۳۳و۳۴و۳۳ (۳) خودنوشت، ورق ۳۳و۳۴و التفسیرات الاحمدیہ، مطبع حسنی کلکتہ، ص ۶ (۴) خودنوشت، ورق ۴۳۔

اس لیے اس قدر طویل قیام کے باوجود اس سے ملا جیون کی ملاقات بہت مختصر رہی، وہ لکھتے ہیں:

"واتفاق اقامت شش سال در لشکر معلیٰ رو یداد واز مقتضیات ارادت الٰہی و بادشاہ دیں پناہ حضرت عالم گیر اتفاق ملاقات و صحبت چند روز واقع شد"۔(۱)

چھ سال لشکر معلیٰ میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا اور اس اثنا میں ارادہ خداوندی اور بادشاہ پناہ عالم گیر کی خواہش پر ان سے شرف ملاقات حاصل ہوا اور چند روز صحبت رہی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ ملا جیون کے بارے میں سب سے پہلے مفتی غلام سرور نے یہ لکھا ہے کہ وہ اورنگ زیب کے استاذ تھے(۲)، بعد کے تذکرہ نگاروں نے بھی اسی کو دہرایا ہے(۳) اور اس سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب ان کا نہایت فرماں بردار شاگرد تھا اور اس نے پوری زندگی کبھی حد ادب سے باہر قدم نہ نکالا(۴) لیکن یہ اقوال اس لیے محل نظر ہیں کہ ملا جیون اورنگ زیب سے عمر میں بیس برس چھوٹے تھے، ان کا سن ولادت ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۸ء ہے جب کہ اورنگ زیب ۱۰۲۷ھ/۱۸-۱۶۱۷ء میں پیدا ہوا۔(۵)

غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض تذکرہ نگاروں کو اس بات میں تردد لاحق ہوا، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب میں ملا جیون پر جو مضمون شامل ہے اس کے مقالہ نگار بزمی انصاری لکھتے ہیں:

"سرکاری تواریخ مثلاً عالم گیر نامہ اور ماثر عالم گیر کے برعکس ان کے تمام سوانح نگار متفقہ طور پر بیان کرتے ہیں کہ اورنگ زیب نے انہیں اپنے اساتذہ میں شامل کر لیا تھا اور ان کی بہت عزت و تکریم کرتا تھا، یہ یقیناً ۱۰۶۴ھ/۵-۱۶۵۴ء اور ۱۰۶۸ھ/۵۸-۱۶۵۷ء کے درمیان کا واقعہ ہوگا، جس سال اورنگ زیب تخت نشیں ہوا، بہت ممکن ہے کہ شہنشاہ نے اپنی تخت نشینی کے بعد

(۱) خودنوشت، ورق ۳۴ (۲) غلام سرور، حوالہ سابق، ج ۲ ص ۳۶۵ (۳) آزاد بلگرامی، ماثر الکرام، ص ۲۱۶ و رحمان علی، حوالہ سابق ص ۴۵ (۴) آزاد، سبحۃ المرجان، ص ۲۰۴ و رحمان علی حوالہ سابق ص ۴۵ و یوسف الیان سرکیس، حوالہ سابق، ج ۲ ص ۱۱۶۴ (۵) منشی ذکاء اللہ دہلوی، تاریخ ہندوستان، ج ۸، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ص ۳۔

اس نوجوان سے بعض کتابیں پڑھی ہوں"۔(۱)

لیکن مذکورہ بالا بیان میں چند باتیں توجہ طلب ہیں، اول تو ملا جیون کی خودنوشت کے بیان کے مطابق جو اس بارے میں اولین ماخذ ہے، ان کی ملاقات اورنگ زیب سے ۱۱۰۷ھ/ ۱۶۹۵ء سے پہلے ثابت نہیں ہے اور فاضل مقالہ نگار کا یہ مفروضہ کہ ۱۰۶۴ھ/ ۵۴-۱۶۵۳ء اور ۱۰۶۸ھ/ ۸-۱۶۵۷ء کی درمیانی مدت میں اورنگ زیب نے ان سے بعض کتابیں پڑھی ہوں گی، اس لیے قابل تسلیم نہیں ہے کہ اس عرصہ میں خود ملا جیون تحصیل علم میں مشغول تھے، انہوں نے ۱۰۶۹ھ/ ۹-۱۶۵۸ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد اپنی مسند درس آراستہ کی، پھر یہ زمانہ اورنگ زیب کے لیے نہایت پر آشوب تھا، اس لیے باور نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے اس مدت میں ایک نوجوان سے استفادہ کے لیے امیٹھی کا سفر کیا ہو۔

ہمارے خیال میں ملا جیون اورنگ زیب کے استاد نہ تھے، دراصل وہ دہلی میں قیام کے دوران شاہی محل کے استاد تھے، مولانا عبدالحئی کے بیان کے مطابق اورنگ زیب کی بیٹی زیب النسا (ولادت ۱۰۴۸ھ/ ۱۶۳۸ء، وفات ۱۱۱۴ھ/ ۱۷۰۲ء) نے ملا جیون سے درس لیا تھا (۲) اسی طرح شاہ عالم بہادر شاہ اول (۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء تا ۱۱۲۴ھ/ ۱۷۱۲ء) جو اورنگ زیب کا بیٹا اور جانشین تھا اور فرخ سیر سے ان کے جو روابط اور تعلقات تھے ان سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان شاہ زادوں نے ان سے تعلیم پائی تھی، چنانچہ وہ بہادر شاہ اول کے مکمل عہد حکومت تک اسی کے ساتھ لاہور میں مقیم رہے اور جب فرخ سیر بادشاہ بنا تو اس کے بھی مقربین میں شامل ہوئے (۳)، اورنگ زیب سے ان کے روابط اور اس سے لوگوں کی سفارش کے جو واقعات بیان کیے جاتے ہیں غالب قرینہ یہ ہے کہ ان کا تعلق فرخ سیر سے ہوگا، کیوں کہ فرخ سیر کو ملا جیون کے فرزند ملا عبدالقادر نے عالم گیر ثانی لکھا ہے ممکن ہے کہ عالم گیر ثانی سے ان کے تعلقات کو عالم گیر کی جانب منسوب کر دیا گیا ہو۔

حجاز کا دوسرا سفر دکن میں قیام کے دوران ملا جیون کو اپنے والدین کی طرف سے حج بدل کا

(۱) بزمی انصاری، "ملا جیون"، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور، ج ۷، ص ۶۰۵ (۲) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۹۲ (۳) شیخ احمد جیون، خودنوشت، ورق ۳۵-۳۶۔

خیال ہوا، انہوں نے دو مرتبہ اپنی والدہ کو خواب میں دیکھا کہ وہ اس کی متمنی ہیں، چنانچہ ۱۱۱۲ھ/ ۱۷۰۰ء میں بادشاہ عالم گیر سے اجازت لے کر سفر حج پر روانہ ہوئے، اس وقت ان کی عمر چھیاسٹھ سال کی تھی، حجاز پہنچ کر انہوں نے پہلے سال اپنی والدہ کی طرف سے اور دوسرے سال اپنے والد کی جانب سے حج بدل کیا، اس اثنا میں انہوں نے صحیحین کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور اس کی تمام شرحیں پڑھ ڈالیں اور ایک رسالہ سوانح بھی جامی کی لوائح کے طرز پر علم سلوک میں تصنیف کیا، ۱۱۱۶ھ/ ۱۷۰۴ء میں دکن کے راستہ سے اپنے وطن امیٹھی واپس ہوئے۔(۱)

خرقہ تصوف اور اجازت ملا جیون جب امیٹھی پہنچے تو ان کی عمر ۷۰ برس ہو چکی تھی، وہاں پہنچنے پر بغداد سے شیخ عبد القادر جیلانی کے خاندان کے ایک بزرگ اور سجادہ نشین شیخ یاسین بن عبد الرزاق نے ان کی خدمت میں جامہ تصوف اور سند اجازت بھیجی، جس کو میر سید محمد قادری بلگرامی لے کر آئے، ملا جیون کے لیے یہ بڑی قیمتی سوغات تھی، چنانچہ انہوں نے اپنی خود نوشت میں اس کی پوری تفصیل لکھی ہے۔(۲)

دوبارہ دہلی کا سفر اور بہادر شاہ اول کی مصاحبت ملا جیون اپنے وطن امیٹھی میں مقیم رہے اور اس عرصہ میں حسب معمول درس و تدریس میں مشغول رہے، پھر ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء میں انہوں نے دوبارہ دہلی کا سفر کیا، ان کے شاگردوں کی بھی ایک کثیر تعداد ساتھ میں تھی، یہ قافلہ ۲۵ محرم ۱۱۱۹ھ/ ۱۷ اپریل ۱۷۰۷ء کو امیٹھی سے روانہ ہوا اور صفر کے آخر میں دہلی پہنچا، دہلی میں ان کا قیام بہت مختصر رہا اور غالباً وہ وہاں سے اپنے وطن واپس ہو رہے تھے کہ راستہ میں اجمیر کے قریب شاہ عالم سے ان کی ملاقات ہوئی، وہ انہیں اپنے ہمراہ لاہور لے کر چلا گیا اور وہاں وہ اس کے انتقال تک مقیم رہے، ۱۱۲۴ھ/ ۱۷۱۲ء میں وہ لاہور سے دہلی واپس آئے (۳)، اس مدت میں ان کی سرگرمیوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔

فرخ سیر سے قربت اور تعلق شاہ عالم کی وفات کے بعد ملا جیون جب دہلی آئے تو پھر آخر عمر تک یہیں رہ گئے، فرخ سیر نے بھی ان کے ساتھ اعزاز و اکرام کا معاملہ کیا، اس دوران امیٹھی اور اس کے گرد و نواح کے بے شمار لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بادشاہ سے اپنے لیے

(۱) شیخ احمد جیون، خود نوشت، ورق ۳۴ (۲) ایضاً (۳) ایضاً، ورق ۳۵-۳۶

جہاں را

بعا

چوں رحلت

بوصل

بتاریخش

ندا

ملا جیون کے لوح مز

و یتم نعمته علی

(۱) شیخ احمد جیون خودنوشت ورق

سابق ص ۱۳۱۔

اولاد شیخ عبدالقادر کے علاوہ ملا جیون کے تین اور فرزند تھے، شیخ محمد، شیخ عبدالصمد اور شیخ عبدالباسط، یہ سب صاحب علم وفضل تھے اور ان کی اولادیں بھی خوب پھلی پھولیں (۱)، مولانا امیر علی شہید جو اجودھیا کی ہنومان گڑھی کی مسجد کے سلسلہ میں ۲۷ صفر ۱۲۷۲ھ / ۸ نومبر 1855ء کو نوابان اودھ کے لشکر سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے، ملا جیون ہی کے خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے (۲)، ماضی قریب کے مشہور شاعر ممتاز امیٹھوی بھی اسی خاندان کے ایک فرد تھے (۳)۔

تصنیفات اوپر گزر چکا ہے کہ ملا جیون کا اصل مشغلہ درس و تدریس تھا، جس سے مدۃ العمر وہ وابستہ رہے، مگر اسی کے ساتھ ان کو تصنیف و تالیف سے بھی خاص شغف تھا اور اس کا آغاز ان کی طالب علمی کے زمانہ ہی سے ہو گیا تھا، ذیل میں ان کی تصنیفات کا تعارف پیش کیا جاتا ہے:

۱- آداب احمدی: یہ ملا جیون کی سب سے پہلی تصنیف ہے جو تیرہ سال کی نوعمری میں ۱۰۶۱ھ / ۱۶۵۱ء میں لکھی گئی، اس کتاب میں علم سلوک کے اصول و اسرار سے بحث کی گئی ہے، مگر اس کا کوئی نسخہ دست یاب نہیں ہے اور نہ ہی تذکرہ نگاروں نے یہ وضاحت کی ہے کہ یہ کس زبان میں تھی اور اس کے اہم مباحث کیا تھے۔

۲- خطبات جمعہ وعیدین: یہ خطبات بھی ملا جیون نے اپنی طالب علمی کے دور ہی میں مرتب کیے تھے جو فصیح و بلیغ عربی میں تھے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اوائل عمر ہی سے عربی زبان پر عبور اور قدرت حاصل تھی مگر افسوس کہ اس کا کوئی نسخہ دست یاب نہیں ہے۔

۳- خلاصہ وانتخاب شاطبی: علم تجوید و قرأت میں شاطبی کے منتخبات کا مجموعہ ہے، غالب قرینہ ہے کہ یہ رسالہ عربی میں رہا ہوگا، یہ بھی دست یاب نہیں ہے۔

۴- مثنوی فارسی: ملا جیون کے بیان کے مطابق یہ مثنوی پچیس ہزار اشعار پر مشتمل چھ دفتروں میں تھی، جس میں مولانا روم کا تتبع کیا گیا تھا۔

۵- دیوان فارسی: فارسی میں دیوان حافظ کے نہج پر پانچ ہزار اشعار کا ایک مجموعہ تھا۔

---

(۱) ملا عبدالقادر، تکملہ خودنوشت، ورق ۷-۸/۳ (۲) خادم حسن، ص ۵۰-۵۱ (۳) ڈاکٹر ام ہانی "شاہ محمد ممتاز علی آہ امیٹھوی"، ماہنامہ معارف، اعظم گڈھ، ج ۸۶، شمارہ ۳، ص ۲۰۸۔

تفسیر احمدی کی خصوصیات جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ یہ قرآن مجید کی مکمل تفسیر نہیں ہے بلکہ اس میں احکام ومسائل سے متعلق آیتوں کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے، اس تفسیر میں قرآن مجید کی اکسٹھ سورتوں سے دوسو ستہتر احکام پر بحث کی گئی ہے اور اس کی مکمل فہرست مقدمہ میں درج کردی گئی ہے، بقیہ سورتوں کے بارے میں ملا جیون نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ احکام سے خالی ہیں، تفسیر کی ترتیب قرآن مجید کی سورتوں کے مطابق ہے، آیات کی تشریح میں ان کے نزول کا پس منظر بھی بیان کیا ہے، الفاظ کی لغوی تحقیق اور فقہی مباحث میں فقہ اور علم کلام کی اہم کتابوں کی روشنی میں منطقیانہ استدلال بھی کیا ہے اور حنفی نقطہ نظر کو نمایاں کرکے پیش کیا ہے، زبان وبیان دل کش ودل آویز ہے، سجع وقوافی کی رعایت کے باوجود ادائے مطلب میں خلل واقع نہیں ہوا ہے۔

اس تفسیر کا اصل ماخذ امام رازی کی تفسیر کبیر معلوم ہوتا ہے، ترتیب وتبویب ابوبکر بن العربی اندلسی اور ابوبکر الجصاص الحنفی کی احکام القرآن کے انداز پر کی ہے، اس تفسیر کا محرک ملا صاحب نے امام غزالی کی ایک تصنیف کو بتایا ہے جو خود انہیں دست یاب نہیں ہوئی (۱)، اسی طرح ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان کو قدما کی کتابیں دست یاب نہیں ہوئیں، مگر ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے ماخذ سے انہوں نے قدما سے استفادہ کیا ہے۔

تفسیر کے مراجع اس تفسیر کی ترتیب میں ملا جیون کے پیش نظر علم تفسیر اور دیگر علوم کی جو کتابیں رہی ہیں، ان کی فہرست انہوں نے مقدمہ میں درج کی ہے، فن تفسیر میں انوار التنزیل و مدارک التاویل (امام بیضاوی)، تفسیر حسینی (ملا واعظ حسین کاشفی)، تفسیر کشاف (زمخشری)، تفسیر غوری زاہدی اور اصول تفسیر میں اتقان فی علوم القرآن کو انہوں نے اپنا ماخذ بتایا ہے، فقہ میں شرح وقایہ مع حواشی، ہدایہ مع شروح اور فتاوی حمادیہ، اصول فقہ میں اصول بزدوی، کشف الاسرار، شرح بزدوی، حسامی، توضیح مع شرح تلویح تفتازانی اور مختصر ابن حاجب وغیرہ اور علم کلام میں شرح عقاید اور شرح مواقف سید شریف جرجانی ان کا مرجع رہی ہیں۔ (۲)

ماخذ کی اس فہرست میں فن حدیث کی کسی کتاب کا ذکر نہیں ہے، جس سے اس عہد کے

(۱) شیخ احمد جیون، التفسیرات الاحمدیہ، ص ۴-۵ (۲) ایضاً ص ۵

ماحول کا اندازہ ہوتا ہے، جس میں حدیث پر فقہ کو غلبہ حاصل تھا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ خود ملا جیون کو پیرانہ سالی میں سفر حجاز کے دوران صحیحین کے مطالعہ کا موقع ملا۔ (۱)

ذیل میں تفسیر احمدی کے بعض مباحث پیش کیے جاتے ہیں، ان سے اس کی خصوصیات اور ملا جیون کے طریقہ استدلال اور ان کی نکتہ آفرینی کا اندازہ ہوگا۔

نبیین کی لغوی تحقیق

سورہ بقرہ کی آیت:

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِکَةِ وَالْکِتَابِ وَالنَّبِیِّیْنَ ...... وَاُولٰئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔ (البقرہ: ۱۷۷)

کچھ سارا کمال اس میں نہیں ہے کہ اپنا منہ مشرق کو کر لو یا مغرب کو، لیکن کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتابوں پر اور پیغمبروں پر ...... یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔

کی روشنی میں ملا جیون نے ایمان مفصل اور احکام اسلام کی تشریح کرنے کے بعد لکھا ہے:

> ''میرے خیال میں النبیین کو جمع مذکر سالم کے صیغہ میں ذکر کرنے سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ کوئی عورت کبھی نبی نہیں ہوئی، بلکہ تمام انبیا مرد تھے اور اس سے ان لوگوں کے قول کی تردید ہوتی ہے، جو چار عورتوں حواء، سائرہ، ام موسیٰ اور ام عیسیٰ کو نبی مانتے ہیں''۔ (۲)

ملا جیون نے آگے چل کر اس کی مزید وضاحت یوں کی ہے:

یہ دلیل ایک زمانہ سے میرے دل میں رہ رہ کر گونجتی تھی مگر جب میں اس میں غور وفکر کرتا تو اس بارے میں مزید الجھن پیدا ہوتی کیوں کہ اس کا احتمال ہے کہ جمع مذکر سالم کا صیغہ بربنائے تغلیب استعمال ہوا ہو جیسا کہ حضرت یوسف کے خواب کے واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنِّی رَأَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَیْتُھُمْ لِیْ سَاجِدِیْنَ۔ (سورہ یوسف: ۴)

میں نے گیارہ ستارے اور سورج و چاند کو دیکھا کہ وہ سب مجھ کو سجدہ کر رہے ہیں۔

(۱) شیخ احمد جیون، خود نوشت، ورق ۴۴ (۲) التفسیرات الاحمدیہ ص ۴۱

اس میں لفظ شمس کسی بھی طرح مذکر نہیں ہے، نہ تو سماعی طور پر اور نہ تاویلاً درست ہے، کیوں کہ کواکب تو حضرت یوسفؑ کے بھائی ہیں اور شمس وقمر یا تو ان کے والدین ہیں یا والد اور خالہ، مگر اس کے باوجود ان کو جمع مذکر سالم کا فرد بنایا گیا ہے، اس لیے مناسب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں قرآن مجید کی حسب ذیل آیت سے استدلال کیا جائے:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالاً نُوْحِيْ اِلَيْهِمْ ۔ (سورہ یوسف:۱۰۹)

آپ سے پہلے ہم نے نہیں بھیجے مگر ایسے لوگ جن پر ہم وحی بھیجتے ہیں۔

اس آیت میں گو سیاق کلام اس کا متقاضی ہے کہ کوئی فرشتہ نبی نہیں ہوا مگر اسی سے اشارتاً یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی عورت بھی نبی نہیں ہوئی۔(۱)

مسئلہ قصاص میں حنفی مسلک کی تائید

ملا جیون مسلکاً حنفی تھے، اس لیے انھوں نے اپنی تفسیر میں جا بجا اس مسلک کی تائید کی ہے، ذیل میں اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

قصاص کے مسئلہ میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے، امام شافعیؒ اور بعض دوسرے فقہا کے نزدیک آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے عوض غلام، مرد کے بدلے مرد اور عورت کے بدلے میں عورت ہی قتل کی جائے گی، ان حضرات کا استدلال اس آیت سے ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى الخ ۔ (البقرہ:۱۷۸-۱۷۹)

اے ایمان والو! تم پر مقتول کا قصاص فرض ہے، آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔

اس کے برخلاف فقہائے احناف آزاد کے بدلے غلام اور مرد کے بدلے عورت کا قتل درست قرار دیتے ہیں، وہ مذکورہ بالا آیت کو سورہ مائدہ کی آیت النفس بالنفس (۲) سے منسوخ مانتے ہیں اور مشہور حدیث ”المسلمون تتکافأ دماءھم“ کو بہ طور دلیل پیش کرتے ہیں، چنانچہ ملا جیون اس مسئلہ کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”یہ آیت وجوب قصاص میں برابری اور مساوات کے لیے عبارت النص

(۱) شیخ احمد جیون، التفسیرات الاحمدیہ، ص ۴۲ (۲) سورہ مائدہ: ۴۵

ہے اور مشروعیت قصاص یعنی مقتول کے بدلہ میں قاتل کو قتل کیے جانے کے سلسلہ میں اشارۃ النص ہے اس کی صراحت گو کسی نے نہیں کی ہے، مگر میں نے اس کو امام زاہد کے اس بیان سے مستنبط کیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جب دو قبیلوں کے درمیان لڑائی ہوتی تھی تو طاقت ور قبیلہ (بنو نضیر) کے لوگ کمزور قبیلہ (بنو قریظہ) کے دو آزاد آدمیوں کو اپنے ایک آزاد کے بدلہ میں اور ان کے ایک آزاد کو اپنے ایک غلام کے عوض میں قتل کرتے تھے، اسی طرح ان کے ایک مرد کو اپنی عورت کے بدلہ میں قتل کیا کرتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس فعل کو حرام قرار دیا گیا، اس طور پر آیت کا صحیح مطلب یہ ہوگا کہ اے ایمان والو! تم پر مقتول کا قصاص یعنی اس میں مساوات و برابری فرض کی گئی ہے نہ کہ زیادتی، چنانچہ اس کے بعد الحر بالحر والعبد بالعبد والانثی بالانثی کی وضاحت کر دی گئی، یعنی ایک آزاد کے بدلہ میں ایک آزاد ہی قتل کیا جائے دو نہیں اور غلام کے بدلہ میں غلام ہی قتل کیا جائے آزاد نہیں اور عورت کے عوض عورت ہی قتل کی جائے مرد نہیں"۔(۱)

ملا جیون آیت قصاص کو سورہ مائدہ کی آیت "النفس بالنفس" سے منسوخ نہیں مانتے بلکہ اس کی خوبصورت توضیح کرتے ہوئے فقہائے احناف کی تائید یوں کرتے ہیں:

"میرے نزدیک اس موقع کے لیے بہترین جواب یہ ہے کہ جب قصاص کا دارومدار مساوات پر ہے تو جس نے قتل کیا ہے اسی کو قتل کیا جانا چاہیے، خواہ مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام، کمسن ہو یا بڑا، صحت مند ہو یا مریض، آیت شریفہ میں الحر بالحر کی تعیین اس لیے کی گئی ہے کہ عرب صرف قاتل ہی کو قتل کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ غلام کے بدلے آزاد اور آزاد کے بدلے میں دو آزاد اور عورت کے بدلے میں مرد کو قتل کرتے تھے، پس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ آزاد نے اگر قتل کیا ہو تو اسے قتل کیا جائے اور اگر عورت قاتلہ ہو تو اسے قتل کیا جائے وغیرہ، اس طرح یہ آیت منسوخ ہوئے بغیر امام مالکؒ اور امام شافعیؒ

(۱) شیخ احمد جیون، التفسیرات الاحمدیہ، ص ۴۳

کے خلاف دلیل بن جائے گی"۔(۱)

ملا جیون کے اس قول کی تائید متاخرین علمائے احناف نے بھی کی ہے، مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

"اس میں اصل مقصود مساوات ہے، اس سے ان کے اس قول کی تردید مقصود ہے کہ ہمارے ایک آدمی کے بدلے میں دو آدمی قتل کیے جائیں گے، اس سے مرد اور عورت کے درمیان قصاص کی نفی نہیں ہوتی ہے"۔(۲)

وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ کی تفسیر سورہ بقرہ کی آیت

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ۔ (البقرہ:۱۷۳)	اس نے تو تم پر یہی حرام کیا ہے مردہ جانور اور لہو اور گوشت سور کا اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا۔

"اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے علاوہ کسی بت مثلاً لات وعزی یا کسی نبی وغیرہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے"۔

پھر انہوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان کے عہد میں جو جانور اولیاء اللہ کی نذر و نیاز کے طور پر ذبح کیے جاتے ہیں، ان کا کھانا حلال ہے کیوں کہ ذبح کے وقت ان پر غیر اللہ کا نام نہیں لیا جاتا ہے(۳)، ملا جیون کے اس قول پر صاحب تفسیر جواہر القرآن نے یہ اعتراض کیا ہے۔

"تفسیر احمدی میں دوسرے پارے کی تفسیر میں جو یہ لکھا ہے کہ اولیاء اللہ کی نذر و نیاز کا کھانا جائز ہے، مردود ہے الا آنکہ اس کی یہ تاویل نہ کی جائے کہ نذر کرنے والے کا مشرکانہ عقیدہ بدل گیا تو اس کا کھانا جائز ہے"۔(۴)

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بیان القرآن میں اس کو ذکر کر کے ملا جیون کا یوں دفاع کیا ہے:

---

(۱) شیخ احمد جیون، التفسیرات الاحمدیہ،ص ۴۴ (۲) مولانا اشرف علی تھانوی، تفسیر بیان القرآن، ج۱، اشرف المطابع، تھانہ بھون، ۱۳۵۳ھ/ ۱۹۳۴ء، ص۹۹ (۳) شیخ احمد جیون، التفسیرات الاحمدیہ،ص ۳۹ (۴) مولانا غلام اللہ خان، تفسیر جواہر القرآن (افادات مولانا حسین علی)، ج۱، فیروز سنز لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۵۱

"بعض لوگوں کو تفسیر احمدی کی عبارت سے جو شبہ ہوا ہے اس کا جواب اس کے منہیہ سے ظاہر ہے کہ ملا صاحب نے ایصال ثواب کی بنا پر حلت کا حکم لگایا ہے اور وہ بلا تاویل حلال نہیں کہتے ہیں"۔(۱)

مشرک اور اہل کتاب عورتوں سے نکاح کا حکم سورہ بقرہ کی آیت

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّى يُؤْمِنَّ ...... (البقرہ:۲۲۱)

مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔

کی تفسیر میں انہوں نے مفسرین اور فقہاء کے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد اپنی یہ رائے پیش کی ہے:

"میرا اپنا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "حتی یؤمن" کا مطلب یہ ہے کہ یہاں تک کہ وہ کسی نبی کی تصدیق کریں اور کسی کتاب کا اقرار کریں، مشرک اہل کتاب عورتوں کا بھی یہی حکم ہوگا"۔(۲)

تفسیر آیات میں ربط و نظم کا اہتمام ملا جیون نے اپنی تفسیر میں آیتوں کے درمیان باہمی مناسبت بھی دکھائی ہے، سورۂ بقرہ میں نہایت تفصیل سے روزہ کے احکام بیان ہوئے ہیں، مگر انہیں کے درمیان بعض ایسے امور بھی بیان کردیئے گئے ہیں جن کا بہ ظاہر احکام صیام سے کوئی تعلق نہیں ہے، مثلاً ارشاد باری ہے:

وَاِذَا سَأَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۔ (البقرہ:۱۸۶)

اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو میں قریب ہوں، منظور کرلیتا ہوں عرضی درخواست کرنے والے کی جب کہ وہ میرے حضور میں درخواست کرے، سوان کو چاہیے کہ میرے احکام کو قبول کیا کریں اور مجھ پر یقین رکھیں، امید ہے کہ وہ لوگ رشد حاصل کرسکیں گے۔

اس آیت سے پہلے روزہ کے مفصل احکام بیان ہوئے ہیں اور اس کے بعد اس میں سرزد

(۱) مولانا تھانوی، حوالہ سابق ص۹۷ (۲) شیخ احمد جیون، التفسیرات الاحمدیہ، ص۸۲

ہونے والی لغزشوں کا تذکرہ ہے، چنانچہ ملا جیون اس آیت کا ربط بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''یہ اس دعائے مغفرت کی قبولیت کا حکم ہے جو روزہ کے سلسلہ میں ہونے والی لغزشوں کی بنا پر بندوں کی جانب سے کی جاتی ہے اور اس طور پر یہ آیت اپنے ماقبل و مابعد سے مربوط ہو جاتی ہے''۔(۱)

سورۂ بقرہ کی ایک ہی آیت میں دو علاحدہ حکم ایک ساتھ بیان ہوئے ہیں، ارشاد باری ہے:

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ (البقرہ:۱۸۹)	آپ سے چاندوں کی حالت کی تحقیقات کرتے ہیں، آپ فرما دیجیے کہ وہ چاند آلہ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے لیے اور حج کے لیے اور اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں اس کی پشت کی طرف سے آیا کرو، ہاں لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص حرام سے بچے اور گھروں میں اس کے دروازوں سے آؤ اور خدائے تعالیٰ سے ڈرتے رہو، امید ہے کہ تم کامیاب ہو۔

ملا جیون نے آیت بالا میں دونوں علاحدہ حکموں کے درمیان ربط و تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اگر یہ کہا جائے کہ ان دونوں احکام میں باہم کیا رشتہ ہے اور یہ دونوں بغیر کسی مناسبت کے ایک ہی آیت میں کیوں ذکر کیے گئے ہیں، تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ یا تو یہ تعلق ہے کہ چاند کی منزلوں کو حج کا آلہ شناخت اوقات بتایا گیا ہے اور ان کا یہ فعل یعنی گھروں میں دروازہ کے بجائے پشت کی طرف سے داخل ہونا بھی زمانہ جاہلیت میں حج کا ایک فعل تھا، اس لیے ضمناً اس کا ذکر بھی حج کے ساتھ کیا گیا ہے، یا یہ ان لوگوں نے ان دونوں احکام کے بارے

(۱) شیخ احمد جیون، التفسیرات الاحمدیہ، ص ۵۵۔

میں سوال کیا تھا، اس لیے دونوں کے جوابات دیے گئے ہیں یا یہ کہ انہوں نے وہ بات دریافت کی جس کا تعلق خود ان سے ہے، علم نبوت سے اس کا کوئی سروکار نہیں ہے اور انہوں نے وہ بات نہیں پوچھی جس کا تعلق علم نبوت سے ہے تو ان کے سوال کا جواب دینے کے بعد اس کو بھی تاکیدی طور پر ذکر کیا گیا کہ تمہارے لیے تو بہتر یہ تھا کہ تم اس طرح کی باتیں دریافت کرتے اور ان کو جاننے کی کوشش کرتے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے ان کے الٹے سوالات پر تنبیہ مقصود ہو اور ان کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہو جو گھر کا دروازہ چھوڑ کر اس کی پشت کی جانب سے اس میں داخل ہو"۔(۱)

ملا جیون کے مندرجہ بالا بیان سے اس اہتمام اور کدوکاوش کا اندازہ ہوتا ہے جو انہوں نے آیات واحکام کی باہمی مناسبت بیان کرنے میں صرف کی ہے، سورۂ قیامہ کی مندرجہ ذیل آیتوں کا سیاق وسباق سے بہ ظاہر کوئی ربط نہیں ہے مگر ملا جیون نے اس سلسلہ میں اپنی منفرد اور دل چسپ رائے بیان کی ہے، وہ آیتیں یہ ہیں:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۔ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۔ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۔
(القیامہ:۱۶ تا ۲۱)

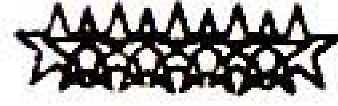
"اے پیغمبر! آپ قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجیے تاکہ آپ اس کو جلدی جلدی لیں ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کر دینا اور اس کا پڑھوا دینا، تو جب ہم اس کو پڑھنے لگا کریں تو آپ اس کے تابع ہو جایا کیجیے، پھر اس کا بیان کر دینا ہمارے ذمہ ہے، اے منکرو! ہرگز ایسا نہیں بلکہ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ بیٹھے ہو۔

ان آیتوں کی تفسیر میں ملا صاحب نے پہلے تو مفسرین کا یہ عام قول نقل کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ وحی کی آمد کے وقت جلدی جلدی اسے یاد رکھنے کے لیے دہرایا کرتے تھے تاکہ وہ محفوظ رہ جائے، پھر وہ لکھتے ہیں کہ اس صورت میں ان آیتوں کا تعلق ماقبل ومابعد کی آیتوں

(۱) شیخ احمد جیون، التفسیرات الاحمدیہ، ص ۶۴۔

سے منقطع ہو جاتا ہے، چنانچہ وہ اس کی دوسری تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان آیات کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ ان میں متکبر انسان کی قیامت کے دن کی حالت بیان کی گئی ہے، جب اعمال نامہ اس کو پڑھنے کے لیے دیا جائے گا کہ اے انسان اس اعمال نامہ کو پڑھنے میں جلدی نہ کر بلکہ اس میں غور کر اور ٹھہر، ہم نے اسے جمع کیا ہے، پھر جب ہم اسے پڑھیں تو اسے اقرار و تامل کے ساتھ پڑھ، پھر ہم اس کا بدلہ واضح طور پر دیں گے، اسی طرح آگے کی آیتیں بھی انسان کی حالت کو بیان کرتی ہیں، اس صورت میں تمام سلسلہ کلام مربوط ہو جاتا ہے''۔(۱)



شیخ احمد جیون، التفسیرات الاحمدیہ، ص ۹۰-۴۹۱

شیخ علی اصغر قنوجی

نام ونسب اور خاندانی حالات علی اصغر نام اور والد کا نام عبد الصمد تھا، ان کا تعلق شیخ عماد الدین کرمانی مولف فصول عمادیہ کے خاندان سے ہے اور سلسلہ نسب امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔

ان کے آباواجداد تلاش روزگار میں مدینہ طیبہ سے کرمان آکر بس گئے تھے، پھر وہاں سے شیخ عماد الدین کرمانی کے فرزند شیخ مبارک ہندوستان آئے اور قنوج میں اقامت گزیں ہوئے، اسی وقت سے اس خاندان کے لوگ قنوج میں آباد ہیں۔(۱)

ولادت ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۱ء میں قنوج میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش و پرداخت ہوئی۔(۲)

تعلیم قنوج ہی کے ایک عالم سید محمد حسینی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر مزید تعلیم مولانا عصمت اللہ سہارن پوری، مولانا محمد زمان کاکوروئی اور نواب دیانت خان سے پائی اور اخیر میں علامہ لطف اللہ کوڑوی سے آخری درجہ کی کتابیں پڑھ کر سند فضیلت حاصل کی، یہیں کے درس میں ان کے ہم سبق مشہور عالم ملا جیون امیٹھوی تھے۔(۳)

راہ سلوک شیخ علی اصغر کو تصوف وسلوک سے طبعی مناسبت تھی، اس لیے وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد براہ راست لکھنؤ کے لیے عازم سفر ہوئے اور وہاں انہوں نے شیخ پیر محمد لکھنوی سے بیعت کی اور ان کی خدمت میں رہ کر تصوف کے اوراد واشغال سیکھے، پھر ان سے خلافت حاصل کر کے قنوج لوٹے اور اپنی پوری زندگی یہیں نہایت خاموشی اور یکسوئی سے گزار دی۔

درس وافادہ قنوج میں انہوں نے تمام عمر درس وافادہ کا بازار گرم رکھا اور بے شمار لوگوں

(۱) آزاد، ماثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۵۰ (۲) عبد الحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۷۸ (۳) آزاد، ماثر الکرام، محولہ بالا، نواب صدیق حسن خان نے ان کے اساتذہ کی فہرست میں مولانا لطف اللہ کوڑوی کا نام نہیں لیا ہے، ملاحظہ ہو ابجد العلوم، مطبعہ صدیقیہ بھوپال، ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء، ص ۹۰۔

نے ان سے استفادہ کیا، آزاد بلگرامی کا بیان ہے:

"ومدت شصت سال درس گفت، خلقے کثیر در حوزہ درس او منتہائے فضیلت حاصل کردند"۔(۱)	مسلسل ساٹھ سال تک انہوں نے درس دیا اور بہت سے لوگ ان کے درس سے عالم و فاضل بن کر نکلے۔

شیخ علی اصغر کے دائرہ تلمذ میں خود ان کے فرزند ارجمند شیخ رستم علی قنوجی جو صاحب تصنیف مفسر گزرے ہیں شامل ہیں، ان کے علاوہ ان کے اہم تلامذہ میں مولوی محمد امجد محشی صدرا اور مولوی فتح علی قنوجی کے نام سرفہرست ہیں۔(۲)

اخلاق وعادات شیخ علی اصغر بڑے برگزیدہ اور متقی بزرگ تھے، آزاد بلگرامی کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہے، وہ لکھتے ہیں:

"فقیر دو سہ صحبت مولوی را دریافت ذات قدس معلیٰ بود"۔(۳)	فقیر کو دو تین مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے بڑی برگزیدہ اور مقدس شخصیت کے مالک تھے۔

شیخ علی اصغر کے ہم وطن نواب صدیق حسن خان قنوجی بھی ان کی عظمت و بزرگی کے معترف تھے، لکھتے ہیں:

"جامع بود میان علم شریعت وطریقت"۔(۴)	وہ شریعت وطریقت کے جامع بزرگ تھے۔

وفات ۱۵ر شعبان ۱۱۴۰ھ/۲۶/مارچ ۱۷۲۸ء کو وفات پائی اور اپنی مسجد کے سامنے ہی ایک چبوترہ پر دفن کیے گئے۔(۵)

آزاد بلگرامی نے تاریخ وفات کہی ہے:

"شد نہاں آفتاب صبح علوم: ۱۱۴۰ھ/۱۷۲۸ء"۔

اولاد شیخ علی اصغر کے صرف دو صاحب زادوں کا ذکر تذکرہ کی کتابوں میں ملتا ہے، ان

(۱) آزاد، ماثر الکرام، دفتر اول، ص ۲۵۰ (۲) نواب صدیق حسن خاں، حوالہ سابق، ۳۴-۳۳-۲-۹۳ (۳) آزاد، ماثر الکرام محولہ بالا (۴) نواب صدیق حسن خاں، تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار، مطبع شاہ جہانی، بھوپال، ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء، ص ۱۸۹ (۵) آزاد، ماثر الکرام، ص ۲۵۱، وعبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۱۷۸۔

کے علاوہ ان کی ازواج واولاد کا حال کچھ معلوم نہیں ہے۔

۱- مولانا محمد کامل (م ۱۱۴۶ھ/ ۱۷۳۳ء) یہ غالباً بڑے صاحب زادے تھے، سلسلہ نقش بندیہ کے مشائخ میں ان کا شمار ہوتا ہے اور ان سے خود ان کے برادر خورد شیخ رستم علی قنوجی نے اس سلسلہ کی اجازت حاصل کی تھی۔(۱)

۲- شیخ رستم علی (م ۱۱۷۸ھ/ ۱۷۶۴ء) یہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں اپنے والد کے جانشیں ہوئے۔(۲)

تصنیفات شیخ علی اصغر نے کئی کتابیں لکھیں اور ان کی اکثر کتابیں علم تصوف پر ہیں، انہوں نے ایک تفسیر ثواقب التنزیل کے نام سے لکھی جو ان کی آخری تصنیف ہے (۳)، نواب صدیق حسن خان کے بیان کے مطابق انہوں نے منظوم کتابیں بھی لکھیں (۴) جو فن شعر وشاعری سے ان کی واقفیت کی دلیل ہے، تاہم ان کا کوئی شعری مجموعہ دست یاب نہیں ہے، ان کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

۱- اللطائف العلیة فی المعارف الالـهیة : یہ کتاب فن تصوف میں شیخ ابن عربی کی فصوص الحکم کے طرز پر لکھی گئی ہے۔

۲- تبصرة المدارج : اس میں شیخ پیر محمد کے افادات جمع کیے گئے ہیں۔

۳- القصیدة المهیمنة فی النفحة المحمدیة : یہ غالباً ان کا کوئی متصوفانہ منظوم رسالہ تھا۔

۴- النفائس العلیة فی کشف اسرار المهیمنة: یہ قصیدہ مهیمنیہ کی شرح ہے۔

۵- شرح فصوص الحکم : نواب صدیق حسن خاں کے بیان کے مطابق فصوص کی تلخیص بھی انہوں نے کی تھی۔(۵)

تفسیر ثواقب التنزیل فی اشارة التاویل یہ تفسیر جلالین کے انداز کی ایک مختصر اور جامع تفسیر ہے جس کے بارے میں نواب صدیق حسن خاں کا بیان ہے کہ یہ جلالین سے زیادہ

(۱) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۸۷ (۲) نواب صدیق حسن خان، ابجد العلوم، ص ۹۳۲ (۳) آزاد ماثر الکرام، ص ۲۵۱ (۴) نواب صدیق حسن خاں، تقصار جیود الاحرار، ص ۱۸۹ (۵) ابجد العلوم، ص ۹۳۲۔

بلیغ اور متین ہے(۱)، اس کا ایک ناقص قلمی نسخہ کتب خانہ ریاست رام پور میں محفوظ ہے(۲)، اس کے علاوہ اس کے کسی اور نسخہ کا علم نہیں ہے، اسی طرح ان کی دوسری کتابوں کا کہیں سراغ نہیں لگتا ہے۔

تفسیر ثواقب التنزیل کی چند خصوصیات تفسیر ثواقب التنزیل کا جو نسخہ رام پور کے کتب خانہ میں ہے، اس میں صرف نوے صفحات ہیں جو سورۂ فاتحہ کے آغاز سے سورۂ بقرہ کی ابتدا تک خط نستعلیق میں لکھے ہوئے ہیں، اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے" الحمد للہ العلیم الحکیم، الذی انزل علی عبدہ کتابا فاتحته السبع المثانی والقران العظیم" اور اختتام اس نامکمل عبارت پر ہوا ہے" ذالک اشارۃ الی الم المذکور قبله بالمولف من هذه الحروف ......"۔

شیخ علی اصغر کی یہ تفسیر گو نامکمل ہے تاہم اس سے بھی اس کی بعض نمایاں خصوصیات کا پتا چلتا ہے، جن کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

۱- مکمل قرآن مجید کی سات ثواقب میں تقسیم، شیخ علی اصغر نے اس تفسیر میں پورے قرآن مجید کو سات ثواقب میں تقسیم کیا ہے، پہلے ثاقب میں تنہا سورہ فاتحہ ہے، اس کے بعد سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران کو دوسرے ثاقب میں رکھا ہے، چوں کہ تفسیر ناقص ہے، اس لیے مزید ثواقب کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ کہاں سے کہاں تک ہیں، یہ تصور انہوں نے سورہ فاتحہ کی سات آیات، سبع طوال اور حوامیم کی تعداد جو سات ہی ہے اس سے اخذ کیا ہے، جس سے ان کی ذہانت اور قرآن مجید سے شیفتگی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

۲- عدد سات کا خاص اہتمام، سات کا عدد چوں کہ ان کے نزدیک قرآن مجید کی اندرونی شہادتوں کی بنیاد پر اہم اور بابرکت ہے، اس لیے انہوں نے مسائل کی تشریح اور بحث و تحقیق میں بھی اس کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے، سورہ فاتحہ کی تفسیر کے بعد انہوں نے اعجاز قرآن کے موضوع پر بحث کی ہے اور اس میں بھی سات مسائل ذکر کیے ہیں۔

۳- سلاست بیان، شیخ علی اصغر کو عربی زبان پر عبور حاصل تھا، جس کا اندازہ ان کے

(۱) نواب صدیق حسن خان، ابجد العلوم، ص ۹۴۲ (۲) مولوی محمد نبی، فہرست کتب رام پور، ج ۱، ص ۲۶۔

طرز تحریر سے ہوتا ہے، حروف مقطعات پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"ولیعلم ان المقطعات فی اوائل السور من المتشابهات لا یعلم تاویله الا اللہ کما قیل ان لکل کتاب سرا و سر القرآن فواتح السور"۔ (۱)

جاننا چاہیے کہ سورتوں کے آغاز میں حروف مقطعات متشابہات کی قبیل سے ہیں جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے، جیسا کہ مقولہ ہے کہ ہر کتاب کا ایک راز ہوتا ہے اور قرآن کا راز سورتوں کے ابتدائی حصے میں ہے۔

۴- روایات اور اقوال ائمہ سے استدلال، اس تفسیر کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں دلائل کے طور پر روایتیں اور ائمہ کے اقوال بھی ذکر کیے گئے ہیں، پھر ان میں محاکمہ کر کے کسی ایک رائے کو ترجیح دی گئی ہے۔

۵ کتب لغت ونحو سے مراجعت، الفاظ کی لغوی تحقیق میں اہم کتب لغت ونحو سے بھی مدد لی گئی ہے، چنانچہ زجاج، سیبویہ، صاحب صراح اور تاج العروس کے حوالے اس میں بکثرت ملتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

(۱) شیخ علی اصغر، ثواقب التنزیل، ورق، ۴۳-۴۴

شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی

نام ونسب اور خاندانی حالات شاہ صاحب کا نام کلیم اللہ، پدر بزرگوار کا نام نور اللہ اور جد محترم کا احمد معمار تھا، ان کا سلسلہ نسب حضرت ابو بکر صدیقؓ سے ملتا ہے، تذکرہ کی کتابوں سے پتا چلتا ہے کہ ان کا خاندان خجند ہوتا ہوا لاہور پہنچا اور اس خاندان کے لوگ شاہ جہاں کے دور حکومت میں دہلی آ کر آباد ہوئے اور یہ لوگ معماری کا پیشہ کرتے تھے۔(۱)

شاہ کلیم اللہ کے دادا شیخ احمد معمار اور ان کے بھائی شیخ حامد اپنے عہد کے بڑے کمال عمارت گر اور نقشہ نویس تھے، شاہ جہاں نے جب لال قلعہ کی تعمیر کا منصوبہ بنایا تو ان ہی دونوں بھائیوں نے اس کا نقشہ بادشاہ کے روبرو رکھا جس کے موافق اس قلعہ کی تعمیر ہوئی (۲)،

(۱) حاجی نجم الدین، مناقب المحبوبین، مطبع محمد حسن رام پور، ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء، ص ۴۵، حاجی نجم الدین نے شاہ کلیم اللہ کے دادا احمد معمار کو شیخ حامد کا فرزند بتایا ہے مگر مولانا سید سلیمان ندوی کی تحقیق کے مطابق وہ ان کے بڑے بھائی تھے، ملاحظہ ہو: سید سلیمان ندوی، تاج محل اور لال قلعہ کے معمار، مقالات سلیمان، ج ا، مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، معارف پریس، اعظم گڈھ، ۱۹۶۶، ص ۳۰۰، ۳۰۱، پروفیسر نذیر احمد کی تحقیق یہ ہے کہ شیخ احمد معمار کے والد کا نام برخوردار تھا، ملاحظہ ہو: پروفیسر نذیر احمد، استاد احمد معمار تاج محل کے بارے میں کچھ نئی معلومات، غالب نامہ، جولائی ۱۹۹۱، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ص ۱۸۱، حاجی نجم الدین نے شاہ صاحب کے خاندان کا اصل وطن خجند بتایا ہے، مگر شاہ صاحب کے تایا لطف اللہ مہندس نے اپنی کتاب منتخب الحساب کے دیباچہ میں یہ صراحت کردی ہے کہ ان کے والد لاہور سے دہلی آئے تھے، مولانا سید سلیمان ندوی نے اس خاندان کے لاہوری ہونے کی متعدد دلیلیں پیش کی ہیں، ملاحظہ ہو: سید سلیمان ندوی، حوالہ سابق ص ۲۹۶، ۳۱۶، ۳۲۱، ۳۲۷، ۳۳۰، ۳۳۳ (۲) منشی ذکاء اللہ دہلوی، تاریخ ہندوستان، ج ۸، ص ۴۰۔

محمد صالح کنبوہ کا کہنا ہے کہ یہ تعمیر شاہ صاحب کے دادا احمد معمار کی ہی نگرانی میں ہوئی (۱)، ان کا دوسرا اہم کارنامہ آگرہ میں ممتاز محل کے روضہ کی تعمیر ہے، ان کے علاوہ عہد شاہ جہانی کی دوسری عمارتیں بھی انہوں نے بنائیں جس کی بنا پر وہ معمار شاہ جہانی کہلاتے تھے اور ان کے ساتھ ان کے بھائی استاد حامد اور خود ان کے لڑکے ان کے تعمیری کاموں میں شریک رہتے تھے، تاج محل کی تعمیر ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۱ء میں مکمل ہوئی اور لال قلعہ ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء سے شروع ہو کر ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء میں تکمیل کو پہونچا اور اسی کے دوسرے سال ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء میں شیخ احمد کا انتقال ہوا۔

۱۰۶۱ھ/۱۶۵۰ء میں دہلی کی جامع مسجد جب تعمیر ہوئی اس وقت شیخ احمد موجود نہ تھے، اس لیے اس کو بنانے میں ان کے بھائی استاد حامد اور شیخ احمد کے لڑکوں نے نمایاں حصہ لیا، کہا جاتا ہے کہ استاد حامد کے ساتھ ایک دوسرا عمارت گر استاد ہیرا ان کا شریک کار تھا، جامع مسجد میں بیرونی محرابوں کے اوپر دیوار میں مسجد بنائے جانے کی جو تاریخ فارسی عبارت میں بخط نسخ تحریر ہے وہ شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کے والد بزرگوار اور شیخ احمد کے سب سے چھوٹے فرزند حاجی نور اللہ کی باکمال انگلیوں کا اعجاز ہے اس کتبہ کے آخر میں بسمت شال کتبہ نور اللہ احمد لکھا ہوا ہے۔

شاہ کلیم اللہ کے والد تین بھائی تھے: ۱- عطاء اللہ رشیدی نادر العصر، ۲- لطف اللہ مہندس، ۳- نور اللہ معمار یہ تینوں بھائی ہندسہ اور عمارت گری کے فن میں مہارت رکھتے تھے اور نور اللہ کو جو سب سے چھوٹے تھے، اس فن میں اس درجہ کمال حاصل تھا کہ معمار کا موروثی لقب صرف انہیں کو ملا، انہیں نظم ونثر میں بھی درک حاصل تھا، غرض پورا خاندان فن عمارت گری میں نمایاں اور ممتاز تھا اور اسی کے ساتھ علم وفن سے بھی بہرہ ور تھا۔ (۲)

شاہ کلیم اللہ کے والد حد درجہ خلیق اور ملن سار تھے، ان کا نکاح شاہی دربار کے ایک متوسل مولوی احمد علی کی صاحب زادی سے ہوا جن کے بطن سے یہ بدر منیر طلوع ہوا۔

ولادت شاہ کلیم اللہ کی ولادت ۲۴/ جمادی الثانی ۱۰۶۰ھ/۱۴/ جون ۱۶۵۰ء کو شاہ جہاں آباد (دہلی) میں ہوئی، اسی لیے وہ شاہ جہاں آبادی کہلائے۔

(۱) محمد صالح کنبوہ: عمل صالح، ج ۳، اردو ترجمہ از ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، ص ۴۹۶ (۲) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: مقالات سلیمان، محولہ بالا۔

تعلیم و تربیت شاہ صاحب ایک صاحب کمالات خانوادہ کے چشم و چراغ تھے، اس لیے ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی گئی اور خود انہوں نے نہایت جاں فشانی اور محنت سے حصول علم کیا، ان کے اساتذہ میں شیخ برہان الدین معروف بہ شیخ بہلول اور شیخ ابو الرضا برادر کلاں والد شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نام ملتے ہیں۔

حلقہ درس تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے چند برس مطالعہ میں گزارے اور بعض درسیات کی کتابوں پر شروح و حواشی لکھے، پھر اپنے پدر بزرگوار کے حکم کی تعمیل میں زینت المساجد دہلی کے دالان میں باقاعدہ درس کا سلسلہ شروع کیا اور یہ سلسلہ تقریباً دس سال تک جاری رہا اور اس دوران بے شمار تشنگان علم نے اپنی پیاس بجھائی۔

تصوف و سلوک درس و تدریس کے زمانہ میں شاہ صاحب کی ملاقات ایک مرد عارف سے ہوئی جس کے اثر سے وہ معلمی کا مشغلہ ترک کر کے تربیت و سلوک کی راہ پر گامزن ہوئے اور اس راہ میں بڑی مشقت و ریاضت برداشت کی اور دہلی کے ایک بزرگ محمد صادق خلیفہ میاں پیر محمد سلونی کی خدمت میں حاضری دینے لگے، انہوں نے جب ان کی طلب صادق دیکھی تو ان کو مشورہ دیا کہ وہ مزید حصول معرفت کے لیے مدینہ منورہ شیخ یحییٰ مدنی کے پاس جائیں۔

سفر حجاز غرض وہ حجاز کے سفر پر روانہ ہوئے، پہلے مکہ معظمہ پہنچے اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور وہاں کے مشائخ میں میر محترم سے نقشبندی طریقہ کی سند و اجازت حاصل کی اور شیخ محمد غیاث سے قادری سلسلہ میں بیعت ہوئے (۱) پھر مدینہ منورہ شیخ یحییٰ مدنی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بیعت ہوئے، مدینہ طیبہ میں وہ طویل عرصہ تک مقیم رہے اور شیخ یحییٰ مدنی کے علاوہ وہاں کے دوسرے بزرگوں سے بھی کسب فیض کیا (۲)۔

مراجعت وطن سرزمین حجاز میں حصول علم و معرفت کے بعد وہ دہلی واپس ہوئے اور جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان بازار خانم میں سکونت پذیر ہوئے، جو اس وقت دہلی کا سب سے بارونق بازار تھا، تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ یہ جگہ ان کے خاندان کو شاہ جہاں نے عطا کی تھی کیوں کہ لال قلعہ اور جامع مسجد کے معماروں کے لیے وہی موزوں ترین جگہ تھی، مولانا

(۱) عبد الحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۴۰-۲۴۱ (۲) آزاد، ماثر الکرام، دفتر اول، ص ۴۲۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"دہلی کے ایک قدیم معزز خاندان کے ایک واقف کار (سید مرتضیٰ صاحب ہیڈ کلرک دفتر کمانڈر ان چیف دہلی) کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ استاد حامد اور استاد احمد (جد شاہ کلیم اللہ) دونوں بھائی تھے، استاد حامد کے نام سے کوچہ اوستاد حامد دہلی میں اب تک دریبہ اور جامع مسجد کے درمیان موجود ہے اور ان کی اولاد دہلی میں سکونت پذیر ہے اور لاہور والے کہلاتے ہیں اور آج کل سادہ کاری کا کام کرتے ہیں"۔(۱)

شاہ کلیم اللہ نے اپنے آبائی مکان میں درس و تدریس کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا جس کی شہرت بہت جلد اکناف ملک میں پھیل گئی اور دور دور سے طلبہ تحصیل علم کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے، یہ تمام طلبہ شاہ صاحب کے گھر ہی پر مقیم رہ کر اپنے اسباق پڑھتے تھے، البتہ ان کو خوراک اور لباس حکومت مہیا کرتی تھی۔

شاہ صاحب علم ظاہر اور علم باطن دونوں کے جامع تھے، اس لیے جو طلبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، ان میں سے بعض علم باطن سے بھی مالا مال ہوتے تھے، شاہ صاحب کو درس حدیث سے خاص شغف تھا، مرزا مظہر جان جاناںؒ ایک مرتبہ ان سے ملنے آئے تو دیکھا کہ صحیح بخاری کے درس میں مشغول ہیں۔(۲)

دعوت وارشاد شاہ کلیم اللہ جب دہلی میں مسند علم پر جلوہ افروز ہوئے، اس وقت اورنگ زیب عالم گیر کی حکومت کا آخری زمانہ تھا اور اس وقت ملک کے عام سیاسی حالات نہایت ابتر تھے، اسی طرح ملک کی مذہبی و اخلاقی حالت بھی اچھی نہ تھی، ان حالات میں شاہ صاحب نے رشد و اصلاح کا فریضہ انجام دیا، چنانچہ انہوں نے اپنے باکمال خلفا کو مختلف مقامات پر اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے روانہ فرمایا، جن میں سرفہرست ان کے عزیز ترین خلیفہ شیخ نظام الدین تھے، جن کو دکن روانہ فرمایا تھا، وہ شاہی لشکر کے ہمراہ دکن گئے اور کچھ مدت تک لشکر ہی میں کام کرتے رہے، جس کے نتیجہ میں لشکر کے لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے، پھر بیجاپور اور برہان پور میں وہ مقیم

(۱) سید سلیمان ندوی، حوالہ سابق، ص ۱۰۱ ۳ (۲) حافظ محمد حسین مراد آبادی، انوار العارفین، ص ۴۳۰۔

رہے اور آخر میں اورنگ آباد جا کر مستقل سکونت اختیار کی اور وہاں خانقاہ نظامیہ قایم کی۔

شاہ صاحب کے تربیتی خطوط شاہ صاحب اپنے خلفا کو برابر تربیتی ہدایت نامے بھیجا کرتے تھے، جن کے مطالعہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ابتر معاشرتی حالات سے حد درجہ کبیدہ خاطر تھے، اس لیے برابر وہ اپنے خلفا کو دعوت دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کی تلقین کرتے تھے، اپنے خلیفہ شیخ نظام الدین کو لکھتے ہیں:

"تم کو اللہ تعالیٰ نے دکن کی ولایت عطا فرمائی ہے، تم یہ کام پورے طور پر انجام دو، میں نے اس سے پہلے تم کو لکھا تھا کہ لشکر میں جاؤ لیکن اب یہ حکم ہے کہ جہاں کہیں ہو اعلائے کلمۃ الحق میں مصروف رہو اور اپنے جان و مال کو اسی میں ہی صرف کر دو"۔(۱)

شاہ صاحب لوگوں کی مادیت پسندی دیکھ کر بہت رنجیدہ رہتے تھے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"بندگان خدا کے دل سے دنیا کی محبت ختم کر دینا چاہیے"۔

اے دوست دنیا نفس پروری اور تن آسانی کی جگہ نہیں ہے......۔(۲)

اشاعت اسلام شاہ صاحب اشاعت اسلام کے فرض سے بھی غافل نہیں تھے، وہ اپنے مریدوں کو بھی اس کے لیے کمر بستہ رہنے کی دعوت دیتے تھے، ایک مرتبہ شیخ نظام الدین نے ایک شخص کے لیے خلافت کی سفارش کی تو ان کو لکھا کہ:

"جب تک اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کمر ہمت نہ باندھی جائے، خلافت سے کیا فایدہ"۔(۳)

غرض اس باب میں شاہ صاحب کی عام تعلیم یہ تھی:

"......دینی و دنیاوی فیض دنیا کو پہنچاؤ، اپنا عیش و آرام لوگوں پر قربان کر دو...... ہر حال میں اعلائے کلمۃ الحق کے لیے کوشش کرتے رہو اور اسلام کی آواز مشرق سے مغرب تک پہنچا دو،...... اعلائے کلمۃ الحق میں کوشش کرتے رہو اور اس کام کو معمولی خیال مت کرو، کیوں کہ خدا اسی کام سے خوش ہوگا، لوگوں کی

(۱) محمد قاسم کلیمی، مکتوبات کلیمی، مطبع یوسفی، دہلی، ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۲ء، ص ۲۶ (۲) ایضاً، ص ۱۹ و ۵۹ (۳) ایضاً ص ۲۹۔

اصلاح میں لگے رہو، انبیاؑ بھی اسی کام کے لیے مبعوث ہوئے تھے"۔(۱)
ایک مکتوب میں اپنے مرید محمد علی کو لکھتے ہیں:

"اعلائے کلمۃ الحق ہمارے پیروں کا مسلک ہے، تم بھی اس میں کوشش کرتے رہو"۔(۲)

اور اپنے تمام مریدوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

"اسلام کی اشاعت میں خوب کوشش کرو"۔(۳)

غرض شاہ صاحب کی رہنمائی و توجہ اور ان کے خلفا کی سعی و محنت سے بہت سے غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے، شیخ نظام الدین کی تبلیغ و تلقین سے دکن میں کئی غیر مسلم خاندان مسلمان ہوئے (۴)، اس کی اطلاع جب شاہ صاحب کو ہوئی تو بہت مسرور ہوئے اور ان کو تحریر فرمایا کہ:

"بہر حال مقصد دنیا والوں کو فیض محمدی پہنچانا ہے، یہ کام جس طرح بھی ہو سکے سرانجام دینا چاہیے"۔(۵)

نومسلموں میں بعض اسلام کے اظہار و اعلان میں تامل کرتے تھے، اس کی اطلاع جب شاہ صاحب کو ہوئی تو شیخ نظام الدین کو لکھا ہے کہ:

"میرے بھائی، اس بات کی کوشش کرو کہ آہستہ آہستہ یہ بات ہو جائے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام کو مخفی نہ رکھا جائے، ایسا نہ ہو کہ مرنے کے بعد لوگ ان سے وہ معاملہ کر بیٹھیں جو غیر مسلموں کے ساتھ کیا جاتا ہے"۔(۶)

طریقہ تربیت شاہ صاحب نے اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت کا بھی عمدہ انتظام کیا تھا، وہ ان کے اعمال و اشغال اور اخلاق و اطوار کی مکمل نگرانی کرتے تھے اور دہلی میں رہنے کے باوجود ان تمام خلفا سے باخبر رہتے تھے جو بیرون دہلی دعوتی و تبلیغی کام پر مامور تھے، ان کی معمولی کوتاہیوں پر ان کو متنبہ فرماتے تھے اور سب کو یہ تاکید کر رکھی تھی کہ وہ اپنے حالات سے ان کو مطلع کرتے رہیں اور ان کے تمام مرید اس کی پابندی کرتے تھے اور ان کی اجازت کے بغیر کوئی قدم

(۱) محمد قاسم کلیمی، مکتوبات کلیمی، ص ۶۰ و ۶۲ (۲) ایضاً، ص ۸۸ (۳) ایضاً، ص ۶۰ (۴) شبیر احمد چشتی، حیات کلیم، آستانہ بک ڈپو، دہلی، ص ۴۸ (۵) محمد قاسم کلیمی، حوالہ سابق، ص ۴۶ (۶) ایضاً، ص ۲۶۔

نہیں اٹھاتے تھے، شاہ صاحب وقت کی پابندی پر خاص زور دیتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ:

''جو شخص وقت کا پابند نہیں وہ خسرالدنیا والآخرۃ کے مصداق ہے''۔(۱)

وہ اپنے مریدوں کو تساہل اور تن آسانی سے بھی منع کرتے تھے، ارشاد فرماتے ہیں:

''تم اپنے کام میں اور زیادہ سرگرم ہو جاؤ، یہاں تک کہ جو شخص تمہارے پاس پہنچے وہ بھی تمہارا کام کرنے لگے''۔(۲)

وہ اپنے خلفا کو اپنے سلسلہ کی اشاعت کی بھی تلقین کرتے تھے، تاکہ یہ سلسلہ رشد و اصلاح آیندہ بھی جاری رہے۔

اتباع شریعت کی تاکید شاہ صاحب برابر اپنے تمام مریدین و خلفا کو اتباع شریعت کی تلقین فرماتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ شریعت کو نظر انداز کر کے کسی شخص کو روحانی ترقی حاصل نہیں ہوسکتی، ایک مکتوب میں اپنے خلیفہ شیخ نظام الدین کو تحریر فرماتے ہیں:

''سب داخل سلسلہ لوگوں کو تاکید کرنی چاہیے کہ ظاہر کو شریعت سے آراستہ اور باطن کو عشق مولی سے پیراستہ رکھیں''۔(۳)

ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں:

''اے بھائی، اگر کسی فقیر کا درجہ و مرتبہ معلوم کرنا چاہو تو دیکھو کہ وہ شریعت کا کس حد تک پابند ہے، فقیر کی شناخت کا معیار شریعت ہی ہے، اسی کسوٹی پر کھرے کھوٹے کو پہچانا جاسکتا ہے''۔(۴)

شاہ صاحب شریعت پر عمل نہ کرنے والے اصحاب طریقت کو گمراہ بتاتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''جو شخص شریعت میں راسخ نہیں وہ ناقص ہے، اس کے بغیر اس کی طریقت یا حقیقت کا اثاثہ بے قیمت ہے، مرد کامل وہ ہے جو شریعت، طریقت اور حقیقت تینوں کا جامع ہو''۔(۵)

وفات شاہ صاحب کو اخیر عمر میں نقرس اور وجع المفاصل کے امراض لاحق ہو گئے تھے(۶)،

(۱) محمد قاسم کلیمی، مکتوب ۲۲ (۲) ایضاً، ص ۵۴ (۳) ایضاً، ص ۱۹ (۴) ایضاً مکتوب ۱۲۹ (۵) ایضاً (۶) ایضاً، ص ۹۳

اسی مرض میں ان کا انتقال ہوا اور اپنی مسکونہ حویلی میں مدفون ہوئے (۱)، ان کی تاریخ وفات ۲۴ / ربیع الاول ہے، البتہ سنِ وفات میں اختلاف ہے، صاحب نزہۃ الخواطر نے ۱۱۴۱ھ / ۱۷۲۸ء بتایا ہے (۲)، اس کی تائید ان کے ایک مرید کی اس تاریخ وفات سے ہوتی ہے:

کلیم اللہ عارف صاف بودہ
باقلیم بقا شوقش ربودہ
پرسیدم چوں تاریخ وفاتش
خرد گفتا۔ کہ ذات پاک بودہ (۳)
۱۱۴۱ھ / ۱۷۲۸ء

اس کے برخلاف آزاد بلگرامی نے ان کا سال وفات ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء بتایا ہے اور یہی ان کے مزار پر بھی کندہ ہے:

فضل و کمال خویش بود
مرہم قلب ریش بود
سال وفاتش گفتہ ہاتف
قطب زمانہ خویش بود (۴)
۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء

اولاد شاہ کلیم اللہ کے چار لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں، لڑکوں کے نام خواجہ محمد، حامد سعید، محمد فضل اللہ اور محمد احسان اللہ تھے اور بچیوں کے نام یہ تھے، بی بی رابعہ، فخر النسا، زینب جو بی بی مصری کے نام سے مشہور تھیں، ان کی اولاد میں خواجہ محمد شاہ صاحب کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے۔

اخلاق و عادات شاہ کلیم اللہ متواضع، خلیق، سادگی پسند، متحمل المزاج اور حلیم الطبع بزرگ تھے، وہ دشمنوں اور مخالفوں سے بھی کبھی ناراض نہیں ہوئے، ان سے انتقام لینا تو در کنار وہ ہمیشہ ان کے لیے دعا گو رہتے تھے، اپنے مریدوں کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے کہ لوگوں کی جفا اور درشتی

(۱) آزاد، ماثر الکرام، دفتر اول، ص ۳۴۳ (۲) عبد الحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۶ ص ۲۴۱ (۳) پروفیسر خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، اشوکا پریس، دہلی، ۱۹۵۳ء، ص ۴۲۱، بحوالہ شجرۃ الانوار، قلمی (۴) آزاد، ماثر الکرام، ج ۱، ص ۳۴۳

کو برداشت کریں، ان کا کہنا تھا کہ ہمارا کام دلوں کو جوڑنا ہے، اس راہ میں جتنی مشکلات پیش آئیں ان کو خندہ پیشانی سے انگیز کرنا چاہیے، دکن میں ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے ان کو برا بھلا کہا جس سے ان کے عزیز شاگرد شیخ نظام الدین کو دکھ ہوا اور انہوں نے اس کی اطلاع شاہ صاحب کو دی تو اس کے جواب میں ان کو لکھا کہ:

> ''کوئی شخص ہم کو برائی سے یاد کرتا ہے تو اس میں کیا مضایقہ، ہم تو اس سے بھی زیادہ برے کہے جانے کے مستحق ہیں، یہ تو اس کا کرم ہے کہ اس نے ہم کو کم برا بھلا کہا، ہم نے اسے معاف کیا، تم بھی اسے معاف کردو''۔(۱)

استغنا و بے نیازی شاہ کلیم اللہ بڑے غیرت مند اور بارعب تھے، اپنے مکان کا ایک حصہ کرایہ پر دے رکھا تھا اور اسی معمولی رقم پر گزر اوقات کرتے تھے، کبھی کبھی مقروض بھی ہو جاتے مگر کسی کے آگے دست سوال دراز کرنا گوارا نہ تھا، امرا و سلاطین کے ہدیے بھی قبول نہیں کرتے تھے، فرخ سیر نے کئی دفعہ ان کی مالی مدد کرنی چاہی مگر انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا، اس نے خواہش کی کہ اس کو ان کی خدمت میں حاضری کی اجازت دی جائے تو کہلا بھیجا کہ یہ بات ہمارے لیے اذیت کا باعث ہوگی، شاہ صاحب جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے جب جامع مسجد جاتے تو وہاں بادشاہ بھی ہوتا تھا مگر اجازت کے بغیر اس کو بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔(۲)

تصنیفات شاہ کلیم اللہ نے متعدد مفید اور اہم کتابیں یادگار چھوڑیں، ان کی تعداد بتیس بتائی گئی ہے(۳) لیکن ان کی اکثر کتابیں ناپید ہیں جن کتابوں کا سراغ ملتا ہے، ان کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے:

۱-**عشرہ کاملہ** : یہ تصوف کے موضوع پر ہے، اس میں تصوف کے دس مسائل کی تشریح کی گئی ہے، یہ کتاب عربی میں ہے اور چھپ چکی ہے۔

(۱) محمد قاسم کلیمی، حوالہ سابق (۲) پروفیسر خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، ص ۳۸۸، بحوالہ خواجہ گل محمد احمد پوری، تکملہ سیر الاولیا، ص ۸۵ (۳) ایضاً، ص ۳۹۰، بحوالہ احمد اختر مرزا، مناقب فریدی، مطبع احمدی، دہلی، ص ۳۴۔

۲- سواء السبیل : یہ بھی تصوف کے موضوع پر اور عربی میں ہے، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ ریاست رام پور میں ہے، حیات کلیم کے مرتب نے اس کے منتخب اقتباسات کا اردو ترجمہ اپنی کتاب میں درج کیا ہے، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب علمی انداز میں لکھی گئی ہے اور اس میں تصوف وعقاید کے دقیق مباحث پر گفتگو کی گئی ہے۔

۳- کشکول : یہ کتاب فارسی میں ہے اور ان کی سب سے مشہور ومقبول تصنیف سمجھی جاتی ہے، ۱۱۰۱ھ/ ۱۶۸۹ء میں بعض احباب کی فرمایش پر یہ لکھی گئی اور فن تصوف میں اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ متاخرین صوفیا اپنے مریدوں کو خرقہ خلافت کے ساتھ یہ کتاب بھی دیتے تھے، یہ کتاب طبع ہو چکی ہے اور اس کا سلیس اردو ترجمہ حیات کلیم کے مولف نے کیا ہے جو ان کی کتاب میں شامل ہے۔(۱)

۴- مرقع : یہ بھی فارسی میں ہے اور اس کی حیثیت کشکول کے ضمیمہ کی ہے، یہ کتاب مطبوعہ ہے اور اس کا بھی اردو ترجمہ حیات کلیم میں موجود ہے۔(۲)

۵- تسنیم : یہ کتاب بھی صوفیا کے حلقہ میں بڑی مقبول تھی، قاضی محمد عاقل بڑے والہانہ انداز میں اس کو پڑھاتے تھے، ان کے ایک مرید مولانا عبداللہ نے اس کی شرح بھی لکھی ہے مگر یہ کتاب دست یاب نہیں ہے۔(۳)

۶- رسالہ تشریح الافلاک عاملی محشی بالفارسیة : یہ رسالہ علم ہیئت میں ہے، شاہ صاحب کے خاندان میں اس علم کا عام رواج تھا، اس کا ایک نادر نسخہ نذیریہ پبلک لائبریری دہلی میں موجود ہے۔(۴)

۷- شرح القانون : ابن سینا کی کتاب القانون کی شرح ہے، مولانا عبدالحئی کے بیان کے مطابق اس کا واحد نسخہ رام پور کے کتب خانہ حامدیہ میں ہے۔(۵)

۸- مکتوبات : یہ شاہ صاحب کے ایک سو بتیس مکتوبات کا مجموعہ ہے، جو فارسی میں

(۱) شبیر احمد چشتی، حیات کلیم، ص ۱۱۳ تا ۱۸۰ (۲) ایضاً، ص ۱۹۵ تا ۲۴۶ (۳) پروفیسر خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، ص ۳۹۴ بحوالہ گل محمد، تکملہ سیر الاولیا، ص ۱۵۶ (۴) ایضاً، ص ۳۹۵ (۵) عبدالحئی، نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۲۴۱۔

ہے، محمد قاسم کلیمی نے ان کو مطبع یوسفی دہلی سے ۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۳ء میں طبع کرایا ہے، اس مجموعہ میں سو سے زاید خطوط شیخ نظام الدین کے نام ہیں، باقی دوسرے مریدوں کے نام ہیں، اس سے شاہ صاحب کے عہد کے سیاسی و معاشرتی حالات کے علاوہ ان کی علمی و دعوتی سرگرمیوں کا بھی پتا چلتا ہے۔

۹- ملفوظات : شاہ صاحب کے ملفوظات کا بھی مجموعہ تھا، جس کو حیات کلیم کے مرتب نے اردو کا جامہ پہنایا ہے، اس کا اسلوب و انداز مکتوبات ہی جیسا ہے۔(۱)

تذکرہ کی کتابوں میں ان کی بعض اور کتابوں کے نام ملتے ہیں، مثلاً الہامات کلیمی، التکسیر، رد روافض وغیرہ، اسی طرح علم منطق میں بھی ان کا ایک رسالہ بتایا جاتا ہے۔(۲)

تفسیر قرآن القرآن بالبیان یہ شاہ صاحب کی سب سے اہم تصنیف ہے جو عربی میں قرآن مجید کی مختصر تفسیر ہے، یہ تفسیر جلالین کی ہم پایہ سمجھی جاتی ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ جلالین میں شافعی مسلک کی رعایت کی گئی ہے اور یہ تفسیر حنفی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے۔(۳)

یہ تفسیر ۱۱۲۵ھ/ ۱۷۱۳ء میں لکھی گئی، یہ دراصل قدیم اہم تفسیروں کی ایک جامع تلخیص ہے، شاہ صاحب اس کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"یہ علمائے ملت حنفیہ بیضاء کی تفسیروں سے ماخوذ ہے، اس کا نام قرآن القرآن بالبیان رکھا ہے، میں کلیم اللہ جہاں آبادی مذہباً حنفی اور مشرباً صوفی ہوں، یہ تصنیف ۱۱۲۵ھ/ ۱۷۱۳ء میں مکمل ہوئی"۔(۴)

۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء میں میرٹھ کے مطبع احباب سے شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمہ قرآن مجید کے حاشیہ پر یہ تفسیر طبع ہوئی ہے، اس کے علاوہ غالباً یہ تفسیر الگ سے شایع نہیں ہوئی، مطبع احباب کے نسخہ پر مولانا محمد قاسم نانوتوی کی کہی ہوئی یہ تاریخ بھی درج ہے۔

کار فرمائے مطبع احباب

(۱) شبیر احمد چشتی، حوالہ سابق، ص ۹۶ تا ۱۰۶ (۲) حاجی نجم الدین، حوالہ سابق، ص ۴۶ (۳) سید تصدق حسین، فہرست کتب خانہ آصفیہ، ج ۱، ص ۵۲- ۵۵۳ (۴) محمد سالم، ہندوستانی مفسرین، ص ۹۱- ۹۲۔

شیخ عرفان حق جوان دبیر
اور مختار ہاشمی مطبع
کون ہاشم علی با تدبیر
چھاپا ہوکر کے جمع دونوں نے
ایسا مصحف نہیں ہے جس کی نظیر
بیچ میں ترجمہ ہے اور اوپر
ایک تفسیر کی نئی تحریر
وہ تو فیض شہ رفیع الدین
بحر مواج فیض خیر کثیر
اور یہ فیض شہ کلیم اللہ
تھے طریقت میں جو کہ بدر منیر
چھپ چکا جب کہ یہ سب حرز جان
ہاتف غیب نے پئے تشہیر
کرکے آواز کو بلند کہا
چھپا قرآن بمعنی و تفسیر
۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء

اس کے علاوہ مولانا محمد قاسم صاحب نے یہ تاریخ بھی کہی تھی:

کیا خوب واہ کیا خوب	کیا خوب چھاپا کیا خوب	ختم المصاحف
۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء	۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء	۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء (۱)

ماخذ تفسیر اس تفسیر میں اہم قدیم تفسیروں سے مدد لی گئی ہے، شاہ صاحب کی وضاحت کے مطابق ان کے نام یہ ہیں، بیضاوی، مدارک، جلالین اور تفسیر حسینی، مجموعی حیثیت سے یہ عمدہ اور بہتر تفسیر ہے، اس کی ترتیب جلالین کے انداز پر ہے اور اختصار کا حال یہ ہے کہ بعض مقامات پر محض دو تین جملے اشارتاً لکھے گئے ہیں، سبب نزول کی وضاحت قدرے تفصیل سے کی گئی ہے، مسائل میں احادیث سے بھی استنباط کیا گیا ہے، البتہ الفاظ ولغت کی بحثیں کم ہیں۔



(۱) پروفیسر خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، ص ۹۱-۳۹۲۔

حصہ دوم



شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ان کے خانوادۂ علمی اور تلامذہ کی تفسیری خدمات



تمہید

سرزمین ہند پر ایک طویل عرصہ تک مسلمان سلاطین حکم راں رہے اور ان کے عہد اقتدار میں اس سرزمین سے بے شمار علما، مفسرین ومحدثین، فقہا اور صوفیہ پیدا ہوئے۔

مسلمانوں کے اس عہد میں علم تفسیر پر کیا کچھ کام ہوا، اس کی ایک جھلک اس کتاب کے پہلے حصہ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سترہویں صدی عیسوی کے آغاز میں شہنشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد مغل سلطنت آپسی خانہ جنگی اور انتشار کا شکار ہوئی، جس کے نتیجہ میں سلطنت مغلیہ کا جاہ وجلال ختم ہو گیا، ایک طرف انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ ان پر تسلط جمایا اور دوسری طرف نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی نے ان پر حملے کر کے ان کی قوت کم زور کر دی، بالآخر ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اس عظیم سلطنت کا ڈھانچہ بکھر کر رہ گیا، ایسے نازک دور میں بظاہر علم وفن کی ترقی کا امکان نظر نہیں آتا، مگر قدرت کا یہ عجیب کرشمہ ہے کہ برصغیر ہند میں اسلامی نشأۃ ثانیہ کا نقطۂ آغاز یہی دور ظلمت ہے، ڈاکٹر عبدالغنی نے اس کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے:

> ”حکومت مغلیہ کے زوال وانحطاط، عام امرا کی تعیش کوشی اور اسی دور میں انگریزوں کے روز افزوں تسلط کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید اسلامیان ہند اپنی توانائی کھو چکے تھے، لیکن جب معاشرہ کی مجموعی زندگی پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ دور دراصل ان کی دینی، فکری اور سیاسی نہضت کا دور ہے، اس کے آغاز میں ہم حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی (۱۶۵۰-۱۷۲۹ء) کو مدرسہ خانم بازار دہلی میں احیائے دین کی کوششوں میں مصروف دیکھتے ہیں، یہیں سے تصوف کی وہ عوامی تحریک شروع ہوئی جو بالآخر تمام برصغیر

میں پھیل گئی......،شاہ عبد الرحیم (۱۶۴۴-۱۷۱۸ء) کا دہلی میں مدرسہ رحیمیہ بھی اسی دور کے آغاز میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے، اس مدرسے میں احسان و سلوک کے علاوہ علم ظاہر پر زور دیا جاتا تھا اور یہیں سے قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک زبردست انقلابی تحریک شروع ہوئی''۔

(تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، ج ۵، ص ۲۱)

اس دور نہضت کے گل سر سبد شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ہیں جو مدرسہ رحیمیہ کے تعلیم یافتہ اور شاہ عبد الرحیم کے فرزند ارجمند ہیں، شاہ صاحب نے اپنی مجتہدانہ علمی بصیرت سے اسلامی علوم وفنون میں ایک نئی روح پھونکی اور اس کو مستقل ایک علمی تحریک کی صورت دی۔

علم تفسیر میں شاہ ولی اللہ کا یہ بڑا اہم کارنامہ ہے کہ انہوں نے اس ملک میں پہلی مرتبہ اصول تفسیر کے موضوع پر کتاب لکھی اور ایک معتدل ومتوازن ترجمہ قرآن کر کے عوام الناس کو قرآن مجید سے جوڑا، شاہ صاحب کے فرزندانِ عالی مرتبت مقام اور ان کے تلامذہ نے ان کے اس مشن کی مکمل آبیاری کی جس سے پورے ملک کی فضا میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی اور قرآن وسنت سے استفادہ کا مذاق پیدا ہوا۔

کتاب کے اس حصہ میں شاہ ولی اللہ کی قرآنی تحریک اور ان کے تلامذہ و منتسبین کی قرآنی خدمات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔



شاہ ولی اللہ محدث دہلوی المتوفی ۱۱۷۶ھ

امام المفسرین والمحدثین شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (ولادت ۱۱۱۴ھ وفات ۱۱۷۶ھ) ان نابغۂ روزگار افراد میں ہیں، جو گردش لیل ونہار کے خرچ کہن میں خال خال نظر آتے ہیں، شمس العلما علامہ شبلی نعمانی نے ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

''ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انہی کے زمانہ میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا اس کے لحاظ سے یہ امید نہ رہی تھی کہ پھر کوئی صاحب دل ودماغ پیدا ہوگا لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ اخیر زمانے میں کہ اسلام کا نفس واپسیں تھا، شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی ابن رشد کے کارنامے ماند پڑ گئے''۔(۱)

شاہ صاحب کی ہشت پہل شخصیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لیے ان کی شخصیت اور کمالات کا تذکرہ کیے بغیر صرف ان کی قرآنی خدمات کی ایک جھلک پیش کی جاتی ہے۔

ترجمہ قرآن مجید شاہ ولی اللہ کا بے مثال اور تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کا ایک جامع اور متوازن فارسی ترجمہ کیا جس نے ترجمہ قرآن کے باب میں بحث واختلاف کا خاتمہ کر دیا، ان کے ترجمہ سے قبل متعدد ترجمے ہو چکے تھے، مگر اس کے باوجود انہی کو مترجم اول کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے، ہمارے خیال میں یہ بات غلط بھی نہیں ہے کیوں کہ شاہ صاحب ہی کو یہ اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے غایت درجہ احتیاط کے ساتھ قرآنی الفاظ کے بقدر فارسی کے منتخب الفاظ کا استعمال کیا ہے اور ترجمہ کی ایک معتدل شاہراہ قائم کی ہے. مولانا یوسف بنوری لکھتے ہیں:

''اس ترجمہ کے ذریعہ شاہ صاحب نے ہندی النسل مسلمانوں کو اختلاف وافتراق

(۱) علامہ شبلی نعمانی، علم الکلام، دار المصنفین ۱۹۹۳ء، ص ۱۰۵ و ۱۰۶۔

سے بچالیا ہے ورنہ ہندوستان میں بھی ترجمہ کے جواز وعدم جواز پر ایسی ہی گرم بازاری قائم رہتی جیسی کہ مصر میں ہے''۔(۱)

شاہ ولی اللہ نے اپنے ترجمہ قرآن کا آغاز ۱۱۴۳ھ میں اپنے درس قرآن سے کیا، سورہ بقرہ وآل عمران کا ترجمہ ابھی مکمل ہوا ہی تھا کہ حج کا سفر پیش آگیا اور چند برسوں کے لیے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا، سفر حجاز سے واپسی کے بعد ۱۱۴۵ھ میں اس کو دوبارہ شروع کیا، بالآخر ۱۱۵۱ھ میں یہ ترجمہ پایۂ تکمیل کو پہنچا، شاہ صاحب نے اس کا ''فتح الرحمٰن'' نام رکھا اور اس کا ایک مختصر اور جامع مقدمہ بھی تحریر کیا، جس کا ایک مخطوطہ دارالمصنفین میں محفوظ ہے۔

فتح الرحمٰن کی خصوصیات

فتح الرحمٰن کا سب سے نمایاں وصف اس کے حزم واحتیاط کا پہلو ہے جس کے سبب سے اس کو قبول عوام وخواص حاصل ہوا، شاہ صاحب اس کی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قرآنی مفہوم کے بہ قدر ترجمہ میں فارسی الفاظ لائے گئے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی مراد ومنشا کی وضاحت اور لطافت تعبیر کا بھی خیال رکھا گیا ہے...... متن کے اصل الفاظ سے جو بات زیادہ ہے اگر وہ دو ہی ایک کلمے کی حد تک ہے تو یعنی یا اسی طرح کے کسی اور لفظ سے اس کو متمیز کردیا گیا ہے اور اگر کلام تام کا اضافہ کیا گیا ہے تو اس کے شروع میں مترجم می گوید اور آخر میں اللہ اعلم کے لفظ سے اس کو نشان زد کردیا گیا ہے''۔(۲)

شاہ ولی اللہ نے فتح الرحمٰن کے مقدمہ میں ترجمہ کے اصول اور اس کی ضرورت و اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اپنے ترجمہ کے حسب ذیل امتیازات گنائے ہیں:

۱) قرآن مجید کے بعض ترجموں میں عبارت میں جو اطناب، رکاکت، اغلاق اور تعقید پائی جاتی ہے، اس سے بہ قدر امکان احتراز کیا گیا ہے۔

۲) دوسرے ترجموں میں متعلق قرآنی قصوں کو یا تو یکسر نظر انداز کردیا گیا ہے یا ان پر

(۱) مولانا محمد یوسف بنوری، یتیمۃ البیان لمشکلات القرآن، جمال پریس دہلی، ۱۳۵۷ھ، ص ۲۷ (۲) مقدمہ فتح الرحمٰن (قلمی) بحوالہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی ''مقدمہ فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن''، قرآن مجید کی تفسیریں چودہ سو برس میں، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۵ء۔

طویل اور مفصل بحث کی گئی ہے، اس ترجمہ میں اعتدال کو ملحوظ رکھا گیا ہے، چنانچہ جس مقام پر آیت کا مفہوم قصہ کی تفصیل کا متقاضی ہے وہاں منتخب الفاظ میں اس کی توضیح کردی گئی ہے، ورنہ اس کو ترک کردیا گیا ہے۔

۳) مختلف اور بہ کثرت توجیہات میں سے صرف اس توجیہ کو اختیار کیا گیا ہے جو زبان سے ہم آہنگ اور حدیث وفقہ سے قریب تر ہو۔

۴) اعراب قرآن کے وجوہ کی وضاحت اور محذوف ضمائر کی نشان دہی کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

۵) قرآن کے ترجمے یا تو تحت اللفظ ہیں یا ترجمانی پر مشتمل ہیں مگر یہ ترجمہ ان دونوں طریقوں کا جامع ہے۔(۱)

مقدمہ فتح الرحمٰن مقدمہ فتح الرحمٰن پندرہ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں فتح الرحمٰن کے امتیازات کے ساتھ ترجمہ قرآن کی ضرورت، طلبہ اور مبتدیوں کے لیے اس کی افادیت اور عوام الناس کو اس کی طرف راغب کرنے کی ہدایات بھی دی گئی ہیں، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> "اگر انصاف سے دیکھو تو قرآن کا نزول موعظت وہدایت ہی کے لیے ہوا ہے، اس کے الفاظ کا پڑھنا بھی غنیمت ہے گو وہ فی نفسہٖ مقصود نہیں ہے، اس شخص کے حصہ میں بھلا کیا اسلام کی حقیقت آئے گی جو قرآن مجید کے مفہوم کو نہ سمجھے اور اس کو کیوں کر حلاوت مل سکتی ہے جو اس کے مضمون سے ناواقف ہو"۔(۲)

مقدمہ فتح الرحمٰن میں ترجمہ قرآن کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر کاتبوں کو بھی حد درجہ احتیاط کی وصیت کی گئی ہے، شاہ صاحب نے ان کو یہ تاکید کی کہ:

> "قرآن کی عبارت کو جلی حرفوں میں لکھیں اور اسے سرخ روشنائی سے لکھیں تاکہ وہ ترجمہ سے ممتاز رہے اور اس کی احتیاط کریں کہ ترجمہ کے الفاظ سے کسی طرح کی کوئی تحریف راہ نہ پائے، اشتباہ کے موقع پر کلام تام کو سرخ نقطہ دیں تاکہ وہ مابعد سے جدا اور نمایاں رہے اور ترکیب اضافی وتوصیفی میں

(۱) مقدمہ فتح الرحمٰن (قلمی) بحوالہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی حوالہ مذکور (۲) ایضاً۔

مضاف و موصوف پر بھی زیر کا نشان لگا دیں تا کہ مبتدیوں کے لیے یہ چیزیں روشن اور واضح رہیں''۔(۱)

شاہ ولی اللہ دہلوی کے اسی محتاط نہج کی پیروی ان کے فرزندان عالی مرتبت مقام نے کی اور قرآن مجید کے اردو ترجمے کیے اور اس طرح فہم قرآن کا فیضان عام ہوا۔

الفوز الکبیر فی اصول التفسیر خدمت قرآن کے باب میں شاہ صاحب کا دوسرا بڑا اور اہم کارنامہ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر کی تالیف ہے، یہ کتاب اصول تفسیر کے موضوع پر ہے اور فارسی زبان میں لکھی گئی ہے، برصغیر ہند و پاک میں اپنے موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے اور اس کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مصر کے ایک عالم محمد منیر الدین دمشقی نے اس کو عربی کے قالب میں منتقل کیا اور یہ کتاب مختلف مدارس عربیہ کے نصاب میں بھی داخل ہے۔

الفوز الکبیر کو شاہ صاحب نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے، آخری یعنی پانچواں باب ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے تفسیری اقوال کا مجموعہ ہے جس میں تفسیر و تاویل کے ساتھ سبب نزول کی وضاحت بھی کی گئی ہے، چنانچہ شاہ صاحب نے اس باب کو علاحدہ کتابی صورت دی ہے اور اس کا نام ''فتح الخبیر بما لا بد من حفظہ فی علم التفسیر'' رکھا ہے۔

الفوز الکبیر کے پہلے باب میں یہ صراحت کی ہے کہ قرآن مجید کے تمام مضامین کو پانچ علوم میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱-علم احکام یعنی عبادات، معاملات، معاشرت اور سیاست سے متعلق واجب، مستحب، مباح یا مکروہ و حرام کا علم جن کی تفصیل فقہا کا کام ہے۔

۲-علم مخاصمہ یعنی یہود، نصاریٰ، مشرکین اور منافقین کے مزعومات باطلہ کی تردید اور یہ موضوع متکلمین اسلام کا ہے۔

۳-علم تذکیر بآلاء اللہ آسمان و زمین اور نظام کائنات کی تخلیق کا ذکر اور اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کا بیان۔

۴-علم تذکیر بایام اللہ اطاعت گزار قوموں پر کیے گئے احسانات اور نافرمانوں پر بھیجے

(۱) مقدمہ فتح الرحمن (قلمی) محولہ بالا۔

گئے عذاب کی تفصیل۔

۵۔علم تذکیر بالموت موت اور اس کے بعد پیش آنے والے حشر ونشر، حساب وکتاب اور جنت وجہنم کا ذکر، موخر الذکر تینوں علوم سے متعلق آیتیں اور اس مضمون کی احادیث واقوال واعظین قوم کے مقصد کی چیز ہیں۔(۱)

شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ قرآن مجید میں یہ علوم پنج گانہ متاخرین ادبا کے طرز تحریر کے مطابق علاحدہ علاحدہ فصلوں میں ذکر نہیں کیے گئے ہیں بلکہ یہ قدمائے عرب کے نہج واسلوب کے موافق باہم دگر مخلوط ہیں، ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ علوم فی نفسہٖ مقصود نہیں ہیں بلکہ نزول قرآن کا اصل مقصد انسانی نفوس کی تہذیب، عقائد باطلہ کی تردید اور اعمال فاسدہ کی بیخ کنی ہے۔(۲)

علم مخاصمہ کی تفصیل شاہ صاحب نے نہایت اہتمام سے کی ہے اور اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ معاندین اسلام پر ان ہی مسلمات کی روشنی میں حجت پوری کی گئی جن کے وہ قائل تھے اور اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ مخاصمت کی آیتیں مخصوص اقوام وملل کے لیے ہی نازل نہیں ہوئی ہیں بلکہ ہر عہد وقوم میں اس کی تطبیق ممکن ہے اور یہی اس کا مقصد ہے، چنانچہ وہ اپنے عہد کے مطابق مخاصمت کی آیتوں کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’اگر تم کو مشرکین کی حالت زار اور ان کے عقائد واعمال کے بارہ میں کچھ توقف ہو تو موجودہ زمانہ کے جاہل عوام پر ایک نظر ڈال لو اور خاص طور پر ان لوگوں کا معائنہ کرو جو دار السلطنت دہلی کے اطراف ونواح میں آباد ہیں کہ ان کے نزدیک ولایت و بزرگی کا کیا تصور ہے، انھوں نے ماضی کے بزرگوں کو کیا کچھ بنا رکھا ہے اور اپنے لیے نیکی وتقویٰ کی ضرورت بالکل نہیں سمجھتے بلکہ صرف ان ہی بزرگوں کی قبروں پر حاضری دیتے اور ان کے آثار کو متبرک خیال کرتے ہیں، غرض مختلف النوع شرک میں یہ لوگ مبتلا ہیں، دیکھو! ان کے اندر تشبیہ وتحریف کی بیماری کس قدر سرایت کر گئی ہے، حدیث صحیح میں

(۱) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، الفوز الکبیر، مکتبہ سلفیہ، ۱۹۵۱ء، ص او ۲۔ (۲) حوالہ مذکور، ص ۲۔

آیا ہے کہ تم لوگ اپنے پیش روؤں کی اقتدا قدم بہ قدم کرو گے، آخر کون سی ایسی برائی نہیں ہے جس میں قوم مبتلا نہ ہو اور اس کا اعتقاد نہ رکھتی ہو، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے''۔(۱)

اسی طرح شاہ صاحب نے علمائے یہود کے بارہ میں قرآنی آیات مخاصمت کو اپنے زمانہ کے علما سو پر منطبق کیا ہے، نیز مشائخ کے ساتھ فرط عقیدت اور غلو کو وہ افراط انصاری سے مشابہ قرار دیتے ہیں(۲)، اس بحث کے خاتمہ میں وہ لکھتے ہیں:

''خلاصہ کلام یہ کہ قرآن کی تلاوت کے وقت یہ خیال نہ کرو کہ یہ مخاصمت محض گزری ہوئی قوموں سے ہے، پچھلے زمانہ کی کون سی خرابی ایسی ہے جو بطریق مثال آج موجود نہیں ہے، ان آیتوں کا اصل مقصد مفاسد کی کلیات کو پیش کرنا ہے، قوموں کی حکایات مقصود نہیں ہے''۔(۳)

علم تذکیر بآلاء اللہ کے ذیل میں شاہ صاحب نے یہ لکھا ہے کہ اس علم میں عام و رائج نشانیوں کا ذکر ہے تا کہ ہر شخص اس کو بہ آسانی سمجھ سکے، مخصوص افراد کے قلبی واردات اور تاثرات کو موضوع نہیں بنایا گیا ہے کیوں کہ اس کا ادراک محدود ہے، اسی طرح تذکیر بایام اللہ کے ضمن میں ان کا یہ کہنا ہے کہ واقعات کے تذکرہ میں اہل عرب کی واقفیت کو مدنظر رکھا گیا ہے کیوں کہ اگر ان کے سامنے نئے اور نادر واقعات پیش کیے جاتے تو وہ اسی میں الجھ کر رہ جاتے اور اصل مقصد تذکیر فوت ہو جاتا۔(۴)

علم الاحکام کے ذیل میں شاہ صاحب نے تفصیلات کے بجائے محض اشاروں پر اکتفا کیا ہے، چوں کہ اس موضوع پر ان کی مایہ ناز کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' موجود ہے اس لیے ممکن ہے کہ انہوں نے اس سے صرف نظر کیا ہو، تاہم انہوں نے یہ صراحت کی ہے کہ علم الاحکام کے ذریعہ ملت حنیفی کے تحفظ و بقا کا سامان فراہم کیا گیا ہے اور اہل عرب کا تزکیہ کر کے دراصل اقوام عالم کے تزکیہ کی راہ ہموار کی گئی ہے۔(۵)

(۱) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، الفوز الکبیر، ۱۹۵۱ء، ص ۵ (۲) ایضاً، ص ۹-۱۱ (۳) ایضاً، ص ۱۲ (۴) ایضاً، ص ۱۳ و ۱۴ (۵) ایضاً، ص ۱۵۔

الفوز الکبیر کا دوسرا باب بھی نہایت اہم اور معرکتہ الآراء ہے، اس میں انہوں نے متعدد فصلوں میں علم تفسیر کی مشکلات کو بیان کیا ہے اور ان کا حل بھی بتایا ہے۔

علم تفسیر میں پہلی مشکل وہ یہ بتاتے ہیں کہ قرآن مجید کے بعض غریب الفاظ کی تحقیق اور اس کے مفہوم کی تعیین میں مفسر کو دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس کا حل یہ ہے کہ صحابہ کرام، تابعین عظام اور اہل زبان و بیان کے بیان کردہ معانی کا تتبع و تفحص کیا جائے۔(۱)

شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ علم تفسیر کی دوسری مشکل ناسخ و منسوخ کی پہچان ہے، بالعموم مفسرین نے نسخ کو لغوی معنی میں بیان کیا ہے، چنانچہ ان کے نزدیک ہر وہ آیت جس کا کوئی وصف دوسری آیت سے مقید یا مخصص بھی ہوتا ہے، منسوخ شمار ہوتی ہے اور اس طرح تقریباً پانچ سو آیتوں کو انہوں نے منسوخ قرار دیا ہے متقدمین میں قاضی ابو بکر بن العربی صاحب احکام القرآن نے نسخ کے اصطلاحی مفہوم کی تعیین کر کے ان آیتوں پر غور کیا تو ان کے نزدیک صرف بیس آیتیں منسوخ قرار پائیں، جن کو امام سیوطی نے الاتقان میں نقل کیا ہے، شاہ صاحب نے ان آیتوں کو اور ان کی ناسخ آیات کو ترتیب وار ذکر کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں محض پانچ آیتیں منسوخ قرار پاتی ہیں بقیہ میں تاویل و توجیہ کی گنجائش ہے۔(۲)

علم تفسیر کی تیسری مشکل انہوں نے شان نزول کی معرفت کو بتایا ہے، اس سلسلے میں ان کا یہ قول خاص طور رقابل ذکر ہے کہ ہر آیت کو مخصوص واقعہ کے پس منظر میں دیکھنا صحیح نہیں ہے بلکہ بعض اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ واقعات کو آیت کے پس منظر میں دیکھا گیا ہے اور اس کو شان نزول سے تعبیر کیا گیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

والذی یظھر من استقراء کلام	صحابہ و تابعین کے اقوال کے تتبع و استقراء
الصحابۃ والتابعین انھم لا	سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نزلت فی کذا
یستعملون نزلت فی کذا لمحض	کا استعمال ان کے نزدیک عہد نبوی کے
قصۃ کانت فی زمنہ صلی اللہ علیہ وسلم	صرف کسی واقعہ ہی تک محدود نہیں تھا جس
وھی سبب نزول الآیۃ	کو سبب نزول کہا جائے بلکہ بعض اوقات وہ

(۱) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، الفوز الکبیر، ص ۱۷ (۲) ایضاً ص ۱۸ تا ۲۲۔

بل ربما یذکرون بعض ما صدقت علیه الآیة ما کان فی زمنه ﷺ او بعده و یقولون نزلت فی کذا ولا یلزم هناک انطباق جمیع القیود بل یکفی انطباق اصل الحکم فقط (۱)

ان واقعات کے ذکر میں بھی اس کو استعمال کرتے تھے جو عہد نبوی میں یا اس کے بعد پیش آئے اور ان پر آیت کا اطلاق درست ہوتا تھا، اس سے تمام قیدوں کی تطبیق مراد نہیں ہوتی تھی بلکہ اصل حکم کا انطباق مقصود ہوتا تھا۔

شاہ صاحب نے اسی اصول کی بنیاد پر شان نزول کے متعلق یہ متوازن رائے قائم کی کہ جن آیتوں میں متعین واقعات کی نشان دہی موجود ہے، مثلاً غزوۂ احد واحزاب وغیرہ کا ذکر ان واقعات کی مختصر تفصیل ضرور کی جانی چاہیے، لیکن شان نزول کے عنوان سے غیر مقصود بالذات واقعات کی تفصیل کرنا اور اس کے لیے اسرائیلی مرویات کا سہارا لینا لاطائل اور تضییع وقت ہے۔ (۲)

علم تفسیر کی چوتھی مشکل انہوں نے اسلوب کلام میں خطاب کی تبدیلی، حذف ضمائر تقدیم وتاخیر اور مجاز وکنایہ کے استعمال کو بتایا ہے اور متعدد مثالوں کے ذریعہ اس کی نشان دہی بھی کی ہے۔

الفوز الکبیر کا تیسرا باب بھی نہایت اہم ہے، اس میں شاہ صاحب نے قرآن مجید کے اسلوب بیان پر بحث کی ہے، ان کے نزدیک قرآن مجید کی معنوی ترتیب مجموعہ فرامین کی طرح ہے جس کا ہر فرمان رعایا کے نام مناسب حال مثالوں پر مشتمل ہوتا ہے اور لفظی وصوتی انداز و اسلوب میں وہ عربی شاعری کے مماثل ہے، مگر اس سے مختلف اور بلند تر اسلوب بیان ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک ہر فرمان مستقل بالذات ہے اس لیے اس کے مجموعہ میں باہم ربط وتعلق کی تلاش وجستجو لاحاصل ہے، ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ایک سورت کے اندر آیتوں کی ترتیب وتوقیفی کہی جاسکتی ہے مگر خود سورتوں کی ترتیب عہد صحابہ میں انجام پائی ہے۔ (۳)

(۱) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، الفوز الکبیر، ص ۳۲ (۲) ایضاً ص ۴۴ و ۴۵ (۳) ایضاً، ۴۴۔

شاہ صاحب کے اس نقطۂ نظر سے بعض اہل علم نے اختلاف کیا ہے جن میں سرفہرست خود ان کے فرزند ارجمند شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ ہیں، چنانچہ انہوں نے اپنی تفسیر ''فتح العزیز'' میں ربط آیات وسور کا خاص اہتمام کیا ہے، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

البتہ آیتوں کے آہنگ و اسلوب بیان کے بارہ میں شاہ صاحب نے اس کی عربی شاعری سے جو مماثلت ومغایرت ثابت کی ہے، وہ نہایت اہم اور لائق توجہ ہے، ان کا کہنا ہے کہ اہل عرب کے شعری ونثری سرمایہ میں جس قدر اسالیب موجود ہیں ان سے بلند تر اور دل پذیر اسلوب بیان قرآن مجید کا ہے۔

اس باب میں انہوں نے قرآن مجید کے لفظی ومعنوی وجوہ اعجاز بھی بیان کیے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ قرآن مجید کا ماضی کے واقعات کی تصدیق کرنا اس کا ایک اہم معنوی اعجاز ہے، کیونکہ نبی امی ﷺ بدون واقفیت اس کو بیان نہیں کر سکتے، اسی طرح اس کا مستقبل کے واقعات کی پیشین گوئی بھی ایک اہم اعجاز ہے، چنانچہ ہر نئی تحقیق اس کے اس اعجازی پہلو کو نمایاں کرتی ہے، لفظی اعتبار سے اس کا اعجاز یہ ہے کہ ادبائے متقدمین ومتاخرین متفق اللفظ ہیں کہ سلاست بیان، حسن ترکیب، لطافت کلام اور سادگی میں کوئی انسانی کلام اس کی ہم سری نہیں کر سکتا ہے۔(۱)

الفوز الکبیر کا چوتھا باب فنون تفسیر کی تفصیل پر مشتمل ہے، جس میں شاہ صاحب نے یہ دکھایا ہے کہ مفسرین نے اپنے اپنے ذوق ورجحان کے مطابق تفسیریں لکھی ہیں اور ان کی یہ کوشش قابل قدر ہیں تاہم انہوں نے کچھ اہم ہدایتیں اور مشورے بھی دیے ہیں، مثلاً شان نزول کے متعلق انہوں نے یہ ہدایت دی ہے کہ غیر مقصود بالذات واقعات کا احاطہ غیر مناسب اور فضول ہے(۲)، اسی طرح قرآن مجید کے غریب الفاظ کی شرح وتوضیح کے متعلق ان کی اس ہدایت کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ اس کے لیے اقوال صحابہ وتابعین کا تتبع ازبس ضروری ہے، اس موقع پر انہوں نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ اگر کوئی غریب کلمہ متعدد معانی پر مشتمل ہو اور اقوال صحابہ بھی اس کے مفہوم کی تعیین میں مختلف ہوں تو مفسر کو چاہیے کہ اہل عرب کے استعمال کی میزان میں اس کو پرکھے اور یہ بھی دیکھے کہ کون سا قول از روئے سند قوی اور مضبوط ہے۔(۳)

(۱) الفوز الکبیر، ص ۴۱ و ۴۲ (۲) ایضاً، ص ۴۵ (۳) ایضاً، ص ۴۶۔

فتح الخبیر یہ الفوز الکبیر کا پانچواں باب ہے اور علاحدہ رسالہ بھی ہے، چنانچہ شاہ صاحب نے اس کی تمہید فارسی میں لکھی ہے، مگر موضوع کی مناسبت سے رسالہ کا خطبہ عربی میں لکھا ہے، یہ دراصل الفوز الکبیر کے باب دوم کی فصل اول کی شرح ہے، اوپر ذکر آچکا ہے کہ قرآن مجید کے غریب الفاظ کے مفہوم کی تعیین کے لیے وہ اقوال صحابہ وتابعین کو مرجع اول قرار دیتے ہیں، اس بارہ میں ان کا یہ کہنا ہے کہ ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے جو اقوال بہ روایت ابن ابی طلحہ صحیح بخاری میں منقول ہیں، سب سے زیادہ مستند اور لائق اعتنا ہیں، اس کے بعد ان کے وہ اقوال ہیں جو ضحاک کی روایت سے مروی ہیں، تیسرے نمبر پر ان کے وہ تفسیری جوابات ہیں جو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے نافع بن ارزقؒ کے سوالات کے جواب میں دیئے ہیں اور ان تینوں طرق سے مروی اقوال کو امام سیوطی نے الاتقان میں جمع کر دیا ہے، اس کے بعد امام بخاری کی دیگر تفسیری روایات پھر دیگر مفسرین کی بیان کردہ مرویات تفسیر کا درجہ ہے۔(۱)

فتح الخبیر میں شاہ صاحب نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے تینوں طرق سے مروی اقوال کو یکجا کر دیا ہے اور بعض مقامات پر منتخب اقوال بھی نقل کیے ہیں، نیز امام بخاری، امام ترمذی اور امام حاکم کی وہ تفسیری مرویات بھی نقل کی ہیں جو شان نزول سے متعلق ہیں، اس رسالہ کی تالیف سے شاہ صاحب کے پیش نظر یہ تھا کہ یہ تفسیری مرویات ہر مفسر کو ازبر یاد ہونی چاہیے، جیسا کہ رسالہ کے نام سے بھی ظاہر ہے اور اسی لیے انہوں نے ان مرویات کی سندوں کو نقل کرنے کے بجائے صرف متن کو یکجا کر دیا ہے تاکہ حفظ و استفادہ میں سہولت رہے۔

مختصر یہ کہ الفوز الکبیر مع فتح الخبیر علم تفسیر کا ایک بیش قیمت خزانہ ہے، بہ ظاہر کمیت کے اعتبار سے یہ کتاب مختصر معلوم ہوتی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اپنی معنویت اور نکتہ آفرینی کے لحاظ سے یہ علم تفسیر کا مغز ہے جس نے فن تفسیر کے فروغ میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے اور آج بھی اس سے مفسرین مستغنی و بے نیاز نہیں ہیں۔



(۱) الفوز الکبیر، ص ۱۸۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

(م ۱۲۳۹ھ - ۱۸۲۳ء)

نام ونسب عبدالعزیز نام اور سراج الہند لقب تھا، ان کے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ اور جد محترم شاہ عبدالرحیم تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب کی مہر پر یہ نسب نامہ یوں ثبت تھا، ھو العزیز الولی الرحیم ۔(۱)

ولادت ۲۵ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ/۱۰/ اکتوبر ۱۷۴۶ء کو بہ وقت سحر پیدا ہوئے، والد بزرگوار نے عبدالعزیز نام رکھا، "غلام حلیم" سے سن ولادت نکلتا ہے۔(۲)

تعلیم والد ماجد ہی کی خدمت میں ان کی اصل تعلیم و تربیت ہوئی، البتہ بعض امہات کتب کا درس اپنے والد کے ممتاز تلامذہ سے بھی لیا جس کی تفصیل انہوں نے خود اس طرح بیان کی ہے۔

"باید دانست کہ ایں فقیر ایں علم و جمیع علوم را از خدمت والد ماجد خود اخذ کردہ است و بعضے کتب ایں علم را مثل مصابیح و مشکوۃ و مسوی شرح موطا کہ از تصانیف ایشانست و حصن حصین و شمائل ترمذی از خدمت ایشاں قرأۃ وسماعا تحقیق و تفتیش اخذ نمودہ، قدرے از اوائل صحیح البخاری نیز بطریق درایت از ایشاں شنیدہ و صحیح مسلم و دیگر صحاح ستہ

جاننا چاہیے کہ اس فقیر نے اس علم (حدیث) کو اور تمام ہی علوم کو والد ماجد کی خدمت میں رہ کر حاصل کیا لیکن فن حدیث کی بعض کتابیں مثلاً مصابیح السنہ، مشکوۃ، مسوی شرح موطا جو والد ماجد ہی کی ایک تصنیف ہے، حصن حصین اور شمائل ترمذی کو قرأۃ وسماعا نہایت تحقیق کے ساتھ ان سے پڑھا، صحیح بخاری کا کچھ ابتدائی حصہ بطریق درایت سنا، صحیح مسلم اور دوسری

(۱) مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے کچھ غیر مطبوعہ فتاوی اور ایک دستاویز، معارف جون ۱۹۷۹ء، ص ۴۳۶ (۲) مولانا محمد رحیم بخش دہلوی، حیات ولی، مکتبہ سلفیہ، لاہور، ص ۵۸۷۔

را برایشاں سماع غیر منتظم دارد نحو کہ بہ حضور ایشاں طلبہ می خواند و ایں فقیر ہم حاضر می بود و تحقیقات و تنقیحات ایشاں را می شنید تا آں کہ ملکہ معتد بہا در فہم معانی احادیث و ادراک دقائق اسانید بفضلہ تعالیٰ حاصل شد بعد ازاں بنا بر رسم اجازت از یاراں عمدہ ایشاں مثل شاہ محمد عاشق پھلتی و خواجہ محمد امین ولی اللٰہی نیز حاصل کردہ۔(۱)

صحاح ستہ کی باضابطہ سماعت تو نہ کر سکا، البتہ جب طلبہ ان کتابوں کو ان سے پڑھتے تھے تو میں بھی اس مجلس میں حاضر رہا کرتا تھا اور حضرت والد کی تحقیقات و تنقیحات کو ان سے سنتا تھا، اس طرح حدیث کے معنی اور اسناد کی باریکیوں کو سمجھنے کا قابل اعتماد ملکہ بہ فضلہ سبحانہ پیدا ہو گیا بعد ازاں رسماً روایت کی اجازت حضرت والد کے ممتاز اصحاب شاہ محمد عاشق پھلتی اور خواجہ محمد امین ولی اللٰہی سے حاصل کی۔

والد ماجد کی وفات اور امراض کا ہجوم شاہ عبدالعزیز صاحب جب سترہ سال کے ہوئے تو ان کے پدر بزرگوار حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی وفات ہوئی (۲)، پچیس برس کی نوعمری ہی میں وہ متعدد موذی امراض کے شکار ہو گئے اور آخر عمر تک اس میں گرفتار رہے، صاحب نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے:

وقد اعترته الامراض المؤلمة وهو ابن خمس و عشرين سنة فادت الى المراق والجذام والبرص والعمى حتى عد منها اربعة عشر مرضا مفجعا۔ (۳)

پچیس برس کی نوعمری ہی میں ان پر متعدد موذی بیماریوں کا حملہ ہوا جس کے نتیجہ میں ان کو مراق، جذام اور برص ہو گیا اور بصارت بھی جاتی رہی، غرض چودہ قسم کے موذی مرض میں وہ مبتلا تھے۔

درس و تدریس اوائل عمر ہی میں کثرت امراض کے باوجود شاہ صاحب نے مدۃ العمر درس و افادہ کا بازار گرم رکھا اور اپنے والد کے جانشین مقرر ہوئے، بیماریوں سے نڈھال ہو کر مدرسہ کی ذمہ داری اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے سپرد کر دی مگر

(۱) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، عجالہ نافعہ، کراچی، ۱۹۶۴، ص ۱۷ و ۱۸ (۲) مرزا محمد بیگ دہلوی، دیباچہ فتاوی عزیزیہ، مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۴۱ھ، ص ۴ (۳) مولانا عبدالحیٔ، نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۷۰۔

خود بھی اس سے وابستہ رہے، صاحب نزہۃ الخواطر کا بیان ہے:

من ذلک السبب فوض تولیة التدریس فی مدرسته الی صنویه رفیع الدین و عبد القادر ومع ذلک کان یدرس بنفسه النفیسة ایضا ویصنف ویفتی ویعظ (۱)

(بیماریوں) کے سبب سے اپنے مدرسہ میں درس وتدریس کا باضابطہ مشغلہ اپنے دونوں بھائیوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر کے سپرد کر دیا، مگر خود بھی درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور وعظ وافتا میں مشغول رہتے تھے۔

طلبہ کے علاوہ عوام الناس کے افادہ کے لیے ہفتہ میں دو مرتبہ سہ شنبہ اور جمعہ کو درس گاہ میں مجلس وعظ منعقد فرماتے تھے، جس میں بے شمار شائقین شریک ہوتے تھے۔ (۲)

شاہ عبد العزیز صاحب کو قرآن مجید کے درس سے خاص شغف تھا، ان کے نواسے اسحاق بن افضل روزانہ ایک رکوع قرآن مجید ان کی مجلس میں تلاوت کرتے تھے، جس کی تفسیر شاہ صاحب بیان کرتے تھے، درس قرآن کا یہ سلسلہ شاہ ولی اللہ صاحب سے چلا آرہا تھا، مقالات طریقت کی روایت کے مطابق شاہ ولی اللہ کا آخری درس سورۂ مائدہ کی آیت ''اعدلوا هو اقرب للتقوى'' پر تھا، وہیں سے شاہ عبد العزیز صاحب نے اپنا درس شروع کیا اس کا اختتام سورۂ حجرات کی آیت ''ان اکرمکم عند الله اتقاکم'' پر ہوا، ان کی وفات کے بعد اس سلسلہ کو ان کے نواسے اسحاق بن افضل نے مکمل کیا۔ (۳)

غرض شاہ عبد العزیز صاحب کے حلقہ درس سے بے شمار فضلا پیدا ہوئے اور ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے۔

وفات شاہ صاحب کو اپنے تمام بھائیوں کے مقابلہ میں لمبی عمر نصیب ہوئی، اسی برس کی عمر میں ۹ رشوال ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۳ء کو یکشنبہ کے روز وفات پائی، مختلف شعرا نے تاریخ وفات کہی جن میں حکیم مومن خاں دہلوی کا قطعہ تاریخ فن کی ایک نادر مثال ہے۔ (۴)

(۱) مولانا عبد الحئی حسنی حوالہ سابق (۲) غلام رسول مہر وادارہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۵ء ج ۱۱، ص ۶۴۵ (۳) مولانا عبد الحئی حسنی، ص ۲۶۹ (۴) مرزا محمد بیگ دہلوی، ص ۱۰۔

دست بیداد اجل سے بے سروپا ہو گئے فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل
ق ی ض ن ط ر ل م
۱۲۳۹ھ

حلیہ تذکرہ نگاروں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کا قد لمبا، جسم کم زور، رنگ گندمی، آنکھیں نیلگوں اور داڑھی خوب گھنی تھی۔

اولاد شاہ صاحب کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، صرف تین بچیاں تھیں جو سب صاحب اولاد تھیں، لیکن شاہ صاحب کی زندگی ہی میں انتقال کر گئیں، بڑی صاحب زادی شاہ صاحب کے برادر خورد شاہ رفیع الدین صاحب کے فرزند مولوی محمد عیسیٰ سے منسوب تھیں اور منجھلی شیخ محمد افضل کے نکاح میں تھیں، جن کے بطن سے مولانا محمد اسحاق صاحب تولد ہوئے جو بعد میں شاہ صاحب کے جانشین قرار پائے اور تیسری صاحب زادی مولوی عبدالحئی صاحب کے عقد نکاح میں تھیں، جن کو حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کی معیت و رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔(۱)

اخلاق و عادات شاہ عبدالعزیز صاحب تسلیم و رضا اور صبر و شکر کے مجسم پیکر تھے، اوائل عمری سے وہ مختلف امراض و علل میں مبتلا ہو گئے تھے، مگر اس کے باوجود طلبہ کی تعلیم و تربیت میں برابر مشغول رہے، ان کی زندگی میں ان کے تینوں برادران خورد فوت ہوئے جن کی تعلیم و تربیت خود شاہ صاحب کے ہاتھوں انجام پائی تھی، ان کا غم ہی کیا کم تھا کہ اس پر مزید ان کی تینوں صاحب زادیاں ان کے سامنے سپرد خاک کی گئیں مگر ان تمام حوادث کے باوجود شاہ صاحب نے طلبہ و عوام کے افادہ کا سلسلہ مستقل جاری رکھا اور نہایت بشاشت اور وسیع القلبی کے ساتھ اس مقدس فریضہ کی ادائیگی میں مدۃ العمر مشغول رہے۔

تصنیفات شاہ عبدالعزیز صاحب نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، امراض کی شدت اور آنکھوں کی بصارت زائل ہو جانے کے سبب بعض کتابوں کو انہوں نے املا کرایا (۲)، ان کی اہم تصنیفات یہ ہیں:

۱- **تحفہ اثنا عشریہ** : فارسی زبان میں رد شیعیت میں بے مثال کتاب ہے، جس کو غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کا عربی زبان میں ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

(۱) مولانا محمد رحیم بخش دہلوی، ص ۲۱۵-۲۱۶ (۲) مولانا عبدالحئی، ص ۲۷۳۔

۲- بستان المحدثین : محدثین کے حالات کا ایک جامع مجموعہ ہے، فارسی میں ہے اور متداول ہے، اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

۳- العجالۃ النافعۃ : فن حدیث کے متعلقات پر ایک اہم رسالہ ہے، یہ بھی فارسی میں ہے اور اس کا بھی اردو ترجمہ مع تعلیقات وحواشی چھپ چکا ہے۔

۴- فتاوی : شاہ صاحب کے فتاوی کا مجموعہ اہل علم میں کافی مقبول اور متداول ہے، اس کا بھی اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔

۵- تفسیر فتح العزیز : یہ ان کی مشہور تفسیری تصنیف ہے، جس کی صرف تین جلدیں ایک اول کی اور دو آخر کی ملتی ہیں، یہ بھی فارسی میں ہے۔

ان کے علاوہ بلاغت، کلام، منطق اور فلسفہ کے موضوعات پر بھی شاہ صاحب نے متعدد رسالے اور حاشیے فارسی اور عربی زبان میں لکھے (۱)

تفسیر فتح العزیز یہ تفسیر نامکمل صورت میں پائی جاتی ہے، سورۂ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی ابتدائی ایک سو چوراسی آیتوں کی تفسیر پہلی جلد میں ہے اور آخر کے دو پاروں کی تفسیر علاحدہ علاحدہ جلدوں میں ہیں اور یہ جلدیں متعدد بار شائع ہو چکی ہیں۔

تفسیر کے مقدمہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحب کے کوئی شاگرد شیخ مصدق الدین عبداللہ تھے، جن کی تحریک پر یہ تفسیر لکھی گئی اور ان ہی کو شاہ صاحب نے اس کا املا کرایا تھا اور یہ سلسلہ ۱۲۰۸ھ/ ۱۷۹۳ء میں مکمل ہوا۔ (۲)

تفسیر فتح العزیز کی عدم تکمیل کی بحث عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ شاہ صاحب کی تفسیر نامکمل رہ گئی تھی اور اس کا جس قدر حصہ طبع ہوا ہے، وہی لکھا گیا تھا لیکن صاحب نزہۃ الخواطر کا بیان ہے کہ یہ تفسیر کئی ضخیم جلدوں میں تھی جس کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا، وہ لکھتے ہیں:

وھو فی مجلدات کبار ...... ضاع	یہ تفسیر کئی ضخیم جلدوں میں تھی...... جس کا زیادہ
معظمها فی ثورۃ الهند وما بقی منها	تر حصہ ہندوستان کے غدر میں تلف ہو گیا

(۱) مولانا عبدالحئی، ص ۲۷۳-۲۷۴ (۲) شاہ عبدالعزیز صاحب، تفسیر فتح العزیز، مطبع حیدری بمبئی، ۱۲۹۴ھ ج ۱، ص ۳

الا مجلدان من اول و آخر (۱) اور صرف اول وآخر کی دو جلدیں باقی بچیں۔

ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ کے پروفیسر ڈاکٹر عضد الدین خاں نے بھی اپنے مقالہ میں صاحب نزہۃ الخواطر کے خیال کی تائید کی ہے، انہوں نے اس کے ثبوت میں فتاوی عزیزی سے متعدد اقتباسات بھی پیش کیے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

''شاہ عبد العزیز صاحب نے جیسا کہ مقدمہ سے ظاہر ہے غالباً پہلے سورہ فاتحہ اور آخر کے دو پاروں کی تفسیر شیخ مصدق الدین کو املا کرائی مگر بعد میں لوگوں کے اصرار پر یہ خیال ہوا ہوگا کہ پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھی جائے چنانچہ انہوں نے سورہ بقرہ سے اس کو شروع کیا اور اٹھائیسویں پارہ کے آخر تک پوری تفسیر لکھوادی، پھر مختلف عوارض نے اس کام پر نظر ثانی کرنے اور اس کو آخری شکل دینے کی مہلت نہ دی اور معاملہ آج کل پر ٹلتا رہا مگر تفسیر کا پہلا مسودہ تیار ہو چکا تھا اس لیے اپنے خطوط میں اپنے احباب کو اس کا حوالہ دیتے رہے، جیسا کہ فتاویٰ کی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ شاہ رفیع الدین مراد آبادی نے بھی یہی لکھا ہے کہ شاہ صاحب نے تفسیر لکھی مگر مسودہ بیاض تک نہیں پہنچا، یعنی آخری شکل میں نہیں آیا، مگر مسودہ پورا ہو چکا تھا، اس لیے شاہ صاحب اس کے اقتباسات اپنے احباب کو عند الضرورت لکھ دیتے تھے لیکن مسودہ آخری شکل میں نہیں آیا تھا، اس لیے سب لوگوں تک یہ کتاب نہیں پہنچ سکی اور اس کی مختلف کاپیاں نہ ہو سکیں، غالباً شاہ صاحب کا خیال رہا ہوگا کہ اگر طبیعت سنبھل گئی تو اس پر نظر ثانی کر کے آخری شکل دے دیں گے مگر اس کا موقع نہیں مل سکا اور یہ مسودہ آخری وقت تک اسی شکل میں پڑا رہا اور لوگوں کو اس کا علم نہ ہو سکا اسی لیے اکثر تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، صرف چند لوگوں کو ہی اس کا علم تھا اسی دوران میں غالباً یہ بھی ہوا کہ شاہ صاحب کی وفات اور پھر شاہ اسحاق صاحب اور شاہ محمد یعقوب صاحب کی ہجرت کے بعد اصل مسودہ کسی

(۱) مولانا عبد الحئی، حوالہ سابق، ص ۲۷۳۔

طرح ضایع ہوگیا اور اس کا صرف اتنا ہی حصہ مل سکا جو آج مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔"(۱)

ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ہی کے ایک دوسرے فاضل ڈاکٹر محمد سالم قدوائی جنہوں نے ہندوستان کے مفسرین اور ان کی عربی تفسیروں پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا ہے اس تحقیق کی تائید کی ہے، وہ شیخ رفیع الدین مرادآبادی کی تصنیف "افادات عزیزیہ" کے تعارف میں لکھتے ہیں:

"تفسیر فتح العزیز جسے عام طور پر نامکمل ہی سمجھا جاتا ہے، مکمل ضرور ہوگئی تھی اس لیے کہ (افادات عزیزیہ) میں جابجا اس قسم کے حوالے ملتے ہیں من فتح العزیز فی سورہ النمل یا ایضا من تفسیر سورۃ النساء یا من نفسیر فتح العزیز تحت قولہ تعالی فی سورۃ المؤمنین وغیرہ"(۲)

راقم کے خیال میں یہ بات محل نظر اور محتاج تحقیق ہے کہ فتح العزیز کی جلدیں غدر میں تلف ہوگئیں کیوں کہ اس تفسیر کی اشاعت غدر (۱۸۵۷ء) سے کافی پہلے شاہ عبدالعزیز صاحب کے انتقال کے محض دس سال بعد ۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء میں کلکتہ سے ہوچکی تھی، اس اڈیشن کے آخری دو اجزا جو ایک جلد میں ہیں اور انتیسویں اور تیسویں پارہ کی تفسیر پر مشتمل ہیں، کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہیں، تیسویں پارہ کی تفسیر کے آخری صفحات غائب ہیں مگر انتیسویں پارہ کی تفسیر مکمل محفوظ ہے جس کے آخر میں ترقیمہ بھی ہے، جس سے سن اشاعت کی واقفیت کے ساتھ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تیسویں پارہ کی تفسیر اس سے پہلے طبع ہوچکی تھی، ترقیمہ کی عبارت یوں ہے:

بعد طبع تفسیر سپارہ سی ام عم ینسآء لون	تیسویں پارہ یعنی عم یتسآء لون کی
مسمی بفتح العزیز سپارہ بست ونہم تبارک	تفسیر بنام فتح العزیز کی طباعت کے بعد
الذی از تفسیر موصوف بتاریخ غرہ شہر	انتیسویں پارہ تبارک الذی کی تفسیر

(۱) دیکھیے معارف، ستمبر ۱۹۶۷ء ص ۲۱، ۲۳۲ (۲) ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں، مکتبہ جامعہ، دہلی ۱۹۷۳ء ص ۲۵۵۔

ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ از فضل حق سبحانہ وتعالیٰ بہ طفیل جناب سید الانبیا شافع روز جزا وائمہ ہدی و خلفای مقتدی ﷺ در مطبع احمدی واقع شہر چترہ متعلقہ ضلع ہوگلی بہ تصحیح ایں ذرہ بے مقدار بل لاشئی فی الاعتبار اعنی خیر خواہ خلق اللہ خاکسار عبداللہ ولد سید بہادر علی مرحوم بہ طبع رسید......(۱)

اشاعت ماہ ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ میں بفضلہٖ سبحانہ سید الانبیا شافع روز جزا...... کے طفیل میں شہر چترہ متعلقہ ضلع ہگلی کے مطبع احمدی میں ناچیز عبداللہ ولد سید بہادر علی مرحوم کی تصحیح سے ہوئی۔

فتاوی عزیزی اور افادات عزیزیہ کے اقتباسات سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے اپنی تحریروں میں فتح العزیز کے غیر مطبوعہ مسودات کے حوالے دیئے ہیں مگر فتاوی کی ایک عبارت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ مسودات خود شاہ صاحب کی دست رس سے باہر تھے، وہ لکھتے ہیں:

وایں فقیر در تحت آیت "اولا ئک یؤتون اجرھم مرتین" (سورہ قصص) تحقیق نفیس نوشتہ کہ ایں وقت نقل آں بسبب دور افتادن مسودات متعذر است۔(۲)

اس فقیر نے سورہ قصص کی آیت "اولا ئک یؤتون اجرھم مرتین" کے ذیل میں عمدہ تحقیق لکھی ہے مگر اس وقت مسودات کے دور افتادہ ہونے کے باعث اس کو نقل کرنے سے معذوری ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ مسودات آخر کہاں تھے، جہاں تک خود شاہ صاحب کی رسائی ممکن نہ تھی؟ تفسیر فتح العزیز کے مقدمہ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا تو صحیح ہے کہ شاہ صاحب نے پہلے سورہ فاتحہ اور آخر کے دو پاروں کی تفسیر مصدق الدین کو املا کرائی اور بعد میں لوگوں کے اصرار پر سورہ بقرہ کی تفسیر شروع کی مگر یہ کہنا کہ شاہ صاحب نے اٹھائیسویں پارہ کے آخر تک پوری تفسیر لکھوادی محل نظر ہے کیوں کہ مقدمہ میں سورہ بقرہ کے آغاز کا ذکر تو ملتا ہے مگر اسی میں آگے چل کر شاہ صاحب کے دعائیہ الفاظ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس وقت تک بہر حال تفسیر مکمل نہیں ہوئی تھی، دعا کے

(۱) تفسیر فتح العزیز، مطبوعہ ہگلی، پارہ ۲۹، ص ۳۲۷ (۲) فتاوی عزیزیہ، ج ۲، ص ۶۲۔

الفاظ ملاحظہ ہوں:

وانا ایضا اسئل من فضلہ ان یوفقنی لاتمامہ کما وفقنی لختامہ (۱)

اور میں بھی اللہ تعالیٰ کا فضل چاہتا ہوں کہ مجھ کو اس کام کے مکمل کرنے کی توفیق عنایت کرے جس طرح اس کے خاتمہ کی سعادت بخشی۔

علاوہ ازیں تفسیر فتح العزیز کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحب نے گو اپنی تفسیر کو مکمل نہیں کیا تھا مگر وہ اس کے آرزومند ضرور تھے، سورہ بقرہ میں حضرت موسیٰؑ کے تفصیلی ذکر کے درمیان لکھتے ہیں:

حزقیل کہ از جملہ قبطیان بشرف ایمان مشرف شدہ بود و حال او در سورہ حم المؤمن انشاء اللہ مذکور خواہد شد (۲)

حزقیل جو قبطیوں کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے، مشرف بہ ایمان ہو گئے تھے اور ان کا حال انشاء اللہ سورہ مومن میں بیان ہوگا۔

شاہ صاحب کی تحریروں میں تفسیر کے غیر موجود حصوں کے حوالے سے یہ دھوکہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ حصہ ضبط تحریر میں آ ہی چکا تھا کیوں کہ مصنفین کا عام دستور یہ ہے کہ وہ آیندہ جو کچھ لکھنے والے ہوتے ہیں، ان کا حوالہ پہلے ہی دے دیتے ہیں مگر پھر عمر کے وفا نہ کرنے یا کسی اور مانع کے سبب وہ حصہ لکھنے سے رہ جاتا ہے، اس کی مثالیں اکثر قدیم اور بڑے مصنفین کے یہاں ملتی ہیں۔

تکملہ تفسیر فتح العزیز تفسیر فتح العزیز کے ناقص رہ جانے کا احساس اہل علم کو شروع ہی سے رہا ہے، مقالات طریقت کی روایت کے مطابق نواب سکندر بیگم والیہ بھوپال کو اس کی تکمیل کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ انہوں نے اس اہم کام کے لیے شاہ عبدالعزیز صاحب کے ایک شاگرد (۳) مولوی حیدر علی کو مامور کیا، جنہوں نے علاحدہ علاحدہ پاروں کی صورت میں ستائیس جلدوں میں اس کا تکملہ لکھا (۴) چوں کہ تفسیر فتح العزیز کی اشاعت علاحدہ علاحدہ پاروں کی صورت میں ہوئی تھی، اسی لیے غالباً تکملہ میں بھی اس امر کو ملحوظ رکھا گیا، مگر اس کی صرف چار جلدیں

(۱) تفسیر فتح العزیز، ج ا، بمبئی، ص ۴ (۲) ایضاً، ص ۲۹۴ (۳) مولانا عبدالحئی، ص ۱۵۴-۱۵۵ (۴) معارف ستمبر ۱۹۶۵ء، ص ۱۹۴۔

دار العلوم ندوۃ العلما کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں (۱)، ان کے علاوہ بقیہ جلدوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔

تفسیر فتح العزیز کی نمایاں خصوصیات شیخ رفیع الدین مراد آبادی نے تفسیر فتح العزیز کی اہم خصوصیات یہ گنائی ہیں:

۱- ہر سورت کا عنوان اور اجمالاً مضمون سورت کا بیان، ۲- ربط آیات، ۳- نظائر قرآن کا ذکر، ۴- قصص واحکام کے اسرار کا بیان، ۵- لطائف نظم قرآن۔ (۲)

واقعہ یہ ہے کہ شاہ عبد العزیز صاحب کی تفسیر گو نامکمل ہے مگر اس میں یہ تمام خصوصیات بہ درجہ اتم پائی جاتی ہیں، ذیل میں اسی ترتیب کے موافق بہ طور نمونہ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

سورتوں کے عنوان اور اجمالی مضمون کی وضاحت سورہ بقرہ کی تلخیص شاہ صاحب نے مندرجہ ذیل پانچ نکات میں کی ہے:

۱- اثبات وجود صانع، ۲- اثبات نبوت، ۳- ثبوت استقامت، ۴- ثبوت مجاہدہ، ۵- اثبات معاد، ان کی تشریح کے بعد وہ لکھتے ہیں:

وہمیں پنجم است کہ خلاصہ مطالب این سورہ است وباقی امور متممات ومقدمات ایں امور پنج گانہ اند (۳)	یہی پانچ نکتے اس سورہ کے مطالب کا خلاصہ ہیں اور بقیہ چیزیں ان ہی کے متممات و مقدمات ہیں۔

اس کے بعد شاہ عبد العزیز صاحب نے قرآن مجید میں سورہ بقرہ کے مقام ومرتبہ کا تعین کرتے ہوئے اس سورہ کے بنیادی موضوع کی بھی وضاحت کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

باید دانست کہ در مسند امام احمد ودیگر کتب معتبرہ حدیث وارد شدہ کہ آنحضرت ﷺ فرمودہ اند کہ سورہ بقرہ بہ منزلہ کوہان قرآن	یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مسند احمد اور دوسری حدیث کی معتبر کتابوں میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ قرآن مجید میں سورہ بقرہ کی

(۱) مجموعہ مقالات، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، "قرآن مجید کی تفسیریں چودہ سو برس میں"، پٹنہ، ۱۹۹۵ء، ص ۲۰۴ (۲) ہندوستانی مفسرین، ص ۲۵۵۔ (۳) تفسیر فتح العزیز، ج ۱، ص ۷۸-۷۹۔

است ...... و ازیں حدیث معلوم می شود کہ آیت الکرسی بہ منزلہ دل ایں سورہ است وفی الواقع بعد از تامل و امعان نظر دریافتہ شود کہ جمیع مطالب ایں سورہ گردا گرد ہمیں آیت دوراں می کنند آنچہ بہ منزلہ جان است لفظ الحیّ القیوم است کہ در آیت الکرسی واقع است و جمیع آیات سورہ شیون ومظاہر ایں کلمہ اند چنانچہ جمیع اعضای انسان مظاہر و شیون جان پاک اند۔(۱)	حیثیت کوہان کی ہے ...... اور اسی حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ کا دل آیت الکرسی ہے اور فی الحقیقت غور وتدبر کے بعد یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اس سورہ کے تمام مضامین آیت الکرسی کے اردگرد گردش کرتے نظر آتے ہیں اور آیت الکرسی میں بھی لفظ الحیّ القیوم کو جان کا مرتبہ حاصل ہے اور پوری سورہ اسی کلمہ کا مظہر ہے، جس طرح انسان کے تمام اعضا و جوارح جان کے مظہر ہوا کرتے ہیں۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے حیات وقومیت کے مرکزی عنوان کے تحت پوری سورہ کے مضامین کا تجزیہ کیا ہے اور یہ حصہ خاص اہمیت کا حامل ہے، جس کا اندازہ خود شاہ صاحب کے اس جملہ سے ہوتا ہے:

”بطریق نمونہ چیزے نوشتن ضرور است بغور باید شنید“۔(۲)

ذیل میں شاہ صاحب کی اس بحث کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

”یہ عالم آب وگل اللہ تعالیٰ کی حیات و قیومیت کے رنگ برنگ مظاہر کا جلوہ ہے، اس کو ابتدائے سورہ میں عام انسانی افراد کے ضمن میں یوں بیان فرمایا ”کنتم امواتا فاحیاکم“ (۲:۲۸) پھر انسانوں کی اجتماعی صورت میں اس احسان عظیم کو ابوالآبا حضرت آدمؑ کی خلقت اور منصب خلافت پر ان کی سرفرازی کے ذریعہ یوں تعبیر فرمایا ”واذ قال ربک للملائکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ“ (۲:۳۰)، اس کے بعد خاندان کی حیات و قیومیت کا ذکر کیا اور اس کے لیے بہ طور مثال ایسے خاندان کا انتخاب کیا جو نزول

(۱) تفسیر فتح العزیز، ج ۱، ص ۷۹ (۲) ایضاً ص ۸۰۔

قرآن مجید کے وقت اپنی عظمت و وجاہت میں ممتاز ترین خاندان تھا، یعنی خاندان بنی اسرائیل اور تقریباً پہلے پورے پارہ میں اسی خاندان کا مفصل تذکرہ ہے اور اس کی تفصیلات میں بھی حیات و قومیت کا خاص اہتمام ہے، پہلے تو واقعہ فرعون کا ذکر ہے جس نے اس خاندان کی جسمانی زندگی کا خاتمہ کر دینا چاہا تھا مگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کو حیات و قیومیت عطا ہوئی، پھر اس خاندان کو روحانی زندگی عطا کیے جانے کا تذکرہ تورات دیئے جانے کی صورت میں ہوا، جب کہ اس خاندان کے ناسمجھ لوگ گوسالہ پرستی میں مبتلا ہو کر اپنی روحانی زندگی کا خاتمہ کر چکے تھے، پھر ایک ایسی جماعت کا تذکرہ ہوا جس نے ''حتی نری اللہ جھرۃ'' (۲:۵۵) کا مطالبہ کر کے اپنی تباہی کا سامان کر لیا، مگر حضرت موسیٰ کی دعا سے اس کو زندگی عطا ہوئی، اس کے بعد وادی تیہ کا ذکر ہے، جہاں اس خاندان کو اپنا وجود برقرار رکھنا بظاہر مشکل تھا، مگر رحمت خداوندی نے ابر کے سایہ سے اور من وسلویٰ کی نعمت نازل کر کے غیب سے حیات و قیومیت کا سامان فراہم کیا، آخر کار اس خاندان کے لوگوں نے معاصی کا ارتکاب کر کے جب اپنی زندگی کو معرض خطر میں ڈال لیا تو اللہ نے مسخ کے ذریعہ ان سے حیات طیبہ چھین لی اور اس واقعہ کو دوسروں کی عبرت کے لیے بیان کیا تا کہ پھر کوئی خاندان اس نوع کے معاصی کا مرتکب ہو کر اپنی حیات و قومیت کا خاتمہ نہ کر لے، قصہ بقرہ میں بھی اس خاندان کی قساوت قلبی، نفاق پروری اور عہد و میثاق کی خلاف ورزی کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا کہ یہ ساری چیزیں ہلاکت و بربادی کی موجب تھیں مگر عنایت الٰہی نے ان کو تباہی سے بچایا، واقعہ ہاروت و ماروت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ سحر اور دوسرے مبنی بر کفر اشغال روحانی حیات کے منافی ہیں، اس کے بعد آیت ''واذا بتلی ابراھیم ربہ بکلمات'' (۲:۱۲۴) سے دوسرے سربرآوردہ خاندان بنو اسماعیل کا تذکرہ شروع ہوا، جس میں سب سے پہلے خانہ کعبہ کی تعمیر اور سرزمین مکہ کا ذکر اور خانۂ کعبہ کی تقدیس و عظمت کا بیان ہے جس سے

یہ بتانا مقصود ہے کہ خاندان بنو اسماعیل کی حیات و بقا کا انحصار بیت اللہ کی تعظیم و تکریم اور عبادت الٰہی میں ہے۔

ان دو خاندانوں کے تذکرہ کے بعد بعض ایسے امور کا بیان ہوا ہے جو بظاہر حیات و بقا کے منافی ہیں مگر حیات و قیومیت کا تعلق ان ہی سے ہے، ان میں پہلی چیز شہادت فی سبیل اللہ ہے کہ فرمایا ''ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون'' (۲:۱۵۴)، چنانچہ شہادت کو بہترین زندگی سے تعبیر فرمایا، اسی طرح حکم قصاص ہے ''ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب'' (۲:۱۷۹) کہ بظاہر قاتل کی زندگی کا خاتمہ دکھائی دیتا ہے مگر یہ درحقیقت ایک عالم کی زندگی کا سامان ہے، حیات روح انسان کو روزہ کی حالت میں بھوکے اور پیاسے رہ کر حاصل ہوتی ہے، حیات دین کا حصول اعداء اللہ سے جہاد و قتال کے ذریعہ ممکن ہوتا ہے، حیات ملت جس کا مظہر شعائر حج ہے، انفرادی حیات کے حصول و بقا کے لیے نکاح و طلاق اور حیض وغیرہ کے احکام بیان کیے گئے، حیات مال کا ذکر میت کی وصیت کو بلا تبدل و تغیر نافذ کرنے سے تعبیر کیا ہے۔

ان امور سے فراغت کے بعد بعض ایسے واقعات کا بیان ہوا ہے جن میں غیب سے حیات و قومیت کے انتظام کا ذکر ہے اور یہ واقعات کلمہ الحی القیوم سے پہلے بھی آئے ہیں اور اس کے بعد بھی تاکہ اس کلمہ کی اہمیت کا ادراک ممکن ہو سکے، قبل آیت دو واقعے ذکر کیے گئے: ۱- بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی اجتماعی موت پھر حضرت حزقیل کی دعا سے ان کا دوبارہ زندہ ہو جانا، ۲- واقعہ حضرت شموئیلؑ و طالوت جس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ خاندان بنی اسرائیل کے زوال کے بعد ان دونوں کے ہاتھوں اس خاندان کو حیات نو ملی اور حضرت داؤدؑ کے ذریعہ جب ان کو تابوت سکینہ حاصل ہوا تو ان کی قیومیت پوری طرح جلوہ گر ہوئی۔

آیت کے نزول کے بعد کے واقعات متعدد ہیں: ۱- قصہ نمرود، جس

میں بتایا گیا ہے کہ اس نے اپنی ناسمجھی سے حیات وموت کا مصدر خود کو سمجھ لیا تھا، ۲-واقعہ حضرت عزیرؑ، جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک ویران آبادی کی از سر نو زندگی ان کو مستبعد معلوم ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے خود ان پر اور ان کی سواری پر اس عمل کو دہرا کر ان کو شرح صدر بخشا، ۳-واقعہ حضرت ابراہیمؑ، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مردوں کے دوبارہ زندہ کیے جانے پر ان کو جب استعجاب ہوا تو اللہ تعالیٰ نے سر و بدن کٹے پرندوں میں جان ڈال کر ان کے اطمینان قلب کا سامان فراہم کیا، یہ سلسلہ آیت "مثل الذین ینفقون اموالھم......" (۲:۲۶۱) سے پہلے تک بیان ہوا ہے۔

اس کے بعد مال کے حیات وقیام کا بیان شروع ہوا ہے، جس میں سب سے پہلے اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ اس کے اضافہ واستحکام کا بظاہر ربوا سے رشتہ نظر آتا ہے مگر درحقیقت یہ اس کا اتلاف ہے، اس کے برعکس انفاق وصدقہ اس کے بقا واستحکام کا ضامن ہے، پھر مال کی قیومیت وبقا کے متعدد اصول بیع، قرض وغیرہ کے احکام بیان ہوئے ہیں اور اسی پر سورہ کے سلسلہ مضامین کا اختتام ہوا ہے"۔

سورہ کے مرکزی خیال کی وضاحت کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں:

پس معلوم شد کہ مطالب ایں سورہ ہمہ شرح وبسط حیؔ وقیوم اند وایں کلمہ بہ منزلہ جان ایں سورہ است وآیت الکرسی بمشابہ قلب ایں سورہ وتمام ایں سورہ بہ منزلہ اعضاو جوارح واللہ اعلم۔ (۱)

پس معلوم ہوا کہ اس سورہ کے تمام ہی مضامین حیؔ وقیوم کی شرح وتفصیل ہیں اور یہ کلمہ اس سورہ کی جان کا درجہ رکھتا ہے اور آیت الکرسی کی حیثیت دل کی ہے اور باقی سورہ اعضاو جوارح کے درجہ میں ہیں۔

ربط آیات وسور شیخ رفیع الدین مرادآبادی نے تفسیر فتح العزیز کی دوسری خصوصیت ربط آیات کو بتایا ہے، تفسیر فتح العزیز کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے یہاں اس

(۱) تفسیر فتح العزیز، ج ۱، ص ۸۰ تا ۸۲۔

کا خاص اہتمام تھا، وہ آیتوں کے ربط کے ساتھ ساتھ سورتوں کے درمیان بھی ربط و مناسبت کے قائل تھے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیب کے توقیفی ہونے میں علما کا اختلاف ہے، یعنی سورتوں کی ترتیب حضور ﷺ کے فرمان کے بہ موجب ہوئی ہے یا یہ صحابہؓ کے اجتہاد سے انجام پائی ہے، جنہوں نے اپنی فہم سے اس کو ترتیب دیا ہے، ان دونوں صورتوں میں سورتوں کا ربط ضروری ہے، کیوں کہ اگر یہ ترتیب توقیفی ہے اور شارعؑ کے حکم کے بہ موجب عمل میں آئی ہے تو اس کی حکمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ حکیم و دانا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا ہے اور اگر یہ بات ہے کہ صحابہؓ نے اپنے اجتہاد سے اس کو ترتیب دیا ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے کس مناسبت سے ایک سورہ کو دوسری سورہ کے بعد رکھا ہے اور اگر اس کو محض یوں ہی تسلیم کر لیا جائے تو یہ بات بے بنیاد ہوگی کیوں کہ صحابہؓ کی زندگی بھی حکمت سے خالی نہ تھی اور اس سے دین میں ایک لاطائل کام کے اضافہ کی بات لازم آئے گی جو صحیح نہیں ہے"۔(۱)

شاہ صاحب نے سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کے درمیان ربط کی ایسی دل نشیں وضاحت کی ہے جس سے ربطِ آیات اور ربط سور دونوں ہی کی بہ خوبی وضاحت ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

سورہ فاتحہ بر سبیل اجمال متضمن جمیع معانی قرآن است و سورہ بقرہ ابتدائے تفصیل آں و نیز در سورہ فاتحہ بآیت "اھدنا الصراط المستقیم" (۱:۶) بندہ را طلب ہدایت تعلیم نمودہ اند و در سورہ بقرہ بآیت "ھدی للمتقین" (۲:۲) تا "اولائک علی ھدی من ربھم" (۲:۵) بیان فرمودہ	سورہ فاتحہ مجمل طور پر قرآن مجید کے تمام معانی پر محیط ہے اور سورہ بقرہ سے اس اجمال کی تفصیل کا آغاز ہوتا ہے، سورہ فاتحہ میں آیت اھدنا الصراط المستقیم میں بندہ کو ہدایت طلب کرنے کی تعلیم دی گئی ہے تو سورہ بقرہ میں ھدی للمتقین سے لے کر اولائک علی ھدی من ربھم تک یہ وضاحت کی گئی

(۱) تفسیر فتح العزیز، ج۱، ص ۸۶۔

اند کہ دولت ہدایت کرا میسر شدہ وایں نعمت کہ یافت وایں سعادت کہ دریافت ونیز در آخر سورہ فاتحہ ذکر زمرہ مومناں و دوفرقہ کافراں بود و در آغاز سورہ بقرہ نیز ذکر زمرہ مومناں و دو فرقہ کافراں از مجاحداں و منافقاں ارشاد شدہ و نیز در سورہ فاتحہ اول از صفات الٰہیہ ربوبیت مذکور است و دریں سورہ نیز اول شرح ربوبیت او تعالیٰ است نسبت بہ نوع انسانی کہ "کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتا فاحیاکم" (۲:۲۸) ودر "یاایھا الناس اعبدوا ربکم" (۲:۲۱) ایں معنی را بطریق تمہید تفصیل مستتبع نمودہ اند باز در سورہ فاتحہ انواع رحمت دینی و دنیوی است بدو اسم الرحمٰن الرحیم ارشاد شدہ ودریں سورہ تفصیل انواع رحمت دینی ودنیوی است کہ نسبت بدو فرقہ بنی اسرائیل و بنی اسماعیل از پیش گاہ حضور خداوندی عنایت شدہ باز در سورہ فاتحہ بمقدمہ جزاء بآوردن "مالک یوم الدین" (۱/۳) ارشاد فرمودہ اند ودریں سورہ در ذکر بنی اسرائیل مقابل ہر کفران وعصیان ایشاں مجازات ایشاں بعقوبات دنیوی مذکور شدہ باز در سورہ فاتحہ بیان عبادت واستعانت است ودریں

ہے کہ دولت ہدایت سے کس قسم کے لوگ سرفراز ہوتے ہیں، سورہ فاتحہ کے اخیر میں مومنین کی جماعت کے ساتھ کافروں کے دو فرقوں کا ذکر ہوا ہے، چنانچہ سورہ بقرہ میں مومنین کی تفصیل کے ساتھ کفار کے دو طبقے بغض و عناد میں کھلے ہوئے اور منافقین کی تفصیل مذکور ہے، سورہ فاتحہ میں صفات الٰہی میں ربوبیت کا ذکر سب سے پہلے ہوا ہے، سورہ بقرہ میں آیت کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتا فاحیاکم میں اس کی تفصیل ذکر کی گئی اور آیت یاایھا الناس اعبدوا ربکم سے اس کی تمہید کا آغاز ہوا ہے، سورہ فاتحہ میں الرحمٰن الرحیم دو اسماء کے ذریعہ رحمت دینی و دنیوی کو مجمل طور پر بیان کیا گیا اور سورہ بقرہ میں اس کی تفصیل بنی اسرائیل اور بنو اسماعیل کے واقعات سے کی گئی کہ ان کو حضور خداوندی میں کیسے بلند رتبے ملے، سورہ فاتحہ میں حساب وکتاب کا ذکر مالک یوم الدین سے ہوا ہے اور اس کی تفصیل سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کے کفران وعصیان کے بدلہ میں سزا وعقاب کے ذکر سے کی گئی ہے، سورہ فاتحہ میں عبادت و استعانت کا بیان ہے، سورہ بقرہ میں آیت فاذکرونی اذکرکم

سورہ از آیت "فاذکرونی اذکرکم و اشکرولی ولا تکفرون" (۲/۱۵۲) تا آخر مسائل جہاد و حج شرح انواع عبادت است و از آیۃ "ویسئلونک عن الیتامی" (۲/۲۲۱) تا آخر مسائل صدقات و ربوا تفصیل اقسام استعانت است و در آیۃ "آمن الرسول" (۲/۲۸۵) بیان صراط مستقیم است کہ در حقیقت بر طلب آں مطالب سورہ فاتحہ منتہی شدہ پس ایں سورہ حکم شرح سورہ فاتحہ دارد۔(۱)	واشکروالی ولا تکفرون سے لے کر مسائل جہاد و حج تک انواع عبادت کی شرح و تفصیل ہے اور آیت ویسئلونک عن الیتامی سے صدقات و ربوا کے مسائل تک استعانت کی توضیح کی گئی ہے اور آیت آمن الرسول میں صراط مستقیم کا بیان ہے اور در حقیقت ان ہی مطالب پر سورہ فاتحہ مشتمل ہے تو معلوم ہوا کہ سورہ بقرہ سورہ فاتحہ کی شرح ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے آیتوں کے درمیان ربط و مناسبت کی جو تفصیلات بیان کی ہیں، وہ بھی دل چسپ ہیں، سورہ فاتحہ کی آیات "اھدنا الصراط المستقیم، صراط الذین انعمت علیھم" کے درمیان ربط کی وضاحت ان کے قلم سے ملاحظہ ہو:

> "جب بندہ کو یہ تعلیم دی کہ راہ راست طلب کرے تو اس کا تقاضا تھا کہ راہ یابوں کا بھی تذکرہ کردے تاکہ نیک و بد راہ میں امتیاز کرسکے، ورنہ ہر مذہب کے لوگ اس کے مدعی ہیں کہ ہم راہ راست پر ہیں...... چنانچہ راہ راست کی تفصیل صراط الذین انعمت علیھم کے ذریعہ بیان کی یعنی ان لوگوں کی راہ جن پر انعام و اکرام ہوا اور اس کی تفسیر سورہ نساء کی اس آیت سے ہوتی ہے" ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا" (۴/۶۹) معلوم ہوا کہ راہ راست ان ہی چار طبقوں انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کی راہ ہے اور بندہ کو خدا سے التجا کے وقت ان ہی کو نظر میں رکھنا چاہیے

(۱) تفسیر فتح العزیز، ج ۱، ص ۹۰۔

اور ان ہی کی معیت طلب کرنی چاہیے، اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ اھدنا الصراط المستقیم راہ حق کی جویائی پر اور صراط الذین انعمت علیھم طلب رفیق کے موضوع پر مشتمل ہے''۔(۱)

سورۃ الملک اور سورہ تحریم کے درمیان ربط کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وجہ ربط یہ ہے کہ سورہ تحریم میں گھریلو زندگی کے حدود و آداب مذکور ہیں کہ آدمی کو اپنے اہل و عیال کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیے اور ان کی رعایت میں معاصی کا مرتکب نہیں ہونا چاہیے اور سورہ ملک میں اللہ رب العزت کی بندگی کے قواعد و آداب کی تعلیم دی گئی ہے، گویا پہلی سورہ میں ایک گھر کے انتظام کا ذکر ہے اور دوسری میں کائنات کے نظام کا تذکرہ ہے اور اس بنا پر اسلوب کا تقاضا ہے کہ پہلے نسبتاً کم درجہ کی چیز کو بیان کیا جائے، اس کے بعد اعلا درجہ کی چیز کا ذکر کیا جائے''۔(۲)

شاہ عبدالعزیز صاحب نے اکثر سورتوں کے درمیان اسی انداز سے وجوہ مناسبت تحریر کیے ہیں اور ان کے مضامین کی یکسانی دکھائی ہے، کہیں کہیں انہوں نے متعدد سورتوں کو ہم مضمون ثابت کیا ہے، چنانچہ سورہ جن کا ربط ماقبل سورتوں سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ووجہ ربط ایں سورہ با سورہ نوح و ماقبلش آنست کہ در سورہ نون مذکور است کہ کافران مکہ آنحضرت ﷺ را با وصف کمال قرب نسب و وقوف بر احوال آنجناب ﷺ و اخلاق کریمہ آں عالی قباب نشناختند و مجنوں گفتند و در سورہ حاقہ مذکور است کہ آں اشقیاء باوجود ادعائی عقل و دانش قرآن مجید را گاہے قول شاعر و گاہے قول	سورہ جن کا ربط سورہ نوح اور اس سے ماقبل سورتوں سے یہ ہے کہ ابتدا سورہ نون میں یہ ذکر کیا گیا کہ کفار مکہ آنحضرت ﷺ سے نسبی تعلق رکھنے اور آپ ﷺ کے اخلاق کریمانہ سے واقف ہونے کے باوجود آپ ﷺ کی عظمت و بزرگی کے قائل نہ ہوئے بلکہ نعوذ باللہ آپ ﷺ کو مجنوں کہنا شروع کیا، پھر سورہ حاقہ میں یہ بیان کیا گیا کہ یہ بدبخت عقل و دانش

(۱) تفسیر فتح العزیز، ج۱، ص ۱۱-۱۲ (۲) ایضاً، پارہ تبارک الذی، مطبوعہ ہوگلی، ص ۲۔

کاہن وگاہے افترا پیغمبر می گفتند ...... تا آنکہ در سورہ معارج صریح تعنت و مکابرہ ایشاں را مذکور فرمودند کہ ازراہ کمال جہل عذاب درخواست می کنند و در سورہ نوح برائے تسلی آنحضرت ﷺ قصہ دعوت بالغہ حضرت نوحؑ در مدت ہزار سال قوم خود را بانواع ترغیب و ترہیب فہما نیندن ...... حالا دریں سورہ ارشاد می شود کہ تماشائے قدرت الٰہی بہ بیں و بداں کہ مقلب القلوب و ہادی حقیقی اوست قوم تو باوجود ایں اطلاع بر احوال تو و باوصف قرب نسب و جنسیت و لغت دانی و عربیت و استعداد معرفت اعجاز قرآن بادنی تامل ایں قدر گمراہ اند و مکابرہ و تعنت می کنند ...... و جماعہ از جن کہ نہ ہم جنس تو اند و نہ تعبیر بشری را نیک می فہمند و نہ ترا دیدند و نہ صحبت تو رسیدند ...... چہ قدر لبریز نشہ ہدایت شدند و بچہ رنگ معتقد قرآن مجید گشتند''۔(۱)

کے مدعی ہیں مگر قرآن مجید کو یا تو شاعر و کاہن کا کلام بتاتے ہیں یا آپ کا طبع زاد بتلاتے ہیں ...... پھر سورہ معارج میں ان کی صریح سرکشی اور ضد کا ذکر ہوا ہے کہ یہ لوگ اپنی حد سے بڑھی ہوئی جہالت کے سبب عذاب کی تمنا کرتے ہیں، پھر سورہ نوح میں حضور ﷺ کی تسلی کے لیے حضرت نوحؑ کا واقعہ بیان کیا گیا کہ کس طرح انہوں نے ہزار سال تک اپنی قوم کو مختلف طریقوں سے دعوت دی ...... اب سورہ جن میں یہ بتایا گیا کہ قدرت الٰہی کا تماشا دیکھو کہ کفار تو آپ ﷺ کے ہم وطن و ہم قوم و ہم زبان ہیں اور قرآن مجید کے اعجاز کو زیادہ سمجھ سکتے ہیں مگر اس کے باوجود ان پر جہالت و گمراہی کا پردہ پڑا ہوا ہے، اس کے برعکس جنوں کی ایک جماعت جس کو نہ آپ ﷺ سے نسبی تعلق ہے اور نہ ٹھیک سے انسانوں کی زبان کو سمجھ سکتی ہے اور نہ آپ ﷺ کو دیکھا اور صحبت اٹھائی ہے، ان سب کے باوجود کس قدر نشہ ہدایت سے سرشار اور قرآن مجید کے گرویدہ ہیں۔

نظائر قرآن تفسیر فتح العزیز کی تیسری خصوصیت شاہ رفیع الدین صاحب نے یہ بتائی ہے کہ اس میں قرآن مجید کے نظائر بہ کثرت پیش کیے گئے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ شاہ عبد العزیز صاحب

(۱) تفسیر فتح العزیز، پارہ تبارک الذی، ص ۱۵۳-۱۵۴۔

القرآن یفسر بعضه بعضا کے قائل تھے اور اپنی تفسیر میں انہوں نے اس کا خاص اہتمام کیا ہے، قرآن مجید کو وہ اصل محکم سمجھتے تھے اور شریعت کے تمام مآخذ کا سررشتہ اسی سے جوڑتے تھے، وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

پس در حقیقت اصل محکم کہ بر ہر کس از پیغمبر و امت و مجتہد و عامی لازم الاتباع است ہمیں قرآن است وبس (۱)	در حقیقت اصل محکم جس کی پیروی ہر شخص پر واجب ہے خواہ وہ پیغمبر ہو یا امت کے افراد مجتہد ہوں یا عام لوگ بس یہی قرآن ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے قرآن مجید کے علاوہ شرعی احکام کے دوسرے مآخذ سنت، اجماع اور قیاس کی مفصل تشریح کی ہے اور ان کو بھی کتاب اللہ کا تابع بتایا ہے۔

تفسیر فتح العزیز میں قرآنی نظائر کے استعمال کی ایک مثال ملاحظہ ہو، لفظ تقوی کی تعریف اور اس کے استعمالات کے تحت وہ لکھتے ہیں:

''شریعت کی اصطلاح میں تقوی کے کئی معانی ہیں:

۱-ایمان: جیسا کہ آیت میں ہے'' والزمھم کلمة التقوی '' (فتح ۴۸:۲۶)

۲-توبہ: جس کا ذکر قرآن مجید میں یوں ہے'' ولو ان اھل القری آمنوا واتقوا '' (اعراف ۷:۹۶)

۳-طاعت: اس کا استعمال اس آیت میں ہے'' ان انذروا انه لا اله الا انا فاتقون '' (نحل ۱۶:۲)

۴-ترک گناہ: جس کا استعمال اس آیت میں ہوا ہے'' واتوا البیوت من ابوابھا واتقوا اللہ '' (بقرہ ۲:۱۸۹)

۵-اخلاص: جیسا کہ آیت میں ہے'' فانھا من تقوی القلوب '' (حج ۲۲:۳۲)

قرآن مجید میں تقوی کی فضیلت ان آیتوں میں بیان ہوئی ہے:

(۱) تفسیر فتح العزیز، ج ۱ ص ۱۰۳

"ان اللہ مع الذین اتقوا" (نحل ۱۶:۱۲۸) "وتزودوا فان خیر الزاد التقوی" (بقرہ ۲:۱۹۷) "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" (حجرات ۴۹:۱۳)۔

احادیث میں بھی تقوی کی فضیلت بہ کثرت وارد ہیں۔(۱)

سورہ بقرہ کی آیت "ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ" کی تفسیر میں وہ رقم طراز ہیں:

سوال اول آنکہ علی سمعھم معطوف بر قلوبھم است پس داخل در تحت ختم باشد یا عطف جملہ بر جملہ است پس ہمراہ بصر داخل در حکم غشاوہ است جواب ازیں سوال آنکہ القرآن یفسر بعضہ بعضا در جائے دیگر قرآن مجید سمع را در داخل حکم ختم فرمودہ اند نہ داخل حکم غشاوہ در آیت وختم علی سمعہ و قلبہ وجعل علی بصرہ غشاوہ۔(۲)	اس آیت کے سلسلہ میں پہلا سوال تو یہ ہے کہ علی سمعھم کا عطف قلوبھم پر ہے، اس لیے وہ ختم سے متعلق ہے یا جملہ کا جملہ پر عطف ہے یعنی بصر کے ساتھ مل کر غشاوہ سے متعلق ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ القرآن یفسر بعضہ بعضا، چنانچہ قرآن مجید نے ایک دوسرے مقام پر سمع کو غشاوہ کے بجائے ختم سے متعلق کیا ہے، وہ آیت یوں ہے وختم علی سمعہ و قلبہ وجعل علی بصرہ غشاوۃ۔

قصص واحکام کے اسرار

تفسیر فتح العزیز کی چوتھی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں واقعات اور احکام کے اسرار ورموز بھی بیان کیے گئے ہیں، چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے مختلف واقعات کے اسرار بیان کیے ہیں، خاص طور پر بنی اسرائیل کے واقعات ان کے بحث و تحقیق کا موضوع رہے ہیں، اسی طرح قرآن مجید کے احکام کو بھی انہوں نے دقت نظر سے لکھا ہے، سورۂ بقرہ کی تفسیر میں "ویقیمون الصلوۃ" کے تحت وہ لکھتے ہیں:

ویقیمون الصلوۃ یعنی وبرپامی دارند نماز را دریں جا باید فہمید کہ نماز گزاردن	ویقیمون الصلوۃ کے یہ معنی ہیں کہ وہ لوگ نماز کو برپا کرتے ہیں، یہاں یہ بات

(۱) تفسیر فتح العزیز، ج ا ص ۱۱۰ (۲) ایضاً ص ۱۲۴۔

چیزیست و برپاداشتن چیزی دیگراست......
پس معنی اقامت صلوۃ آنست کہ نماز
رااز ہر خلل وکجی محافظت نمایند خواں آں
خلل وکجی درکار دل باشد یادرکار زباں یا
درکار جوارح واعضا خواہ ایں محافظت در
فرائض باشد یا در شروط یا در سنن یا در
مستحبات۔(۱)

سمجھنے کی ہے کہ نماز پڑھ لینا ایک الگ چیز ہے
اور برپا کرنا دوسری چیز ہے......اقامت صلوٰۃ
کے یہ معنی ہیں کہ نماز کو ہر قسم کے خلل اور کجی
سے محفوظ رکھا جائے، خواہ اس کا تعلق دل
سے ہو، زبان سے ہو یا اعضا و جوارح سے
اور یہ حفاظت تمام نمازوں میں کرنی چاہیے،
خواہ فرائض ہوں یا سنن و مستحبات۔

اسی طرح شاہ صاحب نے سورۂ فاتحہ کے تمام مطالب کی حکیمانہ تشریح بھی کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"یہ جاننا چاہیے کہ انسان کے دل میں شیطان تین راہوں سے داخل ہوتا ہے، شہوت، غضب اور ہوا، شہوت کو بہیمیت، غضب کو سبعیت اور ہوا کو شیطنت کہتے ہیں اور ان میں بھی غضب شہوت کے مقابلہ میں اور ہوا غضب کے مقابلہ میں زیادہ قبیح ہے، یہ کہا جاتا ہے کہ انسان شہوت کے سبب اپنے آپ پر اور غضب کی بنا پر دوسروں پر اور ہوا کے باعث خدا پر ظلم کرتا ہے......اس تمہید کے بعد یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں جو تین اسمائے الٰہی مذکور ہیں، ان سے یہ تینوں امراض ختم ہوتے ہیں اور سورۂ فاتحہ کی ساتوں آیتیں ان سے پیدا ہونے والی بداخلاقیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہیں، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جو کوئی اللہ کو پہچان لے گا، ہوا کی شیطانیت سے محفوظ رہے گا اور جس کو رحمانیت کا علم نصیب ہوگا وہ غضب سے اپنے کو دور رکھے گا اور جس کو رحیمیت کی بصیرت حاصل ہوگی وہ اپنے نفس پر ظلم کرنا پسند نہ کرے گا۔

بندہ الحمد للہ کہنے کے بعد مرتبۂ شکر کو پالیتا ہے، چنانچہ وہ اپنے حال پر قانع و مطمئن ہوتا ہے اور شہوت سے اپنے آپ کو پاک وصاف رکھتا ہے،

(۱) تفسیر فتح العزیز، ج ۱، ص ۱۱۶۔

ایاک نعبد و ایاک نستعین کا فائدہ یہ ہے کہ پہلے جملہ سے تکبر اور دوسرے سے عجب وفخر کا خاتمہ ہوتا ہے اور اھدنا الصراط المستقیم کہنے کے بعد وہ کفر و بدعت سے نجات پا جاتا ہے''۔(۱)

اسی طرح شاہ صاحب نے سورۂ بقرہ میں ھدی للمتقین کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے انسانوں کے انجام کار کے اعتبار سے سات مرتبے بتائے ہیں، ان میں دو بد بخت اور پانچ نیک بخت ہیں، پھر انہوں نے قرآنی نظائر پیش کر کے ان کی تفصیلات بیان کی ہیں اور قرآن مجید کی ہدایت کو طبقہ سعید کے پانچ فرقوں کے لیے خاص بتایا ہے۔(۲)

لطائف نظم قرآن اس تفسیر کی پانچویں خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں نظم و ربط کے لطائف بھی بیان ہوئے ہیں جو قدم قدم پر ملتے ہیں، سورۂ فاتحہ کی آخری آیت غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کے تحت وہ رقم طراز ہیں:

نیز باید دانست کہ تقدیم مغضوب علیھم بر ضالین اشعاری دارد باں کہ حالت آں ہا تباہ تر در آخرت آنہا رسوا تر انداز نسبت ضالین پس در تفسیرات رجحان جانب مغضوب علیھم را در بد مآلی رعایت باید نمود تا خلاف نظم قرآنی لازم نیاید۔(۳)

یہ جاننا چاہیے کہ مغضوب علیھم کو ضالین سے پہلے جو رکھا گیا ہے، اس میں یہ اشارہ ہے کہ یہ طبقہ زیادہ بدتر اور آخرت میں ضالین کے مقابلہ میں زیادہ رسوا ہوگا، چنانچہ تفسیر میں مغضوب علیھم کی بدبختی کے غلبہ کو ملحوظ رکھنا چاہیے تا کہ قرآنی ترتیب کی خلاف ورزی نہ ہو۔

حروف مقطعات پر بحث مذکورہ بالا خصوصیات کے علاوہ اس تفسیر میں حروف مقطعات پر بھی عمدہ بحث کی گئی ہے اور شاہ صاحب نے ان کے مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ہے، سورۂ بقرہ کی پہلی آیت الم پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الم اس خالص فیض سے کنایہ ہے جو عالم ناسوت میں عرف و علوم انسانی کے مطابق جلوہ گر ہے اور اس نے تذکیر کے ذریعہ قساوت قلبی کا اور

(۱) تفسیر فتح العزیز، ج ۱، ص ۴۷ (۲) ایضاً، ص ۱۰۸ تا ۱۱۰ (۳) ایضاً، ص ۶۰۔

تحدی اور چیلنج کے ذریعہ فاسد اقوال اور غلط افعال کا مقابلہ کیا اور پوری سورہ اسی اجمال کی شرح و تفصیل ہے"۔(۱)

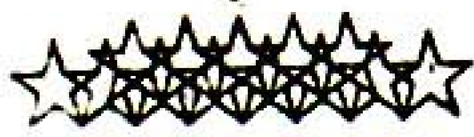
شاہ صاحب نے اس بحث کے اخیر میں خود اپنی رائے یوں پیش کی ہے:

الـم یعنی اصل لازم الاتباع محکم کہ منکراں را معجزہ است و مستدلاں را مفید کہ مطالب عالیہ را بحجج روشن ثبت است و شبہات واہیہ را مزیل وماحی۔(۲)

الـم کا مطلب یہ ہے کہ وہ اصل محکم جس کی پیروی ضروری ہے اور جو منکروں کے لیے معجزہ اور ماننے والوں کے لیے مفید اور واضح دلائل سے روشن ہے اور غلط قسم کے شبہات اور وسوسے زائل و محو کر دیتی ہے۔

تفسیر فتح العزیز میں ہندی کے بعض مروجہ الفاظ مثلاً چیلہ، پوکھر، چودہری وغیرہ کا استعمال بھی جا بجا ملتا ہے۔(۳)

شاہ عبدالعزیز صاحب کو فن حدیث میں غیر معمولی شہرت حاصل ہے اور وہ اس فن کے امام تسلیم کیے جاتے ہیں، مگر ان کی تفسیر کے مطالعہ سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ امام المحدثین کے پہلو بہ پہلو امام المفسرین بھی کہلائے جانے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔



(۱) تفسیر فتح العزیز، ج ۱، ص ۹۵ (۲) ایضاً، ص ۱۰۲ (۳) ایضاً، ص ۱۹،۲۴۵۔

شاہ رفیع الدین دہلویؒ (المتوفی ۱۲۳۳ھ)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فرزند دوم شاہ رفیع الدین دہلوی نے بھی اپنے والد بزرگوار اور برادر اکبر شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی طرح درس وتدریس اور افتاء وارشاد کے ساتھ قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر کی خدمت انجام دی، تاہم ان کی تفسیری کاوش عوام الناس کو قرآن مجید سے متعارف کرانے تک محدود تھی، ذیل میں شاہ صاحب کے مختصر حالات زندگی درج کیے جاتے ہیں، پھر ان کی تفسیری خدمات کا ذکر ہوگا۔

مختصر حالات زندگی شاہ رفیع الدین ۱۱۶۳ھ/۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے، ابھی ابتدائی تعلیم حاصل کر ہی رہے تھے کہ ان کے والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، چنانچہ ان کے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز صاحب نے ان کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ مبذول کی، شاہ ولی اللہ صاحب کے تلمیذ وعزیز شیخ محمد عاشق پھلتی جن سے شاہ عبدالعزیز نے تکمیل تعلیم کی تھی، ان کے بھی مرشد و مربی قرار پائے، غرض بیس برس کی نوعمری میں تعلیم سے فراغت حاصل کرلی اور اپنے والد کے مدرسہ میں درس وتدریس اور افتاء کی ذمہ داری سنبھال لی، ان کے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز صاحب نے اشتداد عوارض کی بنا پر جب تدریس کا سلسلہ موقوف کردیا تو ان کے اسباق بھی پڑھانے لگے اور تقریباً نصف صدی سے زائد عرصہ تک درس وافتاء کا بازار گرم رکھا اور ہزاروں تلامذہ ان سے مستفید ہوئے۔

۱۲۳۳ھ میں دہلی میں ہیضہ کی وبا پھیلی جس کی زد میں وہ بھی آئے، بالآخر اسی مرض میں ۶ رشوال ۱۲۳۳ھ کو وفات پائی، شاہ عبدالعزیز صاحب اس وقت باحیات تھے، انہوں نے اس موقع پر فرمایا کہ ہم چاروں بھائیوں کی رحلت میں ترتیب منعکسہ واقع ہوئی ہے، سب سے پہلے سب سے چھوٹے مولوی عبدالغنی گئے، ان کے بعد ان سے بڑے مولوی عبدالقادر، اس

کے بعد ان سے بڑے مولوی رفیع الدین، اب میری جوان سب سے بڑا تھا باری ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا کہ ان سے میرے چار رشتے تھے:
ا- حقیقی بھائی تھے، ۲- والد مرحوم نے فرمایا تھا کہ یہ تیرا بیٹا ہے، ۳- میری دایہ کا انہوں نے بھی دودھ پیا تھا، ۴- شاگرد تھے۔

خاندان ولی اللہ میں شاہ رفیع الدین کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ دینیات کے ساتھ معقولات پر بھی غیر معمولی دست رس رکھتے تھے، نیز شعر وشاعری سے بھی ان کو شغف تھا، جس میں انہوں نے فلسفیانہ اسرار ورموز کو نظم کیا ہے، انہوں نے متعدد کتب ورسائل تصنیف کیے، ان کی ایک کتاب ''اسرار المحبۃ'' کے بارہ میں محسن ترھتی نے لکھا ہے کہ ''شاید ہی کسی اور مصنف نے اس موضوع کو اس آب وتاب کے ساتھ لکھا ہو، قدما میں ابونصر فارابی اور ابوعلی سینا کے بارہ میں یہ ذکر ملتا ہے کہ انہوں نے اس موضوع کو اپنایا ہے لیکن ان کی کتابیں دست یاب نہیں ہیں۔(۱)

تفسیری خدمات

شاہ رفیع الدین کا ایک تفسیری کارنامہ آیت نور کی تفسیر ہے جس کو شاہ عبدالعزیز نے بھی نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اس کے بارے میں یہ کہا کہ:

ولعمری لقد اتی فی هذا الباب بالعجب العجاب و میّز القشر عن اللباب و نور مصابیح زجاجات القلوب و روح الارواح ببدیع الاسلوب ۔(۲)	بخدا اس باب میں مصنف نے حیرت انگیز کمالات دکھائے ہیں، گودے سے چھلکے کو الگ کر کے آئینۂ قلوب کو روشن اور روح کو مسرور کیا ہے اور لطیف پیرایہ بیان کا استعمال کیا ہے۔

تفسیر آیت نور ۱۹۶۴ء میں مولانا عبدالحمید سواتی کی کوشش سے گوجرانوالہ پاکستان سے شائع ہو چکی ہے، اس میں حقائق اشیا سے بحث کرنے والے حکما کے اقوال وآرا کا ذکر کر کے شاہ ولی اللہ کے موقف کی وضاحت کی گئی ہے، مولانا عبیداللہ سندھی کے بہ قول یہ رسالہ

(۱) شاہ رفیع الدین کے حالات کے لیے دیکھیے ,عبدالحئی حسنی، نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۸۲ تا ۱۸۶ اور مولانا حکیم محمود احمد برکاتی، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، ص ۱۵۶ تا ۱۶۴، مجلس اشاعت اسلام، لاہور ۱۹۷۶ء (۲) عبدالحئی حسنی، حوالہ سابق، ص ۱۸۳۔

شاہ ولی اللہ کے سطعات کی تکمیل ہے۔(۱)

شاہ رفیع الدین کا دوسرا تفسیری کارنامہ ان کی تفسیر سورۂ بقرہ ہے، جو ''تفسیر رفیعی'' کے نام سے شائع ہوئی ہے، اس کو ان کے ایک شاگرد سید نجف علی المعروف بفوج دار خاں نے دوران سبق قلم بند کیا تھا اور شاہ رفیع الدین صاحب نے بھی اس کو ملاحظہ فرمایا تھا، اس تفسیر کو سید نجف علی کے فرزند میر سید عبدالرزاق نے ۱۲۷۲ھ میں مطبع نقش بندی سے طبع کرایا اور اس کے حاشیہ پر مولانا یعقوب چرخی کی تفسیر فارسی بھی شائع کرائی، میر سید عبدالرزاق کے بہ قول'' ان کے والد نے شاہ رفیع الدین سے تمام کلام اللہ کی تفسیر اسی طرح لکھی جس میں سورۂ بقرہ کا حصہ زیادہ مفصل اور مشرح تھا''، غالب گمان یہ ہے کہ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ قرآن جو مطبوع و متداول ہے، ان ہی سید نجف علی کا قلم بند کیا ہوا ہے اور اسی کا ایک حصہ تفسیر ہے، یہ تفسیر ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے، جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ عوام الناس ہی کو مدنظر رکھ کر یہ تفسیر املا کرائی گئی ہے، تاہم بعض بعض مقامات پر مفید اور اہم علمی بحثیں بھی آگئی ہیں، سطور ذیل میں اس کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

نمونہ تفسیر سورۂ بقرہ کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے، اس کے بارے میں شاہ رفیع الدین صاحب نے جمہور مفسرین کی طرح یہ ذکر کیا ہے کہ ان کا حقیقی علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، مگر اسی کے ساتھ انہوں نے بعض اقوال بھی نقل کیے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اور لوگ کچھ مناسبت سے کہتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کی صفتیں، جن کے سرے پر یہی حروف آئیں، جیسے الف انعام اللہ کا اور لام لطف اس کا اور میم ملک اس کا یا اللہ نے جبرئیلؑ کے ہاتھ محمد ﷺ پر قرآن بھیجا''۔(۲)

سورۂ بقرہ کے پہلے رکوع میں ایسے معاند کفار کا ذکر ہے، جن کو ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے، ارشاد باری ہے:

(۱) مولانا عبیداللہ سندھی، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۱۲۱، کتاب خانہ پنجاب، لاہور ۱۹۴۲ء

(۲) تفسیر رفیعی، ص ۵۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (بقرہ:۶)	بیشک جولوگ کافر ہوچکے برابر ہے ان کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے، وہ ایمان نہ لائیں گے۔

مفسرین نے لکھا کہ اس سے مراد ابوجہل اور ابولہب جیسے سرکش اور ہٹ دھرم کفار ہیں، جن کو ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے، مگر شاہ رفیع الدین صاحب نے اس کی بہت لطیف تفسیر کی ہے، ان کا کہنا ہے کہ ہر حال میں کفار کو ڈرانا اور سمجھانا چاہیے، یہ کفار جن کا ذکر اس آیت میں ہے، ان کا علم اللہ کو ہے، بندوں کو نہیں، چنانچہ وہ فائدہ کے تحت لکھتے ہیں:

''یعنی جو خدا کے علم میں کافر مقرر ہوئے، ان کو کسی طرح سمجھاؤ ایمان نہیں لاتے''۔

اس کے بعد وہ انذار کے فوائد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کے سمجھانے میں فائدہ یہ ہے کہ اول ان کا کفر ثابت ہوجائے کہ بن حکم کے نافرمانی کیوں کر ہوتی اور دوسرے کارخانہ جزا والوں کو حکمت معلوم ہوجاوے کہ ان کو یہ عذاب کیا چاہیے، تیسرے یہ کہ مسلمانوں کو ڈر ہو کہ حکم نہ ماننے سے یہ خرابی ہوتی ہے''۔(۱)

اسی طرح اس کے بعد کی آیت:

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰٓی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ۔ (بقرہ:۲)	مہر کردی اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

کی تفسیر کرتے ہوئے انہوں نے اس اشکال کو موضوع بحث بنایا ہے کہ جب قلوب کو مہر بند کر دیا گیا تو گویا اس سے قبول حق کی استعداد سلب کرلی گئی، پھر اس پر عذاب کے کیا معنی؟ شاہ رفیع الدین صاحب نے اس اشکال کو خود پیش کیا ہے اور اس کو نہایت خوبصورتی سے حل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''کہتے ہیں، جو خدا نے آپ ہی مہر کردی اور پردے ڈال دیے، پھر

(۱) تفسیر رفیعی، ص ۶۔

کفر پر کیوں عذاب کرتا ہے، جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے سرے سے مہر نہیں رکھی تھی، بلکہ جب خدا کے احکام سن کر نہ مانا اور کدزیادہ کی، پیچھے کر مہر رکھ دی، یہ مہر بھی ثمرہ کفر کا ہے، ایسی مہر عذر واسطے دفع عذاب کے نہیں ہوتی''۔(۱)

نظم کلام کا اہتمام تفسیر رفیعی کا ایک خاص امتیاز یہ ہے کہ اس میں نظم کلام کی مکمل رعایت کی گئی ہے اور اس کے لحاظ سے جا بجا لطیف نکتے بھی تحریر کیے ہیں، مثلاً ابتدائے سورہ میں انسانوں کے تین گروہ مومن، کافر اور منافق کے ذکر کے بعد سارے انسانوں کو عبادت رب کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے بعد انعامات خداوندی کا ذکر ہے، شاہ رفیع الدین صاحب اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کہتے ہیں کہ ایک دوسرے کا جو حکم مانتا ہے تین واسطے ہوتا ہے یا واسطے پہلے احسان کے یا واسطے سکونت کے یا واسطے معاش کے، اسی کے عمل میں حق تعالیٰ نے بتلا دیا کہ یہ تینوں کام تم کو مجھ ہی سے ہیں، اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ پہلی بات ہے، اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا دوسری بات ہے، وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً تیسری بات ہے''۔(۲)

شاہ رفیع الدین صاحب نے سورۂ بقرہ کے مضامین کی تقسیم بھی کی ہے اور اصل موضوع دعوت توحید کو قرار دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

''جن لوگوں پر خطاب تھا تین طرح کے تھے، ظاہر اور باطن سے ماننے والے وہ مومن تھے اور ظاہر و باطن سے انکار کرنے والے وہ کافر تھے اور ظاہری اقرار کرنے والے اور باطن سے انکار کرنے والے وہ منافق تھے، جب تینوں کا احوال بیان کیا سب لوگوں کو حکم کیا کہ میری بندگی کرو اور میرے کلام میں شک نہ لاؤ اور جو یہ نہ کرو گے تو آگ کا عذاب دوں گا اور جو مانو گے تو بہشت دوں گا''۔(۳)

شاہ رفیع الدین صاحب نے سورہ بقرہ کے ابتدائی چار رکوع کا نظم یوں بیان کرنے کے بعد آیت یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ (بقرہ:۴۰) کی تفسیر

(۱) تفسیر رفیعی، ص ۶ (۲) ایضاً، ص ۱۰ (۳) ایضاً۔

میں لکھا ہے:

"یہاں سے تا اِذِ ابْتَلٰی اِبْرَاهِیْمَ رَبُّهٗ (بقرہ: ۱۲۴) بحث یہود سے ہے، جب نبی صاحب مدینہ میں آئے ہجرت کر کر وہاں یہود بہت تھے، کئی ان میں سے ایمان لائے جیسے عبداللہ بن سلام اور ان کے رفیق اور باقیوں نے کفر اختیار کیا، کہتے تھے کہ تم پیغمبر ہو عربوں کے کہ جاہل ہیں اور ہم سب کچھ جانتے ہیں، ہم کو پیغمبر نہیں چاہیے، حق تعالیٰ نے ان پر اپنی نعمتیں یاد دلائیں اور ان کی سرکشی اور گمراہی بیان کی اور کہا کہ ان برائیوں پر تم لائق مہربانی کے نہیں اگر پیغمبر کا کہنا مانو گے نعمتیں اپنی تم پر برقرار رکھوں گا نہیں تو دنیا میں ذلیل اور آخرت میں عذاب کروں گا"۔(۱)

شاہ رفیع الدین صاحب کا کہنا ہے کہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۲۴ سے آیت ۱۶۲ تک حضرت ابراہیمؑ کی بشارت اور دعا کا ذکر ہے جس کا ثمرہ آنحضرت ﷺ کا وجود گرامی ہے۔(۲)

اس کے بعد آیت وَ اِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (بقرہ: ۱۶۳) سے وحدانیت کا موضوع شروع ہوتا ہے اور یہ مضمون آیت ۱۶۷ تک چلا گیا ہے، اس کے بعد آیت یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ...... (بقرہ: ۱۶۸) سے توحید فی الطاعۃ کا مضمون بیان ہوا ہے، شاہ رفیع الدین صاحب لکھتے ہیں:

"یہاں سے بیان ہے کہ جس طرح عبادت میں خدا کو لاشریک سمجھے، حرام اور حلال کے بھی حکم کرنے میں اسی کو لاشریک سمجھے"۔(۳)

اس کے بعد سورہ کے اختتام تک مختلف النوع احکام مثلاً قتال، روزہ، حج، انفاق، نکاح و طلاق، نماز، وصیت وغیرہ کے احکام مذکور ہیں، شاہ رفیع الدین صاحب کا کہنا ہے کہ انفاق کے بیان میں یوم آخرت کا ذکر بایں طور آیا ہے کہ اس دن نہ کوئی دوستی ہوگی اور نہ سفارش، چنانچہ اسی مناسبت سے اس موقع پر آیت الکرسی رکھی گئی کیوں کہ اس میں بھی یہی مضمون ہے، وہ لکھتے ہیں:

(۱) تفسیر رفیعی، ص ۲۱ (۲) ایضاً ص ۶۶ (۳) ایضاً ص ۹۱۔

"یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّأْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَالْکَافِرُوْنَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ۔ (بقرہ: ۲۵۴) یہاں سے حکم خرچ کرنے کا بیچ راہ خدا کے شروع ہوا ہے......... لیکن جب اس میں بیان ہوا وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ آیت الکرسی کو کہ اس میں بھی بیان ہے مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۔(۱)

شاہ رفیع الدین صاحب کا کہنا ہے کہ آیت الکرسی کے بعد مذکور تین واقعات اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ کی تفسیر وشرح ہیں، اس کے بعد اصل مضمون انفاق پھر شروع ہو گیا ہے، لکھتے ہیں کہ:

"اور آیت الکرسی میں ہے اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ تو حیات بخشنے کی کیفیت تین قصوں میں بیان کی ہے پھر شروع کیا احکام خرچ کرنے کا"۔(۲)

ناسخ ومنسوخ کی بحث شاہ رفیع الدین صاحب نے ناسخ ومنسوخ کے موضوع پر بھی عمدہ بحث کی ہے، سورہ بقرہ کی آیت:

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِیَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَی الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْمَا فَعَلْنَ فِیْ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ

(بقرہ: ۲۴۰)

اور جو لوگ تم میں سے مرجاویں اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو وہ وصیت کر دیں اپنی عورتوں کے واسطے خرچ دینا ایک برس تک بغیر نکالنے کے گھر سے پھر اگر وہ عورتیں آپ نکل جاویں تو کچھ گناہ نہیں تم پر اس میں کریں وہ عورتیں اپنے حق میں بھلی بات اور اللہ زبردست ہے حکمت والا۔

کے بارے میں مفسرین متفق اللفظ ہیں کہ یہ حکم اول تھا اور جب عورت کی عدت چار مہینے دس دن ٹھہرادی گئی جس کا ذکر سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۴ میں ہے اور آیت میراث بھی نازل ہوئی تو اس وقت سے یہ حکم منسوخ ہو گیا، شاہ رفیع الدین صاحب نے دونوں حکموں کو جدا جدا کر کے

(۱) تفسیر رفیعی ص ۱۶۵ (۲) ایضاً۔

اس کے نسخ سے انکار کیا ہے اور نہایت دل چسپ توجیہ وتاویل کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''اس آیت میں حکم ہوا کہ جن عورتوں کے خاوند مرجاویں اپنے وارثوں کو وصیت کردیویں کہ اس عورت کو برس دن تلک گھر سے نکالیو مت جو اپنی خوشی سے چلی جائے مختار ہے اور پہلی آیت میں حکم ہوا تھا کہ چار مہینے دس دن تلک انتظار کریں بعد اس کے دوسری نکاح کو مختار ہے، بعض لوگوں نے سمجھا کہ پہلی آیت پیچھے اتری ہے اور ناسخ ہے اور دوسری آیت پہلے اتری ہے اور منسوخ ہوگئی کہ اس کا حکم عدت برس دن تلک تھا اور یہ بات بے تحقیق ہے، اس میں حکم عدت کا عورتوں کو نہیں ہے بلکہ حکم خاوندوں کو ہے کہ وصیت کریں گھر سے نہ نکال دینے کا نہ عورتوں کو نکاح سے منع کرنے کا، بلکہ فرمادیا ہے کہ اگر واسطے نکاح کے چلی جاویں مختار ہیں''۔(۱)

اس آیت میں دو حکم مذکور ہیں، ایک یہ کہ عورتیں ایک سال کی مدت تک اپنے متوفی شوہروں کے گھروں سے نہ نکالی جائیں، دوسرے یہ کہ اس مدت میں ان کو نان ونفقہ بھی متوفی کے ورثہ دیتے رہیں، شاہ رفیع الدین صاحب کا کہنا ہے کہ آیت میراث کے نزول نے یقیناً عورتوں کو مستحق وراثت بنادیا ہے، جس کے بعد بہ ظاہر حاجت وصیت باقی نہیں رہتی مگر اس کے باوجود وہ آیت کے حکم کی منسوخی کے قائل نہیں ہیں اور اس کی تاویل یوں کرتے ہیں:

''بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے، ساتھ اس حدیث کے کہ لا وصیة لوارث یہ بات بھی بے تحقیق ہے، اس واسطے کہ وصیت جو وارث کو نہیں وصیت تملیک ہے، یہ کہ اس کا حق کم زیادہ نہ کرڈالیں یہ وصیت تملیک کی نہیں ہے بلکہ اباحت عاریت کی ہے اگر چاہے رہنا اور وصیت کرنا وارث کو واسطے تاکید ادائی حق کے یا واسطے ادائی قرض کے منع نہیں ہے''۔(۲)

ان چند مثالوں سے بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاہ رفیع الدین صاحب کا تفسیری ذوق اپنے والد ماجد اور برادر بزرگ کے مانند تھا، ضرورت اس بات کی ہے کہ تفسیر رفیعی کو از سر نو مرتب کرکے شائع کیا جائے، کیوں کہ ایک تو اس کی زبان نہایت قدیم ہے جس سے قاری کو الجھن پیش آتی ہے، دوسرے اس کے نسخے محدود کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

(۱) تفسیر رفیعی، ص ۱۴۹ (۲) ایضاً۔

شاہ عبدالقادر دہلوی (المتوفی ۱۲۳۰ھ)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے تیسرے فرزند شاہ عبدالقادر اپنے مقبول و مستند ترجمہ قرآن کی بہ دولت محتاج تعارف نہیں ہیں، اردو زبان کا سب سے پہلا ترجمہ قرآن مجید ان ہی نے کیا اور آج بھی باوجودیکہ اس ترجمہ پر دو صدی کا عرصہ گزر چکا ہے اور اس عرصے میں متعدد ترجمے ہو چکے ہیں مگر اس کے بعد بھی شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کی اہمیت و افادیت پر کوئی حرف نہیں آیا ہے، بلکہ تمام مترجمین و مفسرین بجا طور پر اسی کو ماخذ اول کی حیثیت دیتے ہیں۔

شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ قرآن کے ساتھ ان کے تفسیری فوائد ''موضح القرآن'' کے نام سے شائع ہوئے ہیں، یہ فوائد بھی ترجمہ قرآن کے مانند اہل علم کے درمیان مقبول و متداول ہیں، پہلے شاہ صاحب کے مختصراً حالات زندگی ملاحظہ فرمائیں پھر موضح القرآن کے چند اقتباسات نقل کیے جائیں گے جس سے ان کی نکتہ رسی و دقیقہ سنجی کا اندازہ ہوگا۔

مختصر حالات زندگی شاہ عبدالقادر ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں والد ماجد کی وفات ہوئی، چنانچہ بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز کے سایۂ عاطفت میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی، ان کے ماموں اور والد بزرگوار کے صحبت یافتہ بزرگ عالم شاہ محمد عاشق پھلتی نے ان کے بڑے بھائیوں کی طرح ان کو بھی آخری درجہ کی کتابیں پڑھائیں، پھر شیخ عبدالعدل دہلوی سے رشتہ سلوک قائم کیا، طبعاً خاموش مزاج اور گوشہ نشین تھے، اس لیے مدۃ العمر خاموشی و یکسوئی کے ساتھ محلہ اکبر آباد کی مسجد کے ایک حجرہ میں معتکف رہے، کبھی کبھی اعزہ سے ملاقات کے لیے گھر بھی جایا کرتے تھے مگر زیادہ وقت مسجد کے حجرہ ہی میں بسر کرتے تھے، اسی کیفیت میں بارہ سال کی محنت شاقہ کے بعد ۱۲۰۵ھ میں اپنا ترجمہ قرآن مکمل کیا۔

شاہ عبدالقادر نے شادی کی مگر ان کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، صرف ایک بیٹی تھیں جو

منجھلے بھائی شاہ رفیع الدین کے بیٹے سے منسوب تھیں، ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء میں اپنے دونوں بڑے بھائیوں کی حیات ہی میں وفات پائی اور والد ماجد کے پہلو میں دفن ہوئے۔(۱)

ترجمہ وتفسیر موضح القرآن شاہ عبدالقادر کے ترجمہ قرآن کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ پچھلی دو صدیوں کے ہر دور کے ارباب نظر علما و مفسرین نے اس کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور اس کو ایک الہامی کارنامہ قرار دیا ہے، اسی طرح ہر دور کے علما نے موضح القرآن کو بھی مصدر و ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے، بعض علمی حلقوں میں موضح القرآن کی تعلیم سبقاً وسنداً بھی ہوتی تھی (۲)، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ نے اپنا ترجمہ قرآن شاہ عبدالقادر صاحب ہی کے ترجمہ قرآن وفوائد کی تسہیل وتیسیر کی غرض سے مرتب کیا ہے، جس کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ مملکت سعودی عربیہ نے اس کے لاکھوں نسخے چھاپ کر مفت تقسیم کیے، شیخ الہند کے شاگرد مولانا شبیر عثمانیؒ نے اپنے تفسیری حواشی میں موضح القرآن ہی کو اسوہ و رہنما بنایا ہے، اسی طرح یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ شاہ صاحب کا ترجمہ قرآن مرورِ ایام کے سبب سے مختلف مطابع میں چھپتا رہا اور اس کے بعض نسخوں میں تغیر وتبدل بھی ہوگیا، مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی اہل علم کی جانب سے ستائش کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ قرآن وفوائد کو ازسرنو ایڈٹ کر کے ایک مستند نسخہ تیار کیا مگر شاید اس کے چند ہی اجزا چھپ سکے، بہرحال مولانا اخلاق حسین قاسمی کی تحقیق کے مطابق تاج کمپنی لاہور کا مطبوعہ نسخہ دیگر نسخوں کے مقابلہ میں زیادہ مستند اور بہتر ہے، اس لیے موضح القرآن کے اقتباسات اسی سے لیے گئے ہیں۔

موضح القرآن کے چند نمونے سورہ بقرہ کی آیت:

بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّ اَحَاطَتْ	کیوں نہیں جس نے کمایا گناہ اور گھیر لیا اس
بِہٖ خَطِیْٓئَتُہٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ	کو اس کے گناہ نے سو وہی ہیں لوگ دوزخ
النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ (بقرۃ:۸۱)	کے، وہ اسی میں رہ پڑے۔

(۱) شاہ صاحب کے حالات کے لیے دیکھیے مولانا محمد رحیم بخش دہلوی، حیات ولی اور حکیم محمود احمد برکاتی، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان (۲) مولانا اخلاق حسین قاسمی، محاسن موضح القرآن، ادارہ رحمت عالم دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ۲۸۔

میں اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهٗ کی تشریح کرتے ہوئے شاہ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں، گھیر لیا گناہ نے یعنی گناہ کرتا ہے اور شرمندہ نہیں ہوتا''۔(۱)

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (آل عمران:۹۲)

ہرگز نہ پہنچو گے نیکی کی حد کو جب تک نہ خرچ کرو کچھ ایک جس سے محبت رکھتے ہو اور جو چیز خرچ کرو گے سو اللہ کو معلوم ہے۔

میں بہ ظاہر عمومی خطاب ہے مگر یہ آیت ذکر یہود کے سیاق میں آئی ہے، چنانچہ شاہ عبد القادر صاحب نے اس کی تشریح یوں کی ہے:

''یعنی جس چیز سے دل بہت لگا ہو اس کا خرچ کرنا بڑا درجہ ہے اور ثواب ہر چیز میں ہے، شاید یہود کے ذکر میں یہ آیت اس واسطے فرمائی کہ ان کو اپنی ریاست بہت عزیز تھی جس کے تھامنے کو نبی کے تابع نہ ہوتے تھے تو جب وہی نہ چھوڑیں اللہ کی راہ میں درجہ ایمان نہ پاویں''۔(۲)

سورۂ آل عمران کی آیت:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران:۱۰۴)

اور چاہیے کہ رہیں تم میں ایک جماعت بلاتے نیک کام پر اور حکم کرتے پسند بات کو اور منع کرتے ناپسند کو اور وہی پہنچے مراد کو۔

میں شاہ عبدالقادر صاحب فریضۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا دائرہ صرف مسلمانوں کی دینی اصلاح تک محدود نہیں سمجھتے بلکہ وہ اس کو نوع انسانی کی رشد و اصلاح کا منصب تصور کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں فرض ہے ایک جماعت قائم رہے جہاد کرنے کو اور دین کا تقید رکھنے کو تا خلاف دین کوئی نہ کرے اور جو اس کام پر قائم ہوں وہی کامیاب ہیں اور یہ کوئی کسی سے تعرض نہ کرے، موسیٰ بدین خود

(۱) موضح القرآن، ص ۱۸ (۲) ایضاً ص ۹۹۔

عیسیٰ بدین خود، یہ راہ مسلمانی کی نہیں"۔(۱)

پھر اس کے آگے آیت کا حصہ:

وَ مَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ اور اللہ ظلم نہیں چاہتا جہاں والوں پر۔

(آل عمران:۱۰۸)

کے تحت اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"یعنی جہاد اور امر معروف کا جو حکم فرمایا یہ ظلم نہیں خلق پر ان کی تربیت ہے"۔(۲)

سورۂ آل عمران میں غزوۂ اُحد کی تفصیلات مذکور ہیں اور اس کے بعد مسلمانوں کو سود سے اجتناب کی تعلیم دی گئی ہے، شاہ عبدالقادر صاحب نے ان دونوں کے درمیان نہایت لطیف مناسبت بتائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"شاید سود کا ذکر یہاں اس واسطے فرمایا کہ اوپر مذکور ہوا جہاد میں نامردی کا اور سود کھانے سے نامردی آتی ہے، دو سبب سے، ایک یہ کہ مال حرام کھانے سے توفیق طاعت کم ہوتی ہے اور بڑی طاعت جہاد ہے، دوسرے یہ کہ سود لینا کمال بخل ہے، چاہیے کہ اپنا مال جتنا دیا تھا لے لیا، بیچ میں کسی کا کام نکلا، یہ بھی مفت نہ چھوڑے، اس کا جدا بدلا چاہے تو جس کو مال پر اتنا بخل ہو وہ کب جان دیا چاہے"۔(۳)

سورۂ رعد کی آیت:

یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ (رعد:۳۹) مٹاتا ہے اللہ جو چاہے اور رکھتا ہے اور اسی کے پاس ہے اصل کتاب۔

کی تشریح کرتے ہوئے شاہ صاحب نے تقدیر کی بڑی عمدہ تفسیر کی ہے، لکھتے ہیں:

"دنیا میں ہر چیز اسباب سے ہے، بعضے اسباب ظاہر ہیں، بعضے چھپے ہیں، اسباب کی تاثیر کا ایک اندازہ ہے، جب اللہ چاہے اس کی تاثیر اندازے سے

(۱) موضح القرآن، ص ۱۰۱ (۲) ایضاً ص ۱۰۲ (۳) ایضاً ص ۱۰۷۔

کم زیادہ کردے، جب چاہے ویسی ہی رکھے، کبھی کنکر سے مرتا ہے اور گولی سے بچتا ہے اور ایک اندازہ ہر چیز کا اللہ کے علم میں ہے، وہ ہرگز نہیں بدلتا، اندازے کو تقدیر کہتے ہیں، یہ دو تقدیریں ہیں ایک بدلتی ہے اور ایک نہیں بدلتی''۔(۱)

بعض آیتوں کی تشریح میں شاہ عبدالقادر صاحب کی غیر معمولی ذہانت کا پتہ چلتا ہے، مثلاً سورۂ الحجر کی آیت:

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ (حجر:۴۳و۴۴)

اور دوزخ پر وعدہ ہے ان سب کا اس کے سات دروازے ہیں، ہر دروازہ کو ان میں ایک فرقہ بٹ رہا ہے۔

میں ذکر سات دروازوں کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جیسے بہشت کے آٹھ دروازے ہیں نیک عمل والوں پر بانٹے ہوئے، ویسے دوزخ کے سات دروازے ہیں بدعمل والوں پر بانٹے ہوئے، شاید بہشت کا ایک دروازہ زیادہ وہ ہے کہ بعضے وگ نرے فضل سے جاویں گے بغیر عمل، باقی عمل میں دروازے برابر ہیں''۔(۲)

مذکورہ بالا چند مثالوں سے تفسیر موضح القرآن کا اسلوب بیان اور اس کے طریق استدلالوں کا ایک سرسری اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔



(۱) موضح القرآن، ص ۴۱۹ (۲) ایضاً ص ۴۳۵۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی (المتوفی ۱۲۲۵ھ)

مختصر حالات زندگی

قاضی صاحب ۱۱۴۳ھ مطابق ۳۱-۱۷۳۰ء میں بہ مقام پانی پت پیدا ہوئے، ان کا شجرۂ نسب بارہ واسطوں سے شیخ جلال الدین پانی پتی (م ۸۵۲ھ) سے ملتا ہے، جن کے خاندان کو خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ سے نسبی تعلق کا شرف حاصل ہے۔

قاضی صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی، سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور سولہ برس کی عمر میں مروجہ علوم وفنون کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد حدیث وفقہ میں پختگی اور کمال حاصل کرنے کے لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی خدمت میں حاضری دی، باطنی اصلاح وتربیت کے لیے پہلے شیخ محمد عابد سنامی کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے، ان کے انتقال کے بعد مشہور بزرگ مرزا مظہر جان جاناں کی طرف رجوع ہوئے اور ان کے ایک ممتاز خلیفہ کی حیثیت سے نہایت مشہور ہوئے، مرزا صاحب کو بھی قاضی صاحب سے بڑی محبت تھی، انہیں ''علم الہدیٰ'' کا لقب بھی بخشا تھا، شاہ ولی اللہ صاحب کے خلف اکبر شاہ عبدالعزیز صاحب بھی قاضی صاحب کو ان کے علم وفضل کی بنا پر ''بیہقی وقت'' کہا کرتے تھے، قاضی صاحب اپنے وطن میں رہ کر مدۃ العمر افتاء وقضا اور تصنیف وتالیف کی خدمت میں مشغول رہے، یکم رجب ۱۲۲۵ھ کو وفات پائی، ان کے تذکرہ نگار متفق اللفظ ہیں کہ وہ نہایت عابد وزاہد، تہجد گزار اور تلاوت قرآن کے شیدائی تھے۔(۱)

تصنیفات

قاضی صاحب نے تیس سے زائد کتب ورسائل تصنیف کیے(۲) مگر ان کی صرف دو کتابیں ایک مالا بدمنہ بہ زبان فارسی اور دوسری تفسیر مظہری بہ زبان عربی، مطبوع ومتداول ہیں،

(۱) قاضی صاحب کے حالات کے لیے دیکھیے، نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۱۳، تذکرہ علمائے ہند، ص ۳۸۔ اور اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۶، ص ۱۰۳۲ تا ۱۰۳۴ (۲) تذکرہ علمائے ہند، ص ۳۸۔

مالا بدمنہ فقہ حنفی پر ایک مختصر اور جامع کتاب ہے جو عرصہ دراز تک مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل رہی، قاضی صاحب کے تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ انہوں نے فقہ میں ایک مبسوط کتاب بھی تصنیف کی تھی جس میں ائمۂ اربعہ کے مختارات کو مع ادلہ محاکمہ کے بعد یکجا کیا تھا، اسی موضوع پر ''الاخذ بالاقوی'' کے نام سے ان کے ایک رسالہ کی صراحت بھی ملتی ہے۔(۱)

تفسیر مظہری قاضی صاحب کی یہ تفسیر دس ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اس کو انہوں نے اپنے پیرو مرشد مرزا مظہر جان جاناں کے نام سے معنون کیا ہے، اس تفسیر کا اردو ترجمہ مولانا سید عبدالدائم جلالی نے کیا ہے، جس کو ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا ہے۔

تفسیر مظہری قاضی صاحب کی کثرت معلومات، وسعتِ علم، حدیث وفقہ پر گہری نظر اور ان کے معتدل متصوفانہ ذوق کا ثبوت ہے، سطور ذیل میں اس کے ابتدائی حصے کی روشنی میں تفسیر کی چند نمایاں خصوصیات پیش کی جاتی ہیں۔

مسلکی رواداری تفسیر مظہری کا اہم اور نمایاں وصف مصنف کی وسعت نظر اور مسلکی عدم تعصب ہے، اس میں قاضی صاحب نے احناف کے نقطۂ نظر کی تائید وتصویب بہ دلائل کی ہے مگر جا بجا اس سے اختلاف بھی کیا ہے، عام خیال ہے کہ وہ حنفی تھے، اس لیے انہوں نے تفسیر مظہری میں محض احناف کے نقطۂ نظر کو مدلل طور پر پیش کیا ہے(۲) لیکن تفسیر کے غائر مطالعہ سے یہ بات خلاف واقعہ معلوم ہوتی ہے، ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے قاضی صاحب کے اعتدال وتوازن کا اندازہ ہوگا:

محصور کی قربانی کا حکم مسافر حج اگر کسی مقام پر محصور ہو جائے تو وہ اپنی قربانی کے جانور کو کس جگہ ذبح کرے یا کرائے، اس بارے میں فقہا کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس کی قربانی حدود حرم میں ہونی چاہیے، جب کہ جمہور یہ کہتے ہیں کہ وہ اسی جگہ ذبح کر دے جہاں وہ محصور ہوا ہے، خواہ وہ مقام حدود حرم کے اندر واقع ہو یا اس سے باہر ہو، اس مسئلہ میں امام بخاریؒ نے نہایت متوازن موقف اختیار کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ محصور اگر اپنی قربانی کا جانور حدود حرم تک بھیجنے پر قادر ہو تو اس کے لیے ایسا کرنا واجب ہے، بہ صورت دیگر اس کے لیے

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۱۳ (۲) ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں، ص ۹۸-۱۰۱۔

اجازت ہے کہ وہ جائے احصار ہی میں قربانی کردے، قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اس مسئلہ میں امام بخاریؒ ہی کے موقف کی تائید وحمایت کی ہے، سورۂ بقرہ کی آیت:

وَلَا تَحْلِقُوا رُؤُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ (بقرہ:۱۹۶!) اور حجامت نہ کرواپنے سروں کی جب تک پہنچ نہ چکے قربانی اپنے ٹھکانے پر۔

کی تفسیر کرتے ہوئے وہ اس اختلاف کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"محلہ کی تفسیر میں فقہا کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ اس بات کے قائل ہیں کہ محلہ سے حدود حرم مراد ہے کیوں کہ قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر یہ صراحت موجود ہے کہ قربانی کا محل خانہ کعبہ ہی ہے (ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ حج:۳۳) نیز حرم کے علاوہ کسی اور مقام پر قربانی کا ثبوت نہیں ملتا ہے، اس لیے محصور کے لیے واجب ہے کہ وہ قربانی کے جانور کو حرم روانہ کرے اور ذبح کے دن کی تعیین کردے اور اسی لحاظ سے احرام کھولے......

جمہور فقہا کا کہنا ہے کہ محلہ سے مراد وہی مقام ہے جہاں حالت محصوری پیش آئی ہے خواہ وہ حدود حرم کے اندر ہو یا اس سے خارج ہو، جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر میدان حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ کا قربانی کرنا ثابت ہے، حالاں کہ یہ جگہ حدود حرم سے باہر ہے، اس مسئلہ میں بہتر قول امام بخاریؒ کا ہے جس کو انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت پر تعلیق کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ محصور کو جائے محصوری پر قربانی کرنے کی اجازت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ جانور کو حدود حرم تک بھیجنے پر قادر نہ ہو اور اگر اس کو اس کی قدرت ہو تو اس کے لیے بھیجنا واجب ہے"۔(۱)

غرض قاضی صاحب نے اس آیت کی تفسیر امام بخاریؒ ہی کے موقف کے مطابق کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

فحينئذٍ معنى قوله تعالىٰ وَلَا تَحْلِقُوا اس آیت کا مطلب قید استطاعت کے ساتھ

(۱) تفسیر مظہری، ج۱، ص۱۷۹، مطبع غریب۔

رُؤُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ان استطعتم ذلک فهو عام خص منه البعض بفعل النبی ﷺ الثابتة بالاحادیث المشهورة ۔(۱)

مشروط قرار پائے گا، اس لیے اس حکم عام سے وہ واقعات بربنائے تخصیص مستثنیٰ سمجھے جائیں گے جن میں یہ صراحت موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حدود حرم سے باہر حدیبیہ میں قربانی کی ہے اور وہ مشہور حدیثوں سے ثابت ہیں۔

تعلیم قران کو مہر بنانا فقہائے احناف اور شوافع اس بات میں مختلف الرائے ہیں کہ مہر نکاح میں قرآن مجید کی تعلیم کو رکھا جا سکتا ہے یا نہیں، شوافع اس کے جواز کے قائل ہیں اوران کی دلیل وہ مشہور حدیث ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ایک خاتون نے اپنے آپ کو بہ غرض نکاح پیش کیا مگر حضور ﷺ خاموش رہے، ایک صحابی جو اس وقت مجلس میں موجود تھے، انہوں نے نکاح کی خواہش ظاہر کی، دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ ان کے پاس مہر کی ادائیگی کے لیے کوئی چیز نہیں ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے تعلیم قرآن مجید کو مہر قرار دے کر ان کا نکاح کر دیا۔

فقہائے احناف اس واقعہ کو آنحضرت ﷺ کے خصائص میں شمار کرتے ہیں، اس لیے وہ اس پر قیاس کو درست نہیں قرار دیتے، علامہ ابن جوزی نے اس کی ایک توجیہ یہ بھی کی ہے کہ یہ اسلام کے دور غربت کا واقعہ ہے جس کو نظیر نہیں بنایا جا سکتا، قاضی صاحب نے فقہائے احناف کی ان دونوں توجیہات سے عدم اتفاق ظاہر کیا ہے اور صاف لفظوں میں یہ لکھا ہے کہ:

قلت هذا كانه ادعاء نسخ والنسخ لا يثبت بمجرد الاحتمال وكذا كونه من الخصائص ۔(۲)

میرا کہنا ہے کہ ابن جوزی کی توجیہ کے مطابق دعوی نسخ لازم آتا ہے اور محض احتمال کی بنیاد پر نہ تو نسخ کو ثابت کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی خصائص کو۔

احکام حج حج کے بعض احکام کے سلسلہ میں بھی قاضی صاحب نے فقہائے احناف سے اختلاف کیا ہے، مثلاً ایام تشریق کے آخری دن زوال سے پہلے تک احناف کے نزدیک رمی

(۱) تفسیر مظہری، ج ۱ ص ۱۷۹ (۲) ایضاً، ج ۲ ص ۵۶۹، تفسیر سورۂ نساء۔

کی جاسکتی ہے مگر اس مسئلہ میں قاضی صاحب کا کہنا ہے کہ:

''مجھ کو اس قول کی کوئی دلیل دست یاب نہیں ہوئی''۔(۱)

فقہائے احناف نے ابن ہمام کی ایک روایت اس کی تائید میں پیش کی ہے، مگر قاضی صاحب نے اس کے سلسلہ سند پر کلام کیا ہے۔

اسی طرح جمرات کی رمی میں ترتیب کو جمہور واجب اور امام ابو حنیفہؒ سنت قرار دیتے ہیں، جمہور کی دلیل یہ ہے کہ تینوں جمرات کی رمی ایک عمل ہے، اس لیے ان میں ترتیب واجب ہے، امام ابو حنیفہؒ کا کہنا ہے کہ ہر جمرہ کی رمی ایک علاحدہ عمل ہے، اس لیے ترتیب کو وجوب کا درجہ حاصل نہیں ہے، قاضی صاحب نے اس مسئلہ میں جمہور کی متابعت کی ہے اور امام صاحب کے موقف کو کم زور ثابت کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ ازروئے قیاس بھی امام صاحب کا موقف درست نہیں ہے، جمرات کے عمل میں ترتیب کے وجوب کی دلیل تو یہی ہے کہ اس کے اختلال سے دم لازم آتا ہے جیسے رمی، حلق اور ذبح علاحدہ اعمال ہیں، مگر ان کے درمیان ترتیب کے فوت ہونے سے دم واجب ہوتا ہے، امام صاحب نے ان دونوں صورتوں میں جو تفریق کی ہے اس کو سمجھنے سے میں قاصر ہوں''۔(۲)

خیار بیع کا اثبات

سورۂ نساء کی آیت:

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۔ (نساء:۲۹)	اے ایمان والو! نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں ناحق مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے۔

کو مستدل قرار دے کر فقہائے احناف و مالکیہ یہ کہتے ہیں کہ بیع مکمل ہو جانے کے بعد بائع و مشتری کو خیار بیع حاصل نہیں رہتا، اس کے برعکس فقہائے شوافع و حنابلہ بعض حدیثوں سے استدلال کرتے ہوئے اس کے جواز کے قائل ہیں، فقہائے احناف اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ کتاب اللہ کے مقابلہ میں ان روایتوں سے صرفِ نظر کیا جائے گا، قاضی صاحب نے احناف

(۱) تفسیر مظہری، ج ۱، ص ۲۴۴ (۲) ایضاً۔

کے اس موقف سے اختلاف کیا ہے اور فقہائے شوافع وحنابلہ کی تائید کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

قلت والصحیح عندی ان الآیة تدل علی جواز الاکل و تمام البیع قبل الافتراق من المجلس لکن لا یدل علی نفی ولایة الفسخ عنهما فالاولی ان یقال بثبوت خیار المجلس للمتعاقدین کما اثبت ابو حنیفه خیار الرؤیة وخیار العیب بعد تمام البیع کیلا یلزم ترک العمل بالحدیث الصحیح۔(۱)

میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت افتراق مجلس سے قبل بیع مکمل ہو جانے اور مبیع کو استعمال کرنے کی یقیناً دلیل ہے لیکن متعاقدین کے حق فسخ کی نفی اس سے ثابت نہیں ہوتی ہے، اس لیے بہتر بات یہ ہے کہ خیار مجلس کو تسلیم کیا جائے، جب امام ابوحنیفہؒ بیع تام ہو جانے کے بعد خیارِ رویت اور خیارِ عیب کو تسلیم کرتے ہیں تو خیار مجلس کو ماننے میں کیا حرج ہے تاکہ حدیث صحیح کو چھوڑ نالازم نہ آئے۔

تیمم کا ایک مسئلہ سورۂ نساء میں تیمم کی ایک آیت وارد ہے جس کی نہایت مفصل تفسیر قاضی صاحب نے کی ہے، اس ضمن میں اس مسئلہ میں کہ اگر کسی شخص کے بعض اعضا صحیح وسالم ہوں اور بعض زخمی ہوں تو کیا زخمی اعضا پر تیمم درست ہے، انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کے بالمقابل امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے موقف کو پسندیدہ قرار دیا ہے، امام ابوحنیفہؒ اسی صورت میں تیمم کی اجازت دیتے ہیں جب کہ اس کے بیشتر اعضا زخمی ہوں مگر امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا یہ فتوی ہے کہ صحیح اعضا کو دھل لیا جائے اور زخمی عضو پر تیمم کر لیا جائے، قاضی صاحب اس فتوی کے متعلق لکھتے ہیں:

هو المختار عندی للفتوی۔(۲)

میرے نزدیک یہی فتوی زیادہ بہتر ہے۔

اس کی مزید مثالیں بھی ہیں مگر طوالت کے خوف سے ہم نے چند ہی مثالوں پر اکتفا کیا ہے، ان سے بھی ہمارا مدعا پوری طرح واضح ہو جاتا ہے، اس بنا پر یہ کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ اس میں احناف کے مسلک کی مدلل تائید کی گئی ہے بلکہ دراصل قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بڑی

(۱) تفسیر مظہری، ج ۲، ص ۵۸۳ (۲) ایضاً، ص ۶۱۷۔

حد تک شاہ ولی اللہ کے مسلک اعتدال کی ترجمانی کی ہے۔

۲-تفسیری اقوال کی تحقیق وتنقید تفسیر مظہری میں قدیم مفسرین کے تفسیری اقوال بہ کثرت نقل کیے گئے ہیں، مگر مصنف نے ان اقوال کو محض یکجا نہیں کیا ہے بلکہ مختلف مقامات پر ان کو تحقیق وتنقید کی کسوٹی پر پرکھا بھی ہے اور یہ اس تفسیر کا دوسرا بڑا امتیاز ہے، صحابہ اور تابعین کے جو اقوال مرفوعاً ثابت ہیں، ان کو قاضی ثناء اللہ پانی پتی تفسیر ماثور کا درجہ دیتے ہیں، مگر جو روایتیں موقوف ہیں ان کو وہ تاویل کا درجہ دیتے ہیں، جس میں اختلاف کی گنجایش ہوتی ہے(۱)، ذیل میں چند مثالوں کے ذریعہ اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے:

سورۂ بقرہ کی ایک آیت ہے:

فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ (بقرہ:۱۸۷)

پھر ملو اپنی عورتوں سے اور طلب کرو اس کو جو لکھ دیا ہے اللہ نے تمہارے لیے۔

اس کی تفسیر میں قاضی صاحب نے اس متبادر مفہوم کی تائید کی ہے کہ نوشتہ الٰہی کو طلب کرنے کا مطلب طلب اولاد ہے، اس ضمن میں انہوں نے امام بغویؒ کے حوالہ سے حضرت معاذ بن جبلؓ کا یہ تفسیری قول نقل کیا ہے کہ ''مکتوب الٰہی کو تلاش کرنے کا مطلب شب قدر کو ڈھونڈنا ہے''(۲)، مگر قاضی صاحب نے اس سے عدم اتفاق ظاہر کرتے ہوئے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ:

قلت وھذا بعید من السیاق۔

میرا کہنا ہے کہ یہ تاویل سلسلہ کلام سے علاحدہ ہے۔

مناسک حج کے سلسلہ میں وارد آیت:

فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ:۲۰۰)

پھر جب پورے کر چکو اپنے حج کے کام تو یاد کرو اللہ کو جیسے تم یاد کرتے تھے اپنے باپ دادوں کو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔

کی تفسیر کرتے ہوئے قاضی صاحب نے اس کا شان نزول یہ بیان کیا ہے کہ اہل عرب مراسم حج سے

(۱) تفسیر مظہری، ج۱، ص۲۸ (۲) ایضاً، ص۱۶۵

فارغ ہونے کے بعد مجلسیں لگا کر اپنے آباواجداد کا فخریہ ذکر کرتے تھے، اس آیت میں اس کی ممانعت کی گئی ہے اور ان کو اس کے بجائے کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عطا کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کو اس طرح یاد کیا کرو جس طرح سے چھوٹے بچے اپنے باپوں کو یاد کرتے ہیں''، قاضی صاحب نے اس قول کو نقل کر کے اس پر یہ دل چسپ تبصرہ کیا ہے:

قلت وعلی ھذا کان ذکر الامھات اولی من الآباء (۱)

میرا کہنا ہے کہ اس قول کے مطابق باپوں کے بجائے ماؤں کا ذکر زیادہ موزوں ہوتا۔

سورۂ بقرہ کی آیت:

لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (بقرہ:۲۵۶)

زبردستی نہیں دین کے معاملہ میں۔

کی تفسیر میں قاضی صاحب نے تفسیر بغوی کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ حکم آیت قتال سے منسوخ ہے، مگر انہوں نے اس سے عدم اتفاق کیا ہے اور اس کی توجیہ یوں کی ہے:

قلت لا یتصور النسخ الا بعد التعارض ولا تعارض فان الامر بالقتال والجھاد لیس لاجل الاکراہ علی الدین بل لدفع الفساد من الارض فان الکفار یفسدون فی الارض ویصدون عباد اللہ عن الھدی والعبادۃ (۲)

میں کہتا ہوں کہ نسخ کا تصور ایسے موقع پر ممکن ہے جہاں تعارض ہو اور یہاں کوئی تعارض سرے سے نہیں ہے، قتال وجہاد کی مشروعیت قطعاً اکراہ دین کے لیے نہیں بلکہ زمین سے دفع فساد کے لیے ہے اور اس کا تعلق ان کافروں سے ہے جو زمین میں فتنہ گری کرتے اور اللہ کے بندوں کو ہدایت وعبادت سے روکتے ہیں۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بعض تفسیری اقوال کی ترجیح وتردید کے لیے قرآن مجید کے طرز واسلوب بیان کو بھی اسوہ ورہنما بنایا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت:

(۱) تفسیر مظہری، ج۱، ص۲۳۹ (۲) ایضاً، ص۲۸۰۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ (بقرہ:۱۸۶) — اور جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو سو میں تو قریب ہوں۔

کی تفسیر میں امام بغوی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''سائل مدینہ کا کوئی یہودی تھا''، قاضی صاحب نے قرآن مجید کے اسلوب بیان کو اس کے متضاد بتایا ہے، ان کے خیال میں سائل کوئی اعرابی رہا ہوگا، چنانچہ لکھتے ہیں:

قلت الظاهر ان تشريف السائل بالاضافة الى نفسه ...... يابى ان يكون السائل يهوديا متعنتا فى السوال (۱) — میرا کہنا ہے کہ سائل کی نسبت ذاتِ باری کی طرف جو کی گئی ہے وہ اس بات کے متناقض ہے کہ وہ کوئی سرکش یہودی رہا ہوگا۔

سورۂ بقرہ کی درج ذیل آیت:

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ ...... (بقرہ:۱۷۷) — نیکی کچھ یہی نہیں کہ منہ کرو اپنا مشرق کی طرف یا مغرب کے لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے جو کوئی ایمان لائے اللہ پر......۔

کے بارے میں مفسرین مختلف الرائے ہیں کہ اس میں مخاطب اہل ایمان ہیں یا اہل کتاب، قاضی صاحب نے اسلوب بیان کی روشنی میں اہل کتاب کے قول کو ترجیح دی ہے، وہ لکھتے ہیں:

قلت ذكره تعالى بتولية الوجوه وعدم تسميته بالصلوة قرينة على ان المخاطبين بها اليهود والنصارى دون المومنين (۲) — میرا کہنا ہے کہ آیت میں چہروں کے پھیرنے کا ذکر ہے مگر نماز کی صراحت نہیں ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ مخاطب یہود و نصاری ہیں نہ کہ مومنین

اسی طرح آیتِ قصاص:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ — اے ایمان والو! فرض ہوا تم پر (قصاص)

(۱) تفسیر مظہری، ج ۱، ص ۱۶۲ (۲) ایضاً، ص ۱۳۹۔

اَلْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی......(بقرہ:۱۷۸) برابری کرنا مقتولوں میں۔

کے سلسلہ میں بھی مفسرین کو یہ اختلاف ہے کہ اس کے مخاطب اوس وخزرج کے اہل ایمان ہیں یا بنو قریظہ ونضیر کے یہود، قاضی صاحب نے اوس وخزرج کو مخاطب قرار دیے جانے کے قول کو اسی بنیاد پر ترجیح دی ہے، لکھتے ہیں:

قلت رضائهم و تسليمهم و خطاب الله تعالى اياهم بقوله يا ايها الذين آمنوا دليل على ان المخاطبين به هم الاوس و الخزرج الذين صاروا انصار الله دون قريظة والنضير فانهم كانوا اعداء الله كفارًا (۱)	میرا کہنا ہے کہ تسلیم ورضا کا اسلوب بیان اور اہل ایمان کے ذریعہ خطاب اس بات کی دلیل ہے کہ مخاطب اوس وخزرج ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کے دین کے اعوان وانصار تھے نہ کہ قریظہ اور بنو نضیر کے یہود جو کہ اعداء اللہ اور کافر تھے۔

۳-تفسیری انفرادیت تفسیر مظہری کا بیشتر حصہ متقدمین کے تفسیری اقوال پر مشتمل ہے تاہم ایک آیت کی تفسیر میں قاضی صاحب نے جمہور مفسرین کے بالمقابل اپنی رائے کو کامل وثوق واعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے، سورۂ بقرہ میں قصہ آدمؑ کے ذکر میں حضرت آدمؑ کو ناموں کے سکھلانے کا ذکر ہے، ارشاد باری ہے:

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا (بقرہ:۳۱)	اور سکھلا دیئے اللہ نے آدم کو نام سب چیزوں کے۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں مگر ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کو کائنات کی تمام اشیا کا علم دیا گیا، قاضی صاحب کے نزدیک یہ تمام اقوال ناقابل قبول ہیں اور اس کا سبب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ:

فان مدار الفضل على كثرة الثواب ومراتب القرب دون هذه الامور ولو كان هذه الامور مدارًا لفضله	فضیلت کی بنیاد ثواب کی کثرت اور قرب الٰہی کے مدارج پر ہے نہ کہ ان چیزوں پر اور اگر اشیا کے علم کو ہی اساس فضیلت قرار دیا جائے

(۱) تفسیر مظہری، ج۱، ص ۲۴۳۔

لزم فضله علی خاتم النبیین ﷺ فانه قال انتم اعلم بامور دنیاکم ولم یکن علیه السلام عالما بجمیع اللغات (۱)	تو حضرت آدمؑ کی فضیلت آنحضرت ﷺ پر بھی ثابت ہوتی ہے کیوں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم لوگ دنیا کے معاملات زیادہ بہتر سمجھتے ہو، ایسے ہی مختلف زبانوں کا علم بھی آپ ﷺ کو نہیں تھا۔

قاضی صاحب کے نزدیک اسماء سے مراد اسماء الٰہیہ ہیں اور ان کا کہنا یہ ہے کہ اشیا کا علم بھی اس دائرہ میں شامل ہے، اس طرح مفسرین کے اقوال کی تردید بھی نہیں ہوتی مگر اس تاویل کے مطابق زیادہ معنویت پیدا ہو جاتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول کہ تمام چیزوں کے نام سکھائے اور دیگر مفسرین کے اقوال کہ کائنات کی ہر چیز کا علم دیا یہ تمام باتیں اسمائے الٰہیہ کی تعلیم کے منافی نہیں ہیں، ابتدائے کائنات سے منتہائے کائنات کی تعبیر بھی استعمال کی گئی ہے، مگر ہماری توجیہ اس سے بھی زیادہ بہتر ہے کیوں کہ ذات باری اول ہے جس سے قبل کوئی چیز نہیں اور آخر ہے جس کے بعد کوئی چیز نہیں، وہ ظاہر ہے جس سے نمایاں کوئی شئے نہیں اور باطن ہے جس سے پوشیدہ کوئی شئے نہیں ہے''۔(۲)

اس آیت کے اگلے حصہ میں بھی قاضی صاحب نے غیر معمولی ذہانت کا ثبوت فراہم کیا ہے، ارشاد باری ہے:

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ (بقرہ:۳۲) پھر سامنے کیا ان سب چیزوں کو فرشتوں کے۔

بالعموم مفسرین ھم کی ضمیر کا مرجع مسمیات کو قرار دیتے ہیں مگر قاضی صاحب کے نزدیک یہ ضمیر حضرت آدمؑ کی طرف راجع ہے، چنانچہ وہ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

واذا قلت المراد بالاسماء الالٰهية فالضمير راجع الی آدم وجمع	جب ہم نے اسماء سے اسمائے الٰہیہ مراد لیا تو ھم کی ضمیر آدم کی طرف لوٹتی ہے، ضمیر جمع یا

(۱) تفسیر مظہری، ج۱، ص ۳۷ (۲) ایضاً، ص ۳۸۔

الضمير للتعظيم او المراد بآدم هو وآله وهذا انسب من ارجاع الضمير الى المسميات لان المسميات غير مذكورة فيما قبل والضمير للمذكرين العقلاء فلابد فيه من تكلفات و قرأ ابى بن كعب عرضها وقرأ ابن مسعود عرضهن وعلى تينك القرأتين الضمير راجع الى الاسماء (۱)	تو بربنائے تعظیم استعمال ہوئی ہے یا آدم کے ساتھ ان کی ذریت بھی پیش کی گئی، ضمیر کا مسمیات کی طرف راجع کرنے کے مقابلے میں آدمؑ کی طرف زیادہ انسب ہے کیوں کہ اول تو مسمیات کا پہلے کوئی ذکر نہیں ہے، دوسرے یہ ضمیر مذکر عاقل کے لیے استعمال ہوتی ہے، اس لیے اس صورت میں زیادہ تکلفات ہیں، رہا یہ مسئلہ کہ حضرت ابیؓ بن کعب کی ایک قرأت میں ضمیر ھا اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی قرأت میں ھنّ استعمال ہوئی ہے تو ان دونوں قرأتوں کے مطابق ضمیر کو اسماء کی طرف لوٹایا جائے گا۔

آیت کا اگلا حصہ اور زیادہ پُرخطر ہے، مگر قاضی صاحب کے ناخنِ تدبیر نے اس کی گرہ کشائی بھی بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا آدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَائِهِمْ (بقرہ: ۳۳)	اے آدم بتادے فرشتوں کو ان چیزوں کے نام۔

اس میں مفسرین متفق اللفظ ہیں کہ اسمائهم کی ضمیر مسمیات کی طرف راجع ہے مگر قاضی صاحب نے اس کو ملائکہ کی طرف لوٹایا ہے اور اس کی یہ دل چسپ تاویل کی ہے:

اى انبئهم بالاسماء التى فى وسعهم تعلمها او التى قدرنا لهم تعلمها ولم يقل باسمائكم لان تعلم الاسماء كلها لا يمكن الا اجمالا	یعنی فرشتوں کو وہ اسماء بتاؤ جن کو وہ سیکھ سکتے تھے یا جن کو سیکھنے کی صلاحیت ان کو عطا کی گئی ہے، اسمائکم (آدمؑ کے اسماء) اس لیے نہیں کہا گیا کہ اسماء کلی کا علم اجمالی ہی ممکن

(۱) تفسیر مظہری، ج ۱، ص ۳۸۔

بالوصول الی حضرت الذات و ذلک مختص بالبشر دون الملائکۃ۔(۱)

ہے اور وہ بھی قرب الٰہی کے توسط سے اور یہ علم انسانوں ہی کے ساتھ مخصوص ہے، ملائکہ اس سے منزہ ہیں۔

قاضی صاحب کی یہ تفسیر بالکل انوکھی اور منفرد ہے اور اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ متعدد صفات الٰہی مثلاً عفو درگزر، بخشش و مغفرت، قہر و انتقام وغیرہ کا ادراک انسانوں ہی کا خاصہ ہے، ملائکہ جو کہ معصیت سے منزہ ہیں، وہ کیوں کر ان کا ادراک کر سکتے ہیں۔

۴۔نظم و ترتیب کا اہتمام تفسیر مظہری کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ اس میں نظم کلام کو مدنظر رکھا گیا ہے، پہلے متعدد مثالیں گزر چکی ہیں کہ قاضی صاحب نے اسلوب بیان کو بہ طور خاص ملحوظ رکھا ہے، فدیۂ صوم کے ذکر میں انہوں نے ایک قول کو یہ کہہ کر نظر انداز کیا ہے کہ:

وھذا التاویل لا یساعدہ نظم الکلام (۲)

یہ تاویل نظم کلام سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کے بیان کے شروع میں قاضی صاحب نے سورہ کی ابتدائی آیات کی تلخیص کی ہے جس سے ان کے تصور نظم کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"جب اللہ تعالیٰ نے توحید و نبوت کے دلائل ذکر کر دیے اور عام انسانوں کو مخاطب کر کے ان پر اپنے عام احسانات کا ذکر کر دیا تب اس کے بعد بنی اسرائیل کا خصوصی ذکر کیا اور ان پر اپنی خاص نعمتوں کو گنایا، چوں کہ یہ سورہ مدنی ہے، اس لیے اس میں زیادہ تر خطاب یہود سے ہے کیوں کہ وہ عام لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ پڑھے لکھے تھے اور لوگوں کے پیشوا تھے، اگر وہ نبوت کے معترف ہو جاتے تو دوسرے لوگ بھی تسلیم کر لیتے"۔(۳)

۵۔معتدل متصوفانہ تحریر قاضی صاحب ایک عظیم المرتبت صوفی تھے، مگر تفسیر مظہری میں انہوں نے تصوف کے اسرار و رموز اور اس کی پیچیدہ بحثوں کے ذکر کے بجائے بعض بعض مقامات پر تصوف کی حقیقت اور اس کی بنیادی تعلیم کو پیش کیا ہے، نمونہ کے طور پر صرف ایک مثال

(۱) تفسیر مظہری، ج ۱، ص ۳۹ (۲) ایضاً، ص ۱۵۵ (۳) ایضاً، ص ۴۴۔

پیش کی جاتی ہے۔

قاضی صاحب تقوی کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"صلاح قلب کو صوفیہ کی اصطلاح میں فنائے قلب کہتے ہیں اور یہ ولایت کا اعلا مرتبہ ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ جسم کو طاہر، مشتبہات سے بچنے والا اور محرمات سے گریز کرنے والا بنایا جائے، غرض تقویٰ ولایت کے لیے لازم ہے"۔(۱)

قاضی صاحب نے تصوف کے نام پر کیے جانے والے غلط اور قبیح اعمال و اشغال کی مذمت بھی کی ہے اور اس کو روح تصوف کے منافی بتایا ہے، شیخ ابن عربی اور مجدد الف ثانی کے بعض خیالات بھی نقل کیے ہیں مگر ایسے مواقع پر یہ صراحت بھی کردی ہے کہ یہ باتیں علم تفسیر سے متعلق نہیں ہیں۔(۲)

تفسیر مظہری کی مذکورہ بالا خصوصیات کے ساتھ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں نقل کردہ احادیث کو بہ وقت ضرورت فن روایت کی میزان میں پرکھا بھی گیا ہے جس سے قاضی صاحب کی قرآنی وفقہی بصیرت کے پہلو بہ پہلو ان کی علم حدیث سے گہری واقفیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔



(۱) تفسیر مظہری، ج۱ص ۱۲ (۲) ایضاً ص ۲۸۷۔

شاہ مراد اللہ انصاری

ہندوستان کی اولین اردو تفاسیر میں شاہ مراد اللہ انصاری کی تفسیر مرادیہ شمار کی جاتی ہے، یہ تفسیر صرف تیسویں پارہ کی ہے اور اس کا تاریخی نام ''خدائی نعمت'' ہے جس سے ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء نکلتے ہیں، شاہ مراد اللہ انصاری نے بھی اس کے اختتام پر یہی سنہ درج کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''یہ تفسیر محرم کے مہینے کی چوبیس تاریخ جمعے کے دن سال گیارہ سو پچاسی ہجری میں تمام ہوئی''۔(۱)

حالات مصنف تفسیر مرادیہ کے زمانہ تصنیف سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ مراد اللہ انصاری شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ہم عصر تھے مگر شاہ صاحب سے ان کے تعلق وتلمذ کی کوئی صراحت نہیں ملتی ہے، نیز ان کے سوانح کے بارے میں بھی تذکرہ نگار خاموش ہیں، ڈاکٹر جمیل جالبی نے محض اس قدر صراحت کی ہے کہ وہ سنبھل کے ایک محلّہ میاں سرائے کے رہنے والے تھے اور ان کا خاندان دربار شاہی میں بلند مقام رکھتا تھا(۲)، قاضی محمد زاہد الحسینی نے ان کا سنہ وفات ۱۱۸۴ھ بتایا ہے(۳) جو کہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ ان کی تصریح کے مطابق ان کی تفسیر ۱۱۸۵ھ میں مکمل ہوئی۔

ترجمہ قرآن تفسیر مرادیہ میں قرآن مجید کا جو اردو ترجمہ درج ہے اس کے بارے میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا یہ ترجمہ شاہ مراد اللہ انصاری کا کیا ہوا ہے یا شاہ عبد القادر کے ترجمہ سے ماخوذ ہے، چوں کہ شاہ عبد القادر کا ترجمہ قرآن ۱۲۰۵ھ میں پایہ تکمیل کو پہنچا، اس لیے تفسیر مرادیہ کے ترجمہ کی نسبت شاہ مراد اللہ کی طرف کرنے کی صورت میں ان ہی کو مترجم (اردو) اول کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

(۱) تفسیر مرادیہ، ص ۳۴۴ (۲) تاریخ ادب اردو، ج ۲، حصہ ۲، ص ۱۰۴۴، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
(۳) تذکرۃ المفسرین، ص ۱۷۱۔

جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے ایک محقق ڈاکٹر سید حمید شطاری نے تفسیر مرادیہ اور شاہ عبد القادر کے ترجمہ کا تقابلی موازنہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ دونوں کے الفاظ تقریباً ایک ہیں اور اس کی بنیاد پر ان کا یہ قیاس قرین صواب معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر مرادیہ میں شاہ عبد القادر کے ترجمہ کو بعد میں شامل کر دیا گیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"شاہ عبد القادر کا ترجمۂ قرآن مجید ۱۲۰۵ھ میں مکمل ہوا اور تفسیر مرادیہ کا سنۂ تکمیل ۱۱۸۵ھ ہے، اس تفسیر (مرادیہ) کی طباعت (۱۲۵۱ھ) کے زمانے میں شاہ عبد القادر کا ترجمہ قرآن مجید غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکا تھا، اس لیے قیاس ہے کہ تفسیر مرادیہ کی طباعت کے وقت مصححین نے بعض سورتوں اور آیتوں کا ترجمہ شاہ عبد القادر کے ترجمۂ قرآن سے اخذ کر لیا ہوگا"۔(۱)

اس قیاس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ناشر نے خود یہ صراحت کی ہے کہ کتاب میں جا بجا ترمیم و تفصیل کی گئی ہے، چنانچہ خاتمۃ الطبع کی عبارت میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ:

"اس کتاب میں بعض بعض جا پر الفاظ میں ترمیم اور جو آیات قصہ طلب تھے، وہاں پر عبارت بڑھا دی ہے مگر مطلب کو نہیں جانے دیا ہے"۔(۲)

اس طرح کتاب کے آغاز میں بھی دوسری کتاب سے استفادہ کی تصریح موجود ہے، چنانچہ تفسیر مرادیہ میں ابتداء سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے، اس کے بعد تیسویں پارہ کی تفسیر ہے، سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے آغاز میں لکھا ہوا ہے:

"پھر کہا کہ الحمد للہ تا آخر سورہ یہ فائدہ دوسری کتاب سے ہے"۔

اور اخیر میں یہ لکھا ہوا ہے کہ:

"یہ فائدہ اصل شریف مترجم ہندی کا ہے"۔(۳)

اصل قرآن شریف مترجم ہندی سے کیا مراد ہے؟ قیاس یہ ہے کہ یہ شاہ عبد القادر کا ترجمہ قرآن ہے جس کو اصل و اول کی حیثیت حاصل ہے۔

(۱) قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر، ڈاکٹر سید حمید شطاری، ص ۱۰۷ تا ۱۰۹، مطبوعہ ۱۹۸۲ (۲) تفسیر مرادیہ، ص ۳۴۴ (۳) ایضاً ص ۳۔

تفسیر مرادیہ پہلی مرتبہ ۱۲۵۱ھ میں طبع ہوئی، اس کے بعد اس کے متعدد اڈیشن شائع ہوئے، کتب خانہ دارالمصنفین میں اس کا جو نسخہ موجود ہے وہ ۱۳۱۰ھ کا مطبوعہ ہے اور وہی ہمارے پیش نظر ہے۔

تفسیر مرادیہ کی اہمیت

مورخین ادب اردو نے تفسیر مرادیہ کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور اس کے تناظر میں اس دور کے لب ولہجہ، انداز ادا اور عام زبان کے خد وخال کی وضاحت کی ہے، مگر بہ حیثیت تفسیر یہ کتاب خاص اہمیت کی حامل نہیں ہے، اس میں اسرائیلی روایات کو بہ کثرت پیش کیا گیا ہے، تاہم بعض باتیں مفید اور علمی ہیں جن کا ذکر سطور ذیل میں کیا جاتا ہے۔

۱- ہر سورہ کے آغاز میں اجمالی تعارف

اس تفسیر میں ہر سورہ کے آغاز میں مولف نے یہ صراحت کردی ہے کہ یہ سورہ مکی ہے یا مدنی اور یہ کس قدر آیتوں پر مشتمل ہے، نیز کلموں اور حروف کی بھی گنتی کردی ہے، اسی کے ساتھ مختصراً سورہ کے مضمون کی وضاحت بھی کردی ہے، مثلاً سورہ نبأ کے آغاز میں لکھتے ہیں:

”عم سیپارے میں پہلے سورۃ عم ہے، مکے میں نازل ہوئی اس میں چالیس آیتیں ایک سو چھہتر کلمے اور آٹھ سو ایک حرف ہیں، جب حضرت نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبری کا خلعت پہنا پیغمبر ہوئے اور حکم سے حق تعالیٰ کے مکے کے سارے آدمیوں کو اپنی پیغمبری کی خبر دی اور ایمان لانے کو فرمایا اور بت پوجنے سے منع کیا، اللہ تعالیٰ کی بندگی بجالانے کے واسطے حکم فرمایا اور شرک سے توحید کی طرف بلایا اور آیتیں قرآن شریف کی سنائیں، آخرت کی حقیقت بیان کردی اور فرمایا کہ یہ کلام اللہ کا ہے، اس وقت کے اچھے لوگ ان باتوں کو سن کر ایمان لائے مسلمان ہوئے اور بہت لوگ جو بد بخت اور کم بخت تھے، یہ بات سن کر تعجب کرنے لگے اور بہت لوگوں نے نئی باتیں قیاس کرکے انکار کیا اور آپس میں بیٹھ کر ان باتوں کا چرچا کرنے لگے، ایک دوسرے سے کہنے لگا کہ یہ کیسی بات ہے جو محمد ﷺ کہتے ہیں اور کس طرح وہ پیغمبر ہوئے، خدا کا کلام آسمان سے ان پر کیوں کر اترا، ہم سب ایک خدا کی بندگی کیوں کریں اور آخرت

کیوں کر ہووے گی اور مردے سب کیوں کر زندہ ہوویں گے، قیامت کس طرح سے ہووے گی، ایسی ایسی نادانی کی باتیں آپس میں کہنے لگے، ان باتوں کو سچا کرنے کے واسطے جو کہ حضرت فرماتے تھے، یہ سورہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا، اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے مومن مسلمانوں کی اور کافر مشرکوں کی حقیقت اور دنیا و آخرت کا احوال اور بہت سا بیان فرمایا، چھپے ہوئے بھید کو ظاہر کر دیا جو کوئی بوجھے بہت سی دولت پاوے"۔(۱)

تفسیر مرادیہ میں بعض سورتوں کے آغاز میں مضمون سورت کو نہایت ایجاز کے ساتھ ایک دو جملے میں بیان کیا گیا ہے، مثلاً سورہ نازعات کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"اس میں قیامت کے احوال ہیں اور وحدانیت کی دلیلیں ہیں اور بہت فائدے ہیں اس سورت میں"۔(۲)

اسی طرح سورہ عبس کی تمہید میں لکھتے ہیں:

"اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے ارشاد اور تعلیم کی صورت کو۔ سمجھنے اور عمل کی توفیق بخشنے والا وہی پروردگار عالم ہے"۔(۳)

بعض سورتوں میں مضمون سورہ کی صراحت مذکور نہیں ہے، بلکہ صرف اس کے حروف و کلمات کی تعداد کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔

۲-رد بدعات کا اہتمام شاہ مراد اللہ انصاری، فکر ولی اللہی کے نہج و انداز پر توحید خالص کے علم بردار نظر آتے ہیں، ان کی تفسیر میں اس زمانہ کی رائج متنوع بدعات و خرافات کا ذکر کر کے ان کی نفی و تردید کی گئی ہے، وہ سورۂ بروج کی آیت:

اَلَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ — جس کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں
وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْد (بروج:۹) — اور اللہ کے سامنے ہے ہر چیز۔

کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حضرت عیسیٰ پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے خلق کی ہدایت کے لیے بھیجا، اس

(۱) تفسیر مرادیہ، ص ۳-۴ (۲) ایضاً ص ۱۳۱ (۳) ایضاً ص ۶۱۔

وقت یہودیوں کا غلبہ تھا، یہود حضرت موسیٰ کی امت میں تھے، راہ و رسم یہود کی بھول گئے تھے، سحر جادو کی طرف لگے تھے، بت پرستی کرتے تھے، بدعتیں کرتے تھے، دین کی راہ چھوڑ دی تھی، جیسے اب اس زمانے میں بہت لوگ مسلمان کہلاتے ہیں اپنے تئیں حضرت محمد ﷺ کی امت جانتے ہیں لیکن دین کے کام انہوں نے چھوڑ دیے ہیں، قبروں کو سجدہ کرتے ہیں، کافروں کی رسمیں بجالاتے ہیں، ہولی، دیوالی، دسہرہ کرتے ہیں، سیتلا چٹیہ پنچانند کالی مہادیوی، بن بی بی، اولاد بی بی، لال پری، شیخ سدو، زین خان، مانک پیر، پرست پیر وغیرہ کو پوجتے ہیں ان کی منت چڑھاتے ہیں اور بہت باتیں ہیں جو مرد و عورت سب کرتے ہیں، یہ نادانی کا سبب ہے، دین کے علم سے جاہل ہیں ناواقف ہیں''۔(۱)

۳-حکیمانہ نکات تفسیر مرادیہ میں بعض آیتوں کی تفسیر میں نہایت حکیمانہ باتیں ذکر کی گئی ہیں جس سے مولف کی دقیقہ سنجی کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے، سورۂ عبس کی آیت:

ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ. (عبس:۲۰) پھر راہ آسان کردی اس کو۔

کی تفسیر میں انہوں نے ابتداء اسی مفہوم کو بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو شکمِ مادر سے بآسانی باہر نکالا، پھر اس کی مزید حکمتیں واضح کرتے ہوئے انہوں نے اس آیت کے مفہوم میں انسان کے زندگی کے تمام مراحل کو شامل کرلیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''پھو راہ نکلنے کی پیٹ سے اللہ تعالیٰ نے اس کے اوپر آسان کردی، پس آدمی اپنے دل میں سمجھے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے فضل پر ایمان لاوے، شکر کرے جو پیٹ میں تھا تنگی میں تھا اور راہ بھی اس کے نکلنے کی تنگ تھی کیا حکمت سے آسانی سے اس ماں کے پیٹ میں رکھا، پھر کس حکمت سے ایسی تنگ راہ سے آسانی سے باہر نکالا، پھر اس کے اوپر سب طرح کی راہ آسان کردی، اول تو وہاں سے نکل کر قوت کے پیدا کرنے کی قدرت نہ تھی اور تنگی میں

(۱) تفسیر مرادیہ، ص ۱۴۱۔

تھا کہ نہ عقل تھی نہ شعور تھا نہ زور تھا نہ قوت تھی جو اپنی قوت سے اپنا قوت پیدا کر پاتا، پالنے والوں کے دلوں میں پیار شفقت ڈال دی، ماں کی چھاتی میں دودھ پیدا کر دیا یا ماں باپ نے محنت اور خدمت کر کے پالا، قوت کی راہ سمجھنے کی راہ آسان کردی جو ایک راہ بھی ان راہوں سے آسان نہ ہوتی تو ہمیشہ ایک طرح کی تنگی میں رہتا اس سبب سے خواری میں رہتا جو دیکھنے کی راہ آسان نہ ہوتی تو اندھا بن کے اندھیرے کے بندی خانے میں پھنسا ہوا رہتا، ہزاروں رنگ وصورت، حسن و جمال، گل پھول، لاکھوں تماشوں سے محروم رہتا، ہزاروں لاکھوں فائدوں سے بے خبر رہتا اور سننے کی راہ جو آسان نہ ہوتی بہرا ہوتا تو ہزاروں لاکھوں فائدوں سے بے خبر رہتا اور نہ سننے کے سبب بولنے کی راہ بھی نہ کھلتی، زبان کسی بات میں چل نہ سکتی گونگا ہوتا آدمی نہ ہوتا، حیوان جانوروں کی طرح رہتا دونوں جہاں میں خوار رہتا نہ دنیا کا فائدہ لے سکتا نہ آخرت کا فائدہ پا سکتا دنیا میں جو کوئی گونگا ہوا ہے، وہ ماں کے پیٹ سے ہی بہرہ پیدا ہوا ہے، نہ کچھ سن سکتا ہے نہ سمجھ سکتا نہ بول سکتا جس کو اللہ تعالیٰ نے عقل دی ہے، وہ بہروں، گونگوں، اندھوں کے حال کو دیکھتا ہے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر جو کچھ اس کو بخشی ہیں، اپنے دل سے جان سے شکر کرتا ہے اپنے ایمان کو محکم کرتا ہے بندگی میں قائم ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے آدمی کے اوپر سمجھنے کی راہ عقل کی راہ آسان کردی، جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے سمجھ پیدا ہوتی جاتی ہے، دنیا کی معاش کی تدبیریں آگے آتی جاتی ہیں، مثلاً جب دودھ پینے سے چھوٹا کھانا پینا آگے آیا، دنیا کے مزوں کی چیزوں کی خبر ہوئی، اون مزوں کی چیزوں کی تلاش میں بند پڑا، پھر مقصدوں کے پیدا کرنے کے واسطے بھی سب طرح کی راہ آسان کی، ان کی قوم کی عادت پر ان کی راہ و رسم پر کام سکھایا، نوکری چاکری، کھیتی باڑی، تجارت، لوہار، بڑھئی کا کام کسب جو لاہے کا پیشہ اور

طرح طرح کے سب کسب پیشے دنیا میں پیدا کردیے، ہر ایک کے اوپر ایک ایک طرح راہ آسان کردی، جونسی راہ چاہے اوس راہ میں آسانی سے چلے اپنا مقصود حاصل کرے اور جس راہ کو اللہ تعالیٰ نے جس کی مشکل کردی اس راہ میں قدرت نہیں جو قدم اٹھ سکے، پھر دنیا میں زمین پر خشکی کی راہ تری میں دریاؤں کی راہ آسان کردی، خشکی میں چلنے کے واسطے پاؤں میں قوت دی اور جو تھکے نہ چل سکے تو ہاتھی، گھوڑا، اونٹ، خچر، بیل، رتھ گاڑی چھکڑا پیدا کردیا اور دریاؤں میں ناؤ نواڑ بنادیے، جہاں چاہتا ہے، وہاں جاتا ہے اپنے اپنے مقصدوں کو حاصل کرتا ہے، پھر اس پاک خاوند (خداوند) نے دنیا کی راہوں کو آسان کرکے آخرت کی راہوں کو آسان کردیا، آدمی کو کچھ خبر نہ تھی کچھ نہ جانتا تھا، دنیا کے ہزاروں مقصدوں اور ہزاروں طرح کی راہوں میں چلا جاتا تھا، ایک اور فضل کیا رحمت کا دروازہ کھولا، پیغمبر اپنی طرف سے بھیجے، اون کے اوپر اپنے کلام بھیجے، کتابیں بھیجیں اور ان کتابوں میں آخرت کی سب خبر دی، مرنے کے بعد جو حقیقت ہووے گی جو حال آدمیوں کے اوپر آوے گا آخرت کا احوال، اس جہاں کی بات سب مُردوں کا جینا، حساب کتاب، ترازو پل صراط، دوزخ، بہشت، کافر مومن کا کھانا، برے بھلے جگہ عذاب خواری، عزت دکھ سکھ ناخوش بیماری آرام ہمیشہ کا جینا برے اور بھلے حال میں رہنا۔ کہہ دیا اور بتادیا، دنیا میں جیسا کوئی کام کرے گا آخرت میں ویسا ہی وہ پاوے گا، برے کاموں کی بری جزا ہے، اچھے کاموں کی اچھی جزا ہے، برے فعلوں کا برا بدلہ ہے اچھے فعلوں کا اچھا بدلہ ہے، پھر برے کام اچھے کام سب طرح سے بتادیے، سب راہ آسان کردی جو کوئی جس راہ میں اپنے اختیار سے اپنے شوق سے چاہے چلا جاوے، اچھی راہ کے بتانے والے لے جانے والے پیغمبر، پیر، اولیا، مشائخ، عالم، فاضل پیدا کردیے، اسباب سامان تیار کردیے، اسی طرح بد راہ کی بھی راہ

بتانے والے شیطان نفس دنیا میں پیدا کر دیے، اسباب سامان اس کا تیار کر دیا، سب طرح کی بات بتا دی سکھا دی، پھر آدمی جس راہ کو اختیار کرتا ہے، شوق کرتا ہے اسی راہ میں آخری عمر تک آسانی سے چلا جاتا ہے، بہت بہت راہیں جو اللہ تعالیٰ نے آدمی کے اوپر آسان کر دیں، اگر ان راہوں کا بیان کرے تو دفتر تیار ہو ویں، کتابیں لکھی جاویں"۔(۱)

تفسیر مرادیہ کے اس مختصر تعارف سے یہ بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ برصغیر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے عہد میں دیگر علما و بزرگان دین بھی علم تفسیر میں مشغول و منہمک تھے۔



(۱) تفسیر مرادیہ، ص ۶۸ تا ۷۰۔

شاہ رؤف احمد مجددی (المتوفی ۱۲۵۳ھ)

شاہ رؤف احمد مجددی، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فرزند اکبر شاہ عبدالعزیز دہلوی کے شاگرد تھے (۱)، انہوں نے اردو زبان میں ایک تفسیر بنام ''تفسیر رؤفی'' لکھی جو مطبوع ہے مگر متداول نہیں ہے۔

مختصر حالات زندگی

۱۴ محرم ۱۲۰۱ھ کو مصطفیٰ آباد عرف رام پور میں پیدا ہوئے، والد کا نام شعور احمد تھا، دادا نے ان کا تاریخی نام ''رحمٰن بخش'' رکھا جس سے ۱۲۰۱ھ کے اعداد نکلتے ہیں، شاہ ابوسعید جو کہ مرزا مظہر جان جاناں کے خلیفہ شاہ غلام علی کے جانشیں مقرر ہوئے، ان کے خالہ زاد بھائی تھے اور عمر میں ان سے چند سال بڑے تھے۔ (۲)

شاہ ابوسعید کی معیت و رفاقت اور خاندانی اثر و ماحول کی بنا پر بچپن ہی سے ان کو سلوک و تصوف سے دل چسپی تھی، چنانچہ زمانہ مراہقت ہی میں شاہ ابوسعید کے ایما سے رام پور میں مقیم ایک درویش صفت بزرگ شاہ درگاہی سے بیعت ہوئے۔ (۳)

۱۲۲۶ھ میں شاہ درگاہی کی وفات ہوئی، اس کے بعد شاہ ابوسعید اور شاہ رؤف احمد دونوں بھائی رام پور سے دہلی آ گئے اور شاہ غلام علی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے، شاہ رؤف احمد نے تقریباً پانچ چھ برس کا عرصہ شاہ غلام علی کی معیت میں بسر کیا اور غالباً اسی اثنا میں انہوں نے شاہ عبدالعزیز سے اکتساب فیض کیا، پھر وہ دہلی سے بھوپال منتقل ہو گئے اور وہاں ان کو خوب مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی، ۱۲۵۳ھ میں حج کے ارادہ سے بھوپال سے روانہ ہوئے، سمندر کے سفر میں جہاز ہی پر ان کا انتقال ہوا اور یمن کی ایک بندرگاہ پر مدفون ہوئے (۴)۔

(۱) رحمٰن علی، تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۷، نول کشور پریس (۲) حافظ احمد علی خاں شوق، تذکرہ کاملان رام پور، ص ۱۴۳-۱۴۴، ہمدرد پریس دہلی، ۱۹۲۹ء (۳) غلام سرور لاہوری، خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۳۰۷ (۴) دیباچہ مکاتیب شریفہ۔

عام طور پر تذکرہ نگاروں نے ماہ وفات ذی قعدہ لکھا ہے، حافظ احمد علی خان نے ۲۵/ذی قعدہ کی تصریح کی ہے، تذکرہ کی کتابوں میں ان کے سن وفات کا اختلاف مذکور ہے مگر وہ غلط فہمی پر مبنی ہے، مولوی رحمٰن علی نے ۱۲۰۳ھ ان کا سن وفات لکھا ہے، غالباً ان کی عبارت میں پنجاہ (۵۰) کا لفظ سہو کتابت کی بنا پر رہ گیا ہے، حافظ احمد علی خاں نے ۱۲۴۰ھ لکھا ہے اور خود ہی تفسیر رؤفی کا سن تکمیل ۱۲۴۸ھ بتایا ہے، اس لحاظ سے ۱۲۴۰ھ کسی طور پر درست نہیں ہوسکتا ہے، انہوں نے عبد الغفار خاں نساخ کے ایک قطعہ کی بنیاد پر ۱۲۴۹ھ کے سن کا بھی ذکر کیا ہے مگر یہ عام تذکرہ نگاروں کے بیان کے خلاف ہے۔

شاہ رؤف احمد کے دو لڑکے تھے، ۱- شیخ خطیب احمد، ۲- شیخ حسیب احمد، اس کے علاوہ انہوں نے متعدد علمی یادگاریں چھوڑیں جن میں سرفہرست تفسیر رؤفی ہے، ان کی بقیہ کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱- مکاتیب شریفہ: یہ شاہ غلام علی کے خطوط کا مجموعہ ہے جس کو انہوں نے اپنے تلامذہ کو لکھا تھا، ۱۳۳۴ھ میں شاہ رؤف احمد کے پوتے مولانا محمد عبد اللہ کی کوشش سے یہ خطوط شائع ہوئے ہیں۔

۲- دار المعارف: یہ شاہ غلام علی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔

۳- مراتب الوصول: حافظ احمد علی خاں نے لکھا ہے اس کو ایک رسالہ کی صورت میں، خانقاہ دہلی میں لکھا تھا اور حضرت غلام علی نے اس کو پسند فرمایا۔

۴- رسالہ صادقہ مصدوقہ: حافظ احمد علی خاں کی تصریح کے مطابق اس کا قلمی نسخہ ریاست رام پور میں ہے، جو ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور فارسی زبان میں ہے، ان کا کہنا ہے کہ شاہ رؤف احمد نے صادقہ مصدوقہ اپنے خط میں لکھا ہے اور اس کی ابتدائی عبارت یوں ہے الحمد لله الذی جعل الاولیاء خلفآء الانبیاء، اس کے خاتمہ کی عبارت سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ آیا یہی رسالہ مراتب الوصول ہے یا کوئی دوسرا رسالہ ہے (۱) دوسرے تذکرہ نگاروں نے اس نام کے کسی رسالہ کی صراحت نہیں کی ہے، البتہ ایک رسالہ "احوال ہفت چشت" کے نام سے ذکر کیا ہے (۲) ممکن ہے یہ وہی ہو۔

(۱) تذکرۂ کاملان رام پور، ص ۱۴۵-۱۴۶ (۲) مکاتیب شریفہ۔

۵- جواہر علویہ: اس کے بارے میں حافظ احمد علی خاں کا بیان ہے کہ بہ زبان فارسی حضرت شاہ غلام علی کے مفصل حالات اور کل سلسلے کے مجمل احوال پر مشتمل ہے اور اس میں اپنا نسب نامہ اور کچھ حالات بھی لکھے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ فارسی کا نسخہ مجھے نہیں مل سکا، البتہ اس کا اردو ترجمہ جس کو مکتبہ تاجران کتب قومی لاہور نے طبع کرایا ہے، دست یاب ہوسکا مگر اس ترجمہ میں اور اس کی طباعت میں بہ کثرت غلطیاں ہیں۔

۶- سلوک العارفین: حافظ احمد علی خاں کا کہنا ہے کہ یہ کتاب دو سو بیس صفحات پر مشتمل چھوٹی تقطیع میں کتب خانہ ریاست رام پور میں موجود ہے، اس میں بائیس فصلیں اور ایک خاتمہ ہے اور طریقۂ نقشبندیہ کی تفصیل مذکور ہے۔

۷- شراب رحیق: یہ چودہ صفحات کا رسالہ کتب خانہ ریاست رام پور میں موجود ہے، اس میں نقشبندی، قادری اور چشتی طریقہ کے اذکار و اشغال لکھے ہیں۔

۸- ارکان اسلام: ۹ صفحے کا رسالہ مطبع نظامی کان پور سے ۱۲۹۷ھ میں شائع ہوا ہے، مکاتیب شریفہ کے ناشر نے یہ تصریح کی ہے کہ اس کو فقہ حنفی کے طرز پر مرتب کیا گیا ہے۔

۹- مرغوب القلوب در قصہ معراج: نثر اردو میں ایک معراج نامہ ہے۔

۱۰- مولود احمدی ۱۱- رسالہ مولود منظوم ۱۲- مجمع الفوائد

۱۳- درۃ التجوید ۱۴- رحیق المبین شرح حصن حصین ۱۵- رسالہ در لباس

۱۶- رسالہ در ادعیہ ۱۷- یوسف زلیخا منظوم اردو

شاہ رؤف احمد فارسی اور اردو دونوں زبان کے قادر الکلام شاعر تھے، حافظ احمد علی خاں لکھتے ہیں:

"سنا ہے کہ اردو فارسی کلام کا دیوان بھی ہے، اردو شاعری میں قلندر بخش جرأت سے تلمذ تھا"۔(۱)

تفسیر رؤفی تفسیر رؤفی بڑی تقطیع میں دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے، پہلی جلد سورۂ کہف تک ہے اور دوسری جلد سورۂ مریم سے شروع ہوتی ہے، راقم الحروف کو صرف دوسری جلد دست یاب

(۱) تذکرہ کاملان رام پور: ص ۱۴۵۔

ہو سکی ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ میں ہے۔

اس جلد میں خاتمۃ الطبع کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اس کا دوسرا ایڈیشن ہے جو ۱۲۹۳ھ میں مطبع حیدری سے شائع ہوا، نیز مصنف کے بعض قطعات بھی درج کیے گئے ہیں جن سے اختتام تالیف (۱۲۴۸ھ) کی صراحت ہوتی ہے۔

اس تفسیر میں اصل چیز آیتوں کا ترجمہ ہے، تفسیری مباحث بہت کم ہیں، البتہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق سورتوں کے کلمات وحروف کی تعداد ذکر کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، نیز سورتوں کے آغاز میں ماسبق سورت سے ربط کی وضاحت بھی کی گئی ہے جو خالص لفظی اشتراک پر مبنی ہے، مصنف نے قدم قدم پر اپنے اشعار درج کیے ہیں جن سے ان کی شاعرانہ قدرت و انہماک کا اندازہ ہوتا ہے، بعض بعض مقامات پر قدمائے صوفیہ کے اقوال بھی نقل کیے ہیں۔

نمونۂ تفسیر سطور ذیل میں تفسیر رؤفی کے چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں جن سے اس تفسیر کے طرز تحریر کا اندازہ ہوگا۔

اس تفسیر میں سورۂ انبیا اور سورۂ حج کے درمیان ربط و مناسبت تحریر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے:

اور تطبیق اس کی (حج) ساتھ سورۂ انبیا کے یہ ہے کہ مقطع میں سورہ انبیا کے فائدہ اٹھانا کفار کا تا بہ اجل مقدر بیان کیا کہ انتہائے دنیا ہے اور مطلع میں اس سورۂ حج کے ذکر زلزلہ قیامت فرمایا کہ منتہائے دنیا ہے اور یہ بھی ربط ہے کہ سورۂ انبیا میں توحید خدا کی اور نبوت اور معجزے انبیا کے اور خبریں پہلوں کی اور تنبیہ حاضروں کی اور ہلاکت کافروں کی اور نجات مومنوں کی مذکور تھی، اس سورۂ حج میں بھی یہی بیان ہے اور زیادہ اس پر حج اور عبادت اور امر بالمعروف اور نہی منکر مذکور ہے"۔ واللہ اعلم (۱)

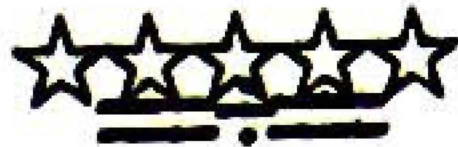
سورۂ طٰہٰ میں فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بعضے کہتے ہیں کہ پوست حمار غیر مذبوح کی تھی، پس بسبب نجاست

(۱) تفسیر رؤفی، ص ۲۱۱۔

کے حکم اتارنے کا فرمایا اور اصح یہ ہے کہ نعلین جلد بقر کی تھیں طاہر، اتارنے کا حکم اس واسطے فرمایا کہ قدم موسیٰ تراب الارض المقدسہ کو مس کرے اور برکت پاوے اور محققوں نے کہا ہے کہ یہ تعلیم ادب وادی ہے کہ بساط سلاطین پر نعلین سے نہیں جاتے، اس واسطے بعضے سلف جیسے بشر حافی وغیرہ برہنہ پا سیر کرتے پھرتے ہیں .... بعضوں نے کہا ہے کہ اپنے نعلین اتار ڈال یعنی خیال اہل وولد دل سے نکال، امام قشیری نے کہا ہے کہ فکر دنیا اور آخرت کا دل سے دور کر"۔(۱)

سورۂ مریم میں آیت سجدہ کی تفسیر میں شیخ ابن عربی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "یہ سجدہ انعام عام ہے، کیوں کہ رحمٰن کی رحمت سبب لطف وکرامت ہے اور موجب خوشی ومسرت پس ثمرہ اس کا طرب ہے نہ لقب"۔(۲)



(۱) تفسیر رؤفی، ص ۱۸۲ (۲) ایضاً ص ۱۷۶۔

مولانا قطب الدین دہلوی المتوفی ۱۲۸۹ھ

مولانا قطب الدین دہلوی شاہ اسحاق صاحب (نواسہ شاہ عبد العزیز دہلوی) کے شاگرد تھے، اس طور سے ان کا علمی سلسلہ نسب خاندان ولی اللٰہی سے ملتا ہے۔

ان کا نام قطب الدین اور والد کا نام محی الدین تھا، دہلی میں پیدا ہوئے اور عمر کا زیادہ حصہ وہیں بسر کیا، فقہ وحدیث میں ید طولیٰ رکھتے تھے، ان دونوں فنون کی تحصیل انہوں نے شاہ اسحاق صاحب سے کی تھی، جن کی خدمت میں ایک طویل مدت تک رہنے اور استفادہ کرنے کا موقع انہیں ملا تھا، صاحب نزہۃ الخواطر کا بیان ہے کہ فقہی جزئیات میں کوئی معاصر ان کا ہم سر نہ تھا، وہ فقہ حنفی کی تائید وحمایت میں بہت پر جوش تھے اور میاں نذیر حسین محدث دہلوی کی تردید میں کئی رسالے مرتب کیے تھے۔

مولانا قطب الدین نہایت عابد وزاہد اور صالح شخص تھے، درس وتدریس، تصنیف و تالیف اور بحث ومذاکرہ میں ہر وقت مشغول رہتے تھے، اخیر عمر میں حرمین تشریف لے گئے اور ۱۲۸۹ھ میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔(۱)

تصنیفات مولانا قطب الدین نے جامع التفاسیر کے علاوہ درج ذیل کتابیں لکھیں:

۱-مظاہر حق: یہ مشکوٰۃ کی شرح ہے جو چار جلدوں میں ہے۔ ۲-الظفر الجلیل: یہ اردو زبان میں حصن حصین کی شرح ہے۔ ۳-معدن الجواہر۔ ۴-آداب الصالحین۔ ۵-الطب النبوی۔ ۶-توفیر الحق۔ ۷-تنویر الحق۔

اس کے علاوہ چند اور رسالے بھی یادگار چھوڑے۔(۲)

جامع التفاسیر مولانا قطب الدین دہلوی کی مرتب کردہ جامع التفاسیر مطبوع ومتداول ہے مگر راقم الحروف کو اس کا صرف ایک حصہ جو سورہ احزاب تا سورہ مومن کی تفسیر پر مشتمل ہے،

(۱) نزہۃ الخواطر، ج۷، ص ۳۸۷ (۲) ایضاً، ص ۳۸۸۔

دست یاب ہو سکا، اس کے مطالعہ سے مولف کے طریقہ تفسیر اور ان کی تفسیر کے بارے میں جو اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں، ان کو سطور ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

تفسیر کی اشاعت

زیر نظر حصہ میں ترقیمہ کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تفسیر مولف کی حیات ہی میں زیور طبع سے آراستہ ہو گئی تھی، اس کا سن اشاعت ۱۲۷۶ھ ہے اور اس کے کچھ اجزا مطبع چشمۂ فیض میرٹھ میں اور بقیہ حصے مطبع مصطفائی محمد حسن خاں سے شائع ہوئے۔(۱)

ربط سور کا اہتمام

اس تفسیر کا یہ امتیاز ہے کہ تقریباً ہر سورہ کے آغاز میں ماقبل و مابعد سورہ سے اس کا ربط و تعلق اور مناسبت دکھائی گئی ہے مگر انہوں نے آیتوں کے درمیان ربط و مناسبت نہیں بتائی ہے، سورتوں کے درمیان بیان کردہ مناسبت کا تعلق الفاظ کی ظاہری حد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ مولف نے معنویت کو بھی بہ طور خاص ملحوظ رکھا ہے، مثلاً سورۂ فاطر کی تمہید میں لکھتے ہیں:

"نزول اس سورہ کا بعد سورہ فرقان کے ہے اور اس کو بعد سورہ سبا اس لیے لکھا ہے کہ وہ بھی لفظ الحمد سے شروع ہوئی ہے اور یہ بھی اور دونوں کو مناسبت باعتبار مقدار کے بھی ہے کہ دونوں مقدار میں قریب قریب ہیں اور بعضوں نے کہا ہے کہ ابتدا سورۂ فاطر جو حمد ہوئی، اس کو مناسبت ہے اوپر کی سورہ کے خاتمہ سے یعنی وَحِيلَ بَيْنَهُمْ مَا يَشْتَهُونَ الخ سے کہ کافروں کی خرابی و تباہی جب اس سورہ کے اخیر میں مذکور ہو چکی تو گویا اس سورہ کی ابتدا میں اس پر حمد کی جیسا کہ فرمایا فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ"۔(۲)

اسی طرح سورۂ صافات اور یٰسین کے درمیان وجہ مناسبت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ سورۂ یٰسین کے بعد اس لیے لکھی گئی ہے کہ یٰسین میں ہے اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُوْنِ یعنی کیا نہ دیکھا انہوں نے کہ کتنی سنگیں (؟) ان کے پہلے ہم نے ہلاک کیں اور اس سورہ میں تفصیل ہے احوال

(۱) جامع التفاسیر، ص ۳۸۹ و سرورق (۲) ایضاً ص ۱۰۹۔

سینگوں مذکورہ کی پس اس میں تفصیل ہے اس کی جیسی کہ سورۂ اعراف میں ہے بعد سورۂ انعام کے اور شعراء میں بعد فرقان کے"۔(۱)

گو اس طرح کی مناسبتوں میں عمق اور دقت آفرینی نہیں معلوم ہوتی، اسی لیے وہ بہت زیادہ دل کش اور دل نشیں بھی نہیں ہیں تاہم سورۂ ص کو سورۂ صافات کا تتمہ وتکملہ قرار دینا اہمیت کا حامل ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"گویا یہ تتمہ ہے اس کی کیوں کہ حق تعالیٰ نے ذکر کیا والصافات میں نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور ہارونؑ اور لوطؑ اور الیاسؑ اور یونسؑ کا اور اس میں ذکر ہے داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ایوبؑ کا اور اشارہ کیا طرف بقیہ ان کے کہ ذکر کی گئیں، پس یہ بعد والصافات کے تتمہ میں ہونے ایسی ہے جیسی طٰسٓ بعد شعرا کے اور طٰہٰ وانبیا بعد مریم کے اور یوسفؑ بعد ہود کے"۔(۲)

مگر بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولف کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی اور ربط سور کا معاملہ الفاظ کے ظاہر ہی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، مثلاً سورۂ یٰسین اور فاطر کے درمیان وہ وجہ مناسبت ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نزول اس کا (یٰسین) بعد سورہ جن کے ہے اور بعد سورہ فاطر کے یہ اس لیے لکھی گئی ہے کہ جب ذکر ہوا سورہ فاطر میں قول اللہ تعالیٰ کا وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ اور قول اللہ تعالیٰ کا وَاَقْسَمُوا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَهُمْ نَذِيرٌ تا قول اس کے فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَذِيرٌ اور مراد نذیر سے محمد ﷺ ہیں اور کافروں نے ان سے روگردانی کی اور جھٹلایا ان کو پس شروع کی یہ سورہ ساتھ قسموں کے اوپر صحت رسالت. ان کی ان کے اوپر اس کے کہ وہ صراط مستقیم پر ہیں، پھر آگے فرمایا لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اُنْذِرَ اٰبَاؤُهُمْ اور وجہ اتصال کی ظاہر ہے اور یہ وجہ ہے کہ سورہ فاطر میں ہے وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى اور سورۂ یٰسین میں ہے وَالشَّمْس

(۱) جامع التفاسیر ص ۱۸۴ (۲) ایضاً ص ۲۴۰۔

تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ ،دو آیتیں اور یہ وجہ فراخ تر اور واضح تر ہے اور یہ وجہ ہے کہ فاطر میں ہے وَ تَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ اور یٰسین میں ہے وَ آيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ یہ کئی آیتیں ہیں کہ نشانیاں اس کی قدرت کی تفصیل سے ان میں مذکور ہیں"۔(۱)

اسالیب قرآن کی وضاحت جامع التفاسیر کا دوسرا بڑا امتیاز ہے کہ اس میں قرآن مجید کے اسالیب بیان کی وضاحت وتشریح بھی کی گئی ہے، قرآن مجید کا ایک اسلوب خطاب کی تبدیلی کا ہے جس کا بہ کثرت استعمال ہوا ہے، سورۂ صافات کی درج ذیل آیتوں میں یہ تبدیلی نمایاں ہے، ارشاد باری ہے:

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ (صافات:۵-۶)	رب آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے اور رب مشرقوں کا، ہم نے رونق دی ورلے آسمان کو ایک رونق جو تارے ہیں اور بچاؤ بنایا ہر شیطان سرکش سے۔

مولانا قطب الدین دہلوی مذکورہ بالا آیات میں تبدیلی خطاب کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ .... الخ میں وہ وصف بیان فرمایا تھا جن کا ظاہر ہونا مخلوقات سے کسی طور متصور نہیں جیسے پیدا کرنا آسمانوں کا، زمین کا اور مشارق ومغارب کا، وہاں پر متکلم کے صیغہ سے بیان کرنے کی کچھ حاجت نہ تھی، اس واسطے کہ سب دانا اور عقل منداس بات کو جانتے ہیں کہ یہ کام سوائے اس ذات پاک کے کوئی نہیں کرسکتا اور اس آیت مین ایسے کام ذکر کیے ہیں جن میں آدمی کو بھی دخل ہے اور وہ کام آدمی بھی ظاہر میں کرسکتا ہے

(۱) جامع التفاسیر، ص ۱۴۸۔

جیسے قندیلوں اور چراغوں سے مکان کو آراستہ کرنا اور دشمنوں کو سنگسار کرنا اور دشمنوں کی خرابی کے اسباب موجود رکھنا، یہ سب کام آدمی بھی کرتے ہیں تو یہاں متکلم ذکر کرنا ضروری ہوا تا کہ کسی طرح کا شبہ نہ رہے"۔(۱)

پند و موعظت پر خاص توجہ جامع التفاسیر میں پند و موعظت کی باتیں بہ کثرت ذکر کی گئی ہیں اور جا بجا مولف نے اس پہلو کو خاص طور پر پیش کیا ہے، سورۂ فاطر کی آیت:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللَّهِ الْغَرُورُ (فاطر:۵)

اے لوگو! بے شک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے، سو نہ بہکائے تم کو دنیا کی زندگانی اور نہ دغا دے تم کو اللہ کے نام سے وہ دغا باز۔

کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا دہلوی نے علما و مشائخ کو بھی فریب نفس سے متنبہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اور فریب نہ دے تم کو شیطان اس لیے کہ وہ ڈالتا ہے تمہارے دل میں جھوٹی آرزوئیں اور کہتا ہے کہ اللہ بے پرواہ ہے تیری عبادات سے اور تیرے عذاب کرنے سے...... سچ ہے اس دنیا اور شیطان نے راہ حق سے بہت ہی الگ کر رکھا ہے، اچھے اچھے لوگ ان کے مکر و فریب سے لرزاں ترساں رہتے تھے، یہ ہیں کہ جہاں مولوی گری یا فقیری کا نام لگا گویا معافی کی چھٹی لکھوالی کہ سب کچھ اپنے حق میں مباح سمجھنے لگے یعنی بعض مولوی تو تاویلات باطلہ کر کر بہت سی حرام چیزوں کو مباح سمجھتے ہیں اور بعضے فقیر باقتضای جہالت بدعات شنیعہ اور حرام چیزوں کو اپنے لیے روا جانتے ہیں"۔(۲)

اسی طرح سورۂ صافات کی آیت:

قَالَ تَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ (صافات:۹۵) بولا کیوں پوجتے ہو جو آپ تراشتے ہو۔

کی تفسیر کرتے ہوئے انہوں نے تعزیہ بنانے کو بھی اسی مفہوم میں شامل کیا ہے اور اس کے مضبوط دلائل دیے ہیں۔(۳)

بعض بعض مقامات پر اپنے عہد کی رائج بدعات کا تذکرہ کر کے اس کی تردید کرتے ہیں،

(۱) جامع التفاسیر، ص ۱۸۹ (۲) ایضاً، ص ۱۱۳ (۳) ایضاً، ص ۲۱۰۔

اسی طرح نکاح بیوگاں کے وہ بڑے حامی اور پر جوش مبلغ نظر آتے ہیں۔(۱)

کلامی مسائل جامع التفاسیر میں گو واعظانہ اسلوب بیان غالب ہے تاہم بعض مقامات پر متکلمانہ بحث و گفتگو بھی کی گئی ہے، مثلاً حضرت اسماعیلؑ ذبیح تھے یا حضرت اسحاقؑ، اس سلسلہ میں علما کی دونوں رائیں نقل کر کے انہوں نے اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کی ہے:

"اور ظاہر تر یہ ہے کہ ذبیح اسماعیلؑ تھے اور یہ قول ابوبکرؓ، ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ اور ایک جماعت کا تابعین میں سے ہے، بسبب فرمانے آنحضرت ﷺ کے انا ابن الذبیحین یعنی میں بیٹا دو ذبیحوں کا ہوں، پس ایک تو ان میں سے جد آنحضرت ﷺ کے اسماعیلؑ تھے، دوسرے باپ آنحضرت ﷺ کے عبداللہ"۔(۲)

اسی طرح حضرت داؤدؑ کے پاس فرشتوں کا مقدمہ لے کر آنا اور حضرت داؤدؑ کا توبہ و استغفار سورۂ ص میں مذکور ہے، اس کی تفسیر میں مفسرین نے عجیب و غریب اقوال نقل کیے ہیں جن سے حضرت داؤدؑ کی عظمت شان کو دھبہ بھی لگتا ہے، مولانا قطب الدین دہلوی نے اس موضوع کی تمام روایات کا احاطہ کر کے اس پر عمدہ بحث کی ہے اور اپنے استاد شاہ اسحاق صاحب کے حوالہ سے اس واقعہ کی یہ توجیہ نقل کی ہے:

"بیچ قصہ داؤدؑ اور نکاح کرنے ان کے عورت معلومہ سے اختلاف بہت ہے اور بعضے مفسروں نے قصہ کو اس طرح نقل کیا ہے کہ شرع اور عقل اس کو نہیں قبول کرتی اور جو کچھ قریب تر ساتھ صواب کے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ اوریا نے ایک عورت سے پیغام نکاح کا کیا تھا اور قریب تھا کہ اس سے نکاح کریں اس عورت کے ولیوں کو اوریا کی طرف سے کچھ خدشہ پڑا اور اس کو نہ دی اور حضرت داؤدؑ نے پیغام نکاح کا کیا اور داؤدؑ کے ننانوے بی بیاں تھیں باوجود اس کے اس سے بھی نکاح کیا، زاد المسیر میں آیا ہے کہ عتاب الٰہی داؤدؑ پر اس لیے تھا کہ بعد از خطبہ اوریا کے اس سے خطبہ کیا مرشدنا مولانا اسحاق صاحب

(۱) جامع التفاسیر، ص ۱۵۴ (۲) ایضاً، ص ۲۱۶۔

نے یہ مضمون عاجز مولف اس کتاب کو لکھوا دیا تھا اور ظن غالب یوں ہے کہ یہ تقریر شاہ ولی اللہ صاحب کی ہے کہ شاید ان کی مولفات میں سے لکھوائی تھیں، واللہ اعلم بالصواب"۔(۱)

تفسیر جامع التفاسیر میں متکلمانہ بحثیں زیادہ باوزن نہیں معلوم ہوتیں بلکہ بعض مقامات پر مولف نے تعرض کیا ہے مگر ان کا خاطر خواہ اور تشفی بخش جواب نہیں دیا ہے، مثلاً سورۂ احزاب کی آیت:

یَـا اَیُّھَـا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَ بَنَاتِکَ وَ نِسَاءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ ذٰلِکَ اَدْنٰیٓ اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (احزاب:۵۹)

اے نبی! کہہ دے اپنی عورتوں کو اور اپنی بیٹیوں کو اور مسلمانوں کی عورتوں کو نیچے لٹکا لیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں اور اس میں بہت قریب ہے کہ پہچانی پڑیں تو کوئی ان کو نہ ستائے اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان۔

کی تفسیر کرتے ہوئے انہوں نے آزاد اور لونڈی کے پردہ میں تفریق کو ضروری قرار دیا ہے اور پھر اس تفریق کی جو توجیہ کی ہے وہ تسلی بخش نہیں ہے، وہ لکھتے ہیں:

"کسی کو یہ شبہ نہ گزرے کہ بی بیاں بدذاتوں کی ایذا سے بچالی گئیں اور لونڈیاں نہ بچائی گئیں اس لیے کہ مقصود شارع کو یہ نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ چونکہ بیویوں کو وہ نہ ستاتے تھے، فرمادیا کہ تم ایسی وضع نہ بناؤ کہ دھوکہ میں تم کو کوئی ستائے، خیر لونڈیاں بے چاری تو موذی کے چنگل میں پھنس رہی ہیں جو بچا سوئی صحیح"۔(۲)

جامع التفاسیر کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولف کی نظر فقہ حنفی پر گہری ہے، نیز اس میں ہر آیت کے ضمن میں شاہ ولی اللہ صاحب کے ترجمہ فتح الرحمٰن اور شاہ عبد القادر صاحب کے ترجمہ وتفسیر موضح القرآن کا اقتباس نقل کیا گیا ہے اور ہر سورہ کے حروف وکلمات کی تعداد بھی ذکر کی گئی ہے۔



(۱) جامع التفاسیر، ص ۲۵۰-۲۵۱ (۲) ایضاً ص ۶۲۔

TAZKERA-E-MUFASSERIN-E-HIND

Volume I

Compilation

MOHD. ARIF AZMI UMRI

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH